

غیرت مند

ملک صفدر حیات

(ریٹائرڈ ڈی ایس پی)

فہرست

نازک اندام

یہ سن چھپن کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں میاں چنوں کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ وہ جنوری کا مہینہ تھا اور اس سال سردی نے پچھلے چھوٹے بڑے کئی ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ کئی روز تک سورج کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ دن کی سردی تو جو تھی سو تھی، رات کو درجۂ حرارت صفر سے کئی درجے نیچے گر جاتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں سائبیریا کے کسی دور دراز خطے میں ڈیوٹی دے رہا ہوں۔

مذکورہ تھانے میں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھے لگ بھگ چھ ماہ گزر گئے لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ اس دوران میں تھانے کی حدود میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے کی بات دوسری ہے اور ایسے معاملات بھی علاقے کے بڑے خود ہی نمٹا لیا کرتے، پولیس کچہری کی نوبت نہ آتی۔ کبھی میں سوچتا، اس علاقے میں تھانے اور تھانے دار کی ضرورت ہی کیا تھی؟ دل سے یہ دعا بھی نکلتی...... کاش، وطن عزیز کا ہر علاقہ ایسا ہی ہو جائے!

پھر ایک روز مجھے ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع مل گیا۔

وہ صبح بھی بہت ٹھنڈی ٹھار اور دھند میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے پتا چلا، میرے تھانے کی حدود میں واقع ایک گاؤں میں قتل کی واردات ہو گئی ہے۔ یہ اطلاع میرے لئے کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی۔

میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ”یوسف! قتل کون ہوا ہے؟“

”ملک صاحب! مقتول کا نام پیر لوٹے شاہ ہے۔“ کانسٹیبل نے بتایا۔

”پیر لوٹے شاہ!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ کس قسم کا نام ہے بھئی؟“

یوسف نے کہا۔ ”ملک صاحب! پیر لوٹے شاہ اپنے گاؤں کی بہت مشہور شخصیت ہے۔ لوگ بڑے ادب و احترام سے اس کا نام لیتے ہیں۔ سنا ہے، پیر صاحب کے قبضے میں کئی جن ہیں۔ کچھ لوگ اسے شاہ جنات بھی کہتے ہیں۔“

”اور یہ ”لوٹے“ کا کیا چکر ہے؟“

”شاہ جنات پیر لوٹے شاہ، لوٹے کی مدد سے عملیات وغیرہ کرتا ہے۔“ کانسٹیبل یوسف علی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی وجہ سے وہ لوٹے شاہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔“

”واہ وا!“ میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”کیا پبلسٹی ہے!“ پھر میں نے یوسف کی

طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ”تمہیں جنات کے بادشاہ پیر لوٹے شاہ کے بارے میں بہت معلومات ہیں بھئی!“

وہ جلدی سے بولا۔ ”میں لوٹے شاہ کے بارے میں پہلے بہت کم جانتا تھا، باقی باتیں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے جیدا نے مجھے بتائی ہیں۔“

”یہ جیدا کون ہے۔“ میں نے دریافت کیا۔ ”اور لوٹے شاہ سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

”جناب! جیدا ہی تو لوٹے شاہ کے قتل کی اطلاع لے کر آیا ہے۔“ کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔“

میں نے قدرے غصے سے کہا۔ ”وہ وہاں بیٹھا کیا انڈے دے رہا ہے۔“ کانسٹیبل سٹپٹا گیا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے انداز میں غصے کے عنصر کو شامل رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس جیدا کو فوراً اندر بھیجو۔“

کانسٹیبل نے کھٹاک سے مجھے سلوٹ مارا اور ”لیس سر“ کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

ان دنوں میری رہائش تھانے کے عقب میں واقع سرکاری کوارٹر میں تھی۔ موسم کی دستبرد سے میں بھی محفوظ نہیں تھا۔ اس لئے اگر کوئی ایمرجنسی نہ ہو تو میں آرام سے تیار ہو کر ہی اپنے کوارٹر سے نکلتا تھا۔ تھانے کی چوحدی کے اندر رہائش ہونے کے سبب میں چوبیس گھنٹے کا ملازم تھا چنانچہ تھوڑی دیر سویرے میرے فرائض اور ذمے داریوں پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

جیدا نامی اطلاع کنندہ، کانسٹیبل کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور صحت کے اعتبار سے بچہ سا دکھائی دیتا تھا۔ تاہم چہرے کی پختگی چغلی کھاتی تھی کہ وہ ہرگز ہرگز بچہ نہیں!

کانسٹیبل، جیدا کو میرے کمرے میں پہنچا کر واپس چلا گیا تو میں نے اسے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی میز کے سامنے رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی ہچکچاہٹ میں خوف کا عنصر غالب تھا۔ بیٹھنے پر وہ مزید چھوٹا نظر آنے لگا۔ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

”پیر لوٹے شاہ کے قتل کا کیا قصہ ہے؟“

”قصہ تو مجھے پتا نہیں سرکار۔“ وہ الجھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں تو آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ پیر صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔“

”کیا تم بھی اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”تمہارا پیر لوٹے شاہ سے کیا تعلق ہے؟“

”میں ان کا ایک عقیدت مند ہوں۔“

”تمہیں کب اور کیسے پتا چلا کہ تمہارے پیر کو کسی نے قتل کر دیا ہے؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے ...... تھانے آنے سے پہلے میں پیر صاحب کے آستانے پر گیا تھا۔“ وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ”وہاں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ پیر صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ کسی نے ان کے سینے میں خنجر گھونپ دیا ہے۔ ان کی لاش ادھر آستانے پر ہی پڑی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا پیر لوٹے شاہ کا آستانہ گاؤں ہی میں ہے؟“

”گاؤں سے تھوڑا باہر ہے“ اس نے بتایا ”قبرستان کے نزدیک۔“

”تم صبح صبح پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر کیا لینے گئے تھے؟“

یہ سوال میں نے اس لئے کیا تھا کہ جیدا کی ذات مجھے شک میں لپٹی نظر آ رہی تھی۔ علی الصباح اس کا کسی پیر کے آستانے پر پہنچنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی مجھے کھٹک رہی تھی کہ وہ تن تنہا اس واردات کی اطلاع دینے تھانے چلا آیا تھا۔ پیر لوٹے شاہ، ماہر عملیات بہ ذریعہ لوٹا اگر اتنا ہی کرنی والا تھا اور لوگ اس کی عقیدت و احترام میں اندھے تھے تو اس شخصیت کے قتل پر اچھی خاصی افراتفری مچ جانا چاہیے تھے اور لوگوں کا ایک جتھا تھانے میں پہنچنا چاہیے تھے۔ لیکن موجودہ حالات اس کے برخلاف نظر آ رہے تھے۔

جاوید عرف جیدا نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا تھا۔ بلکہ پیر صاحب نے آج مجھے اپنے پاس آنے کو کہا تھا۔“

”تم اپنے کسی پوشیدہ و پیچیدہ مسئلے کے حل کے لئے وہاں گئے ہو گے؟“ میں نے ایسے پیروں اور مریدوں کی نفسیات کے مطابق اندھیرے میں تیر چھوڑا جو نشانے پر جا کر لگا۔

”جی ہاں، کچھ ایسی ہی بات تھی۔“ وہ ذو معنی انداز میں بولا۔

”میں نے پوچھا۔ ”تمہارے پیر کے آستانے میں اور کون رہتا ہے؟“

”پیر صاحب کا خدمت گار پھوری۔“ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”مم...... مگر اس وقت وہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”وہ کہاں چلا گیا؟“

”پتا نہیں صاحب!“ جیدا کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ ”میں جب آستانے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی کہ پھوری وہاں نظر کیوں نہیں آ رہا۔ اس کا کمرا تو گیٹ کے پاس ہی ہے۔ میں نے اس کمرے کو بند دیکھا تو پیر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور ...... پھر میں نے ان کی لاش دیکھی۔“ جیدا نے ایک اصلی جھرجھری لی اور خاموش ہو گیا اصلی جھرجھری اس حوالے سے کہ اس کے بدن کی جنبش میں موسم کی ٹھنڈک سے زیادہ حالات کی سنگینی شامل تھی۔

میں نے اس سراسیمہ صورت شخص کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''پیر لوٹے شاہ کی لاش کو دیکھنے کے بعد تم نے کیا کیا؟''

''میں آستانے سے نکل کر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔'' وہ خوف زدہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ''تم گاؤں کی طرف کیوں نہیں گئے؟ سب سے پہلے تو تمہیں گاؤں والوں کو اس واقعے سے آگاہ کرنا چاہیے تھا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سرکار!'' وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''مجھے آستانے سے سیدھا گاؤں کی طرف ہی جانا چاہیے تھا لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے فوراً تھانے جا کر اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میرے اندر بول رہا ہو۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، پیر صاحب کی روح ہی مجھے حکم دے رہی تھی۔ میرے اندر پیدا ہونے والی آواز پیر صاحب کی جانب سے کوئی اشارہ تھا۔ ان کی خواہش ہو گی کہ میں گاؤں کے بجائے تھانے پہنچوں اور آپ کو سب کچھ بتاؤں۔''

پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے انسان اور کچھ ہو نہ ہو، مردم شناس ضرور ہو جاتا ہے۔ میرا تجربہ کہہ رہا تھا، جیدا اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی ملاوٹ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اس کے احساسات میں سے کسی بھی طور اتفاق کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ بھی محسوس کیا، وہ اس کی اندھی عقیدت اور ضعیف الاعتقادی تھی۔ وہ دل و جان سے پیر لوٹے شاہ کو کوئی بہت ہی اونچی اور پہنچی ہوئی شے سمجھ رہا تھا۔ میں اس کی طرح نہیں سوچ سکتا تھا اس لئے میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''میں ابھی تمہارے ساتھ شاہ جنات پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر جا رہا ہوں۔ تمہارے پیر کی لاش کو دیکھ کر میں اس کی روحانی قوتوں کا اندازہ تو بخوبی لگا لوں گا لیکن ایک بات تم ابھی سے اپنے ذہن میں بٹھا لو۔'' میں نے ذرا توقف کر کے جیدا کو گہری نظر سے گھورا۔ ''اگر تم نے کسی قسم کی کوئی غلط بیانی کی ہے تو بتا دو۔ بعد میں اگر تمہارا کوئی جھوٹ میری پکڑ میں آیا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا جسے بیان کرتے ہوئے لوگ شرمائیں گے۔''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکتے ہوئے ہکلایا۔ ''تھا...... تھانے دار...... صاحب! میں نے آپ سے کوئی...... جھوٹ نہیں بولا۔ آپ چاہے مجھ سے کوئی بھی قسم لے لیں۔''

''قسم کی ضرورت نہیں'' میں نے کہا۔ ''تم باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ ہم دس منٹ میں یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔''

جیدا میرے کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اپنے ایک ہونہار اے ایس آئی زمان خان کو اپنے پاس بلا لیا۔ زمان، پیر لوٹے شاہ کے قتل کے واقعے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں نے اسے

ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے ساتھ جائے واردات پر چلنے کو کہا۔

وہ سعادت مندی سے بولا۔ ''میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آپ کے پاس آ رہا ہوں، ملک صاحب!''

''تیار ہونے'' سے خدانخواستہ آپ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ ہماری تیاری کسی تقریب میں شمولیت والی تیاری جیسی ہوتی ہے۔ یہ تھانے کی ایک مخصوص اصطلاح ہے۔ اے ایس آئی کی اس سے مراد تھی کہ وہ میری ہدایت کی تکمیل کے بعد میرے پاس آئے گا۔ جائے وقوعہ پر پہنچنے کی تیاری میں سواری کا مناسب اور معقول بندوبست بھی شامل ہوتا ہے۔

❁❁❁

شاہ جنات پیر لوٹے شاہ عرف بابا لوٹے والا کا آستانہ گاؤں سے باہر تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے گاؤں کے اندر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ہمارا تانگا جب اس گاؤں میں داخل ہوا تو ہر شخص ہمیں چونکی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں اور اے ایس آئی سرکاری یونیفارم میں ملبوس تھے۔ کسی چھوٹے یا بڑے گاؤں میں پولیس کی آمد لوگوں کے کان کھڑے کر دیتی ہے۔ مذکورہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں اور زیادہ تر کچے مکانات پر مشتمل تھا۔ ہمارا تانگا گاؤں کے درمیان سے گزر کر اس راہ پر آ گیا جو پیر لوٹے شاہ کے آستانے تک جاتی تھی۔ راہنمائی کے لئے جاوید عرف جیدا ہمارے ساتھ تھا۔ اس لئے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ریلوے لائن کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ہم قبرستان کے قریب سے گزرے اور سیدھے آستانے پر پہنچ گئے۔

پیر لوٹے شاہ کا آستانہ لگ بھگ بیس مرلے اراضی پر مشتمل تھا۔ کراچی کے رہنے والے اسے چھ سو گز سے زیادہ سمجھ لیں۔ آستانے کے احاطے میں صرف تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا کمرا تو داخلی گیٹ کے ساتھ ہی تھا۔ جیدا کے مطابق پیر لوٹے شاہ کا خادم پھوری (غفور) اس کمرے میں رہتا تھا۔ دیگر دو کمرے احاطے کے پچھلے حصے میں تھے جن میں سے ایک ہال نما تھا۔ اس وسیع و عریض کمرے میں پیر لوٹے شاہ سائلین سے ملاقات کرتا تھا جب کہ دوسرا کمرا اس کے حجرے (بیڈروم) کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے بعد میں حاصل ہوئی تھیں لیکن واقعات کے تسلسل کی خاطر میں ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ بیان کر رہا ہوں۔ ہمارے تانگے کا تعاقب کرتے ہوئے گاؤں کے کچھ لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔

ہم آستانے کا وسیع صحن عبور کر کے قبلہ پیر صاحب کے بیڈروم میں پہنچ گئے۔ جیدا نے مجھے بتایا، اس نے پیر لوٹے شاہ کی لاش اسی کمرے میں دیکھی تھی۔ جیدا نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ پیر لوٹے شاہ چاروں شانے چت، کمرے کے وسط میں پڑا تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اندازہ لگا لیا، خود کو شاہ جنات کہلانے والا وہ فرتوت اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے

سینے میں، عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا۔ جس کا آدھے سے زیادہ پھل جسم کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ شاہ جناب اس وقت اپنے فطری لباس میں تھا۔

میں لاش کے معائنے کے لئے ننگ دھڑنگ پیرلوٹے شاہ کے جسد خاکی کے قریب آ گیا۔ اسی وقت مجھے پتا چلا کہ وہ لاش ایک دائرے کے اندر پڑی تھی۔ کمرے کے کچے فرش پر لگ بھگ دس فٹ قطر کا ایک دائرہ کھنچا نظر آ رہا تھا جیسے کسی شے کو کیلنے کے لئے حصار کھینچا گیا ہو۔ پیرلوٹے شاہ کے سینے میں جس مقام پر خنجر گھونپا گیا تھا، وہاں سے خون کا اخراج بھی ہوا تھا جس نے پیرلوٹے کے سینے کے ساتھ ساتھ کمرے کے کچے فرش کو بھی آلودہ کر دیا تھا۔ اس صورتحال نے میرے ذہن کو الجھا دیا۔ الجھن کا سبب بہت واضح تھا۔ جب کسی شخص کے سینے میں خنجر اتار کر اسے قتل کیا جاتا ہے تو وہ اتنی خاموشی اور آسانی سے جان نہیں دیتا۔ اس کا وجود بہت تڑپتا، پھڑکتا اور جھٹکے لیتا ہے مگر حصار کے اندر ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ ایسے آثار ناپید تھے کہ پیرلوٹے شاہ نے دوسری دنیا میں منتقل ہونے سے قبل ہاتھ پاؤں مارے ہوں۔ یہ حیران کن اور سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔

میں نے اس نکتے کو ذہن میں بٹھایا اور پیرلوٹے شاہ کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک تنومند اور دراز ریش شخص رہا تھا۔ سر کے بال بھی جٹاؤں کی صورت بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں دھاتی کڑے، کانوں میں بالیاں اور گلے میں مالائیں موجود تھیں۔ اس کی گردن کسی گینڈے کی مانند موٹی اور توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ چت لیٹے ہونے کے سبب وہ کسی گیند کی طرح نظر آتی تھی۔ ایسے طاقت ور، چربیلے اور گینڈا صفت شخص کو آسانی سے موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا اور وہ بھی اس طرح کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے کوئی جسمانی احتجاج پیش نہ کیا ہو۔

کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ پیرلوٹے شاہ کا بستر بچھا تھا۔ میں نے بستر کی چادر کھینچ لی اور پیرلوٹے کی برہنہ لاش کو اس سے ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد میں نے اس کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ بھی موجود تھا جو آستانے کے پچھواڑے قبرستان کی طرف کھلتا تھا۔ اسی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ اس کے ذریعے بہت دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔

پیرلوٹے شاہ کے حجرہ خاص اور دیگر کمروں کی مکمل تلاشی کا کام ہو چکا تو میں نے اے ایس آئی کو جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے کی ہدایت کر دی۔ اس خانہ تلاشی کے نتیجے میں کوئی قابل گرفت یا قابل اعتراض شے ہاتھ نہ چڑھی۔ ایک الماری میں مختلف بوتلیں موجود تھیں جن میں رنگ برنگ محلول بھرے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ پیرلوٹے شاہ ان ادویات سے اپنے پاس آنے والے مریضوں کا علاج معالجہ بھی کرتا تھا۔ اسی وقت گاؤں کا چوہدری بھی جائے

پر پہنچ گیا۔ چوہدری فیروز دین کو کسی نے ہماری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا اور وہ فی الفور اس طرف چلا آیا تھا۔ پیرلوٹے شاہ کے قتل کے بارے میں اسے آستانے پر آنے کے بعد پتا چلا تھا۔ چوہدری فیروز دین کو دیکھتے ہی گاؤں کے لوگ باادب باملاحظہ ہوشیار ہو گئے اور انہوں نے چوہدری کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا میرے قریب آ گیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”تھانے دار صاحب! شاہ جی کو کس نے قتل کیا ہے؟“

چوہدری کے لب و لہجے میں، میں نے پیرلوٹے شاہ کے لئے خاصی عقیدت محسوس کی۔ وہ بھی شاہ جنات کے اسیروں میں لگتا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو مجھے صرف اتنا پتا چلا ہے کہ پیر صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ کس نے قتل کیا؟ یہ سراغ لگانا باقی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد میں قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔“

”ذرا شاہ صاحب کا دیدار تو کرائیں تھانے دار صاحب!“ چوہدری کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اس وقت کمرے میں میرے، اے ایس آئی اور چوہدری کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ جیدا سمیت دیگر گاؤں والے چوہدری کے وہاں پہنچتے ہی کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ میری ہدایت پر اے ایس آئی زمان خان نے مقتول لوٹے شاہ کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔

اس جزوی دیدار سے چوہدری کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”پورے جسم سے چادر ہٹا دیں۔“

”چوہدری صاحب! آپ کے شاہ جی اس وقت معاشرتی لباس سے بے نیاز ہیں۔ اسی لئے میں نے ان کے اوپر یہ چادر ڈال رکھی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ایک لمحے کو چونکا اور کمرے کے فرش کو بغور تکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا، وہ کوئی خاص بات سوچنے یا کوئی اہم پوائنٹ کوٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی ہوشیار نگاہ نے حصار والی لکیر پر دو تین چکر کاٹے اور پھر میرے چہرے پر آ کر رک گئی۔ اس نگاہ میں کسی طوفان کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ میں نے محسوس کیا، وہ کسی اندرونی ہیجان میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے سوال کیا۔

”چوہدری صاحب! آپ خاصے پریشان نظر آ رہے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات ہو گئی؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے ایک مرتبہ پھر چادر سے ڈھکی پیرلوٹے شاہ کی لاش کو سراسیمہ نظر سے دیکھا پھر حصار والی لکیر پر اس کی نگاہ چکرانے لگی۔ اس کے رویے نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو وہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ایک ہی نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس قتل یا قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا یا جان چکا تھا۔

جب اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ ”اگر آپ اپنے شاہ جی کو پوری طرح دیکھنا چاہتے ہیں تو میں چادر ہٹا دیتا ہوں۔ ویسے حقیقت وہی ہے جو میں نے آپ کو بتا دی

ہے۔''

چوہدری فیروز دین نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ''میں ایک نظر شاہ صاحب کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ چادر ہٹا دیں تو اچھا ہے۔''

اس کے لہجے نے مجھے بتا دیا کہ وہ اپنے خیالات کو حتمی اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے پیر لوٹے شاہ کا کامل دیدار کرنا چاہتا تھا۔ چوہدری کی عمر ساٹھ کے قریب تھی اور وہ چہرے سے خاصا سمجھ دار اور بردبار نظر آتا تھا۔ سرد و گرم چشیدہ یہ شخص اگر پیر لوٹے شاہ میں غیر معمولی اور پراسرار دلچسپی لے رہا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، حقیقی یا مصنوعی کوئی نہ کوئی راز اس کے سینے میں دفن تھا۔

میں نے اے ایس آئی زمان خان کو اشارہ کیا اور اس نے پیر لوٹے شاہ کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔ شاہ جنات بہ زعم خود...... کے برہنہ جسم کو دیکھ کر چوہدری کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ میں نے محسوس کیا، اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا، چہرے پر بھی خوفزدگی کے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کسی انتہائی ڈراؤنی مخلوق کو دیکھ لیا ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''چوہدری صاحب! کس چیز نے آپ کی یہ حالت بنا دی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں آپ کے دل و دماغ پر کسی شے کی دہشت طاری ہو رہی ہے۔ مجھے بتائیں، یہ کیا معاملہ ہے؟''

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں، شاہ جی کا قاتل کون ہے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وہی خبیث ہے جوفاطیل! شاہ جی نے مجھے خود بتایا تھا۔ ہاں یہ جوفاطیل کا ہی کارنامہ ہے۔''

وہ مسلسل نفی میں گردن ہلا رہا تھا۔ اس کی سراسیمہ اور بے ربط باتوں سے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا۔ میری ہدایت پر زمان خان نے لاش کو دوبارہ چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں نے اپنی حیرت دور کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔

''چوہدری صاحب! یہ جوفاطیل کون ہے؟''

''ایک خبیث جن۔'' اس نے ڈرے سہمے لہجے میں بتایا۔

''جن!'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری آنکھوں میں موجود بے یقینی کو پڑھتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! ہو سکتا ہے آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے مگر مجھے ایک سو ایک فیصد اور پورے سولہ آنے یقین ہے کہ شاہ جی کی جان اسی مکار جن جوفاطیل نے لی ہے۔ وہ شاہ جی کو کئی بار دھمکی دے چکا تھا۔ میں اس بات سے واقف ہوں۔'' پھر اس نے تھوڑا توقف کیا اور حصار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ دائرہ دیکھ رہے ہیں آپ؟''

''ہاں، کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں اور اس وقت بھی دیکھ رہا ہوں۔''

''اور وہ خنجر بھی آپ نے دیکھا ہے جو شاہ صاحب کے سینے میں پیوست ہے۔''

''بالکل دیکھا ہے۔'' میں نے بدستور حیرت بھرے انداز میں جواب دیا۔ ''مگر اس خنجر اور حصار کے حوالے سے مجھے کیا بتانا چاہتے ہیں، ذرا کھل کر بیان کریں؟''

اس نے ایک جھرجھری لی اور بولا۔ ''شاہ جنات بابا لوٹے والا اس شیطان جن جوفاطیل کو اپنے قبضے میں لینا چاہتے تھے۔ یہ منحوس کسی زمانے میں شاہ صاحب کے قبضے میں تھا پھر اس کی بہت منت خوشامد کے بعد انہوں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ کسی کو تنگ نہیں کرے گا۔'' اتنا بتانے کے بعد اس نے ایک اور جھرجھری لی۔ میں کامل بے یقینی مگر توجہ کے ساتھ چوہدری فیروز دین کا بیان سن رہا تھا۔ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس خبیث جوفاطیل نے اپنا وعدہ توڑ دیا۔ اس مرتبہ وہ دوسرے انسانوں کے بجائے شاہ صاحب ہی کو تنگ کرنے لگا۔ اس نے شاہ صاحب کو کھلے الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ وہ ان کی جان لے لے گا اور اپنے شاہ جی اس شیطان کے دوبارہ قابو کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یہ حصار اسی کے لیے کھینچا گیا تھا اور خنجر بھی اس کے استقبال کے لئے تھا لیکن......''

چوہدری فیروز دین نے جملہ ادھورا چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا اور شکایتی لہجے میں بولا۔ ''آپ میری باتوں کا مذاق سمجھ رہے ہیں نا لیکن دیکھ لینا ایک دن آپ کو پتہ چل جائے گا کہ جوفاطیل ہی نے یہ قتل کیا ہے۔ وہ مردود شاہ جی کے قابو میں نہیں آیا اور اپنے کسی داؤ سے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چال الٹ گئی، بازی پلٹ گئی...... افوہ!''

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا ''اور شاہ جنات پیر لوٹے شاہ کی زندگی کا لوٹا گھوم گیا۔ وہ لوٹا گھما کر اپنے پاس آنے والوں کو ان کے مسائل کا حل بتاتا تھا۔ اسی لوٹے کے باعث وہ لوٹ پلٹ اور سفید کالی نیلی پیلی وغیرہ کاٹ کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ آج اسی لوٹے نے پیر صاحب کی زندگی کے مسائل حل کر دیئے۔'' میں نے ذرا رک کر چوہدری کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

''اس دنیا کا پرچہ حل سوالات تو نمٹ گیا۔ اب دوسری دنیا کے امتحانات چل رہے ہوں گے۔ سنا ہے وہاں تو پرچہ بھی آؤٹ نہیں ہوتا۔ بڑے کڑے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔''

میرا انداز بہت ہی سلجھا ہوا مگر الفاظ کاٹ دار تھے اگرچہ میں نے پیر لوٹے شاہ کی شان رفتہ و گزشتہ میں کسی گستاخی کی کوشش نہیں کی تھی مگر مقطع میں آپڑنے والے سخن گستاخانہ الفاظ نے چوہدری کا چہرہ لال بھبوکا کر دیا۔ وہ برہمی سے بولا۔

''شاید آپ کو پتا نہیں شاہ جی! کتنی پہنچی ہوئی ہستی تھے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے واقعی یہ بات معلوم نہیں''

''اسی لیے آپ ان کی بے ادبی کر رہے ہیں۔''

''واللہ! میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' میں نے اپنے لہجے کو معذرت آمیز بنا لیا۔ ''پھر

بھی اگر آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا، آپ شاہ صاحب کے یا شاہ جی آپ کے کتنے قریب تھے؟“

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”میں روح کی گہرائیوں سے شاہ جی کا مرید تھا۔ ان کی موت کا جتنا دکھ مجھے ہوا ہے اور کسی کو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں شاہ جی کی تجہیز و تکفین بڑے شاندار طریقے سے کروں گا۔“

اس کے جواب نے میرے اندازے کو یقین میں بدل دیا کہ وہ پیر لوٹے شاہ کا اسپیشل عقیدت مند تھا۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہوگئی کہ فرتوت ال معروف یہ شاہ جنات کمال درجے کا ڈراما باز تھا۔ ہر کس و ناکس اس کے حلقہ ارادت میں شامل تھا۔ کسی قبیلے کا سردار یا کسی گاؤں کا چوہدری اگر خاص نظریات کا حامل ہو تو سیکڑوں افراد اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں چاہے ان کی یہ رضامندی دل سے ہو یا کسی مجبوری کے پیش نظر۔ شاید پیر لوٹے شاہ اس گاؤں میں اس لئے بھی مقبول ہو گیا تھا کہ وہاں کا چوہدری اس کا مرید تھا۔

میں نے چوہدری فیروز دین کے جذباتی اظہار خیال کے جواب میں کہا۔ ”آپ کو شاہ جی! کی تدفین کا پورا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔ لیکن مناسب قانونی کارروائی کے بعد۔“

”قانونی کارروائی۔“ اس نے برہمی سے دہرایا۔ ”آپ کس قسم کی کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو موقع کی کارروائی جاری ہے۔ آپ ماشاء اللہ خاصے سیانے بندے ہیں قتل کی کئی وارداتوں کو دیکھنے اور سننے کا آپ کو موقع بھی ملا ہوگا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اس کارروائی کا اگلا مرحلہ ہے پوسٹ مارٹم ابھی تھوڑی دیر میں لوٹے شاہ کی لاش کو سرکاری اسپتال بھجوا دوں گا۔“

”تو کیا آپ شاہ صاحب کی چیر پھاڑ بھی کروائیں گے۔“ وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”پوسٹ مارٹم تو ضروری ہے جناب۔“

”اس سے شاہ صاحب کی لاش کی بے حرمتی ہوگی۔“

”اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے حضرت صاحب کو کن حالات میں قتل کیا گیا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر موت کے وقت کا تعین ہو جائے تو قاتل تک پہنچنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ وجہ قتل کیا رہی ہوگی۔“

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”قاتل کا نام اور وجہ قتل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”یعنی جوفاطیل نامی ایک خبیث جن آپ کے مرشد صاحب کا قاتل ہے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”چوہدری صاحب! معذرت کے ساتھ کہوں گا میں آپ کی کہانی پر ایک فیصد بھی یقین نہیں کر سکتا۔“

وہ سلگ اٹھا۔ ”تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”آپ کے جھوٹ اور سچ کو میں نہیں جانتا۔“ میں نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”البتہ قاتل جن والی اسٹوری میرے ذہن کو قابل قبول نہیں۔ میں تو اپنے طور طریقے سے قانونی کارروائی کروں گا۔ اگر ہم لوگ جرائم کو جنات اور دیگر ہوائی مخلوقات کے کھاتے میں ڈالنے لگے تو ہوگئی تھانے داری۔“

”تھانے دار صاحب۔“ چوہدری فیروز دین نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ”شاید آپ کا پہلے کبھی ناری مخلوق سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کا حشر دیکھ لیں آپ۔ اگر آپ نے جوفاطیل کے سلسلے میں کوئی پیش رفت کی تو وہ آپ کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”میں اپنے فائدے نقصان کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ چوہدری صاحب!“ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”اور آپ مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش نہ کریں۔ میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری ٹائپ کا۔ میں نے قانون کی جو کتابیں پڑھی ہیں ان میں ناری خاکی، آبی اور ہوائی ہر مخلوق سے نمٹنے کے گر بتائے گئے ہیں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اپنی حفاظت کرنے کے ایک سو ایک طریقے معلوم ہیں۔“ پھر میں نے اسے ڈرانے کی خاطر کہا ”آپ کو پہلی فرصت میں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”اپنے بارے میں...... کیا مطلب؟“ وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے کیا ہوا ہے؟“

میں نے اپنے لہجے میں حتیٰ الامکان سنجیدگی شامل کرتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری صاحب! آپ شاہ جی کے بہت قریب تھے۔ وہ آپ کو اپنے دشمن جن جوفاطیل کی کہانیاں سناتا رہتا تھا۔ میں نے سن رکھا ہے اس قسم کے خبیث دشمن پہلے قریبی دوستوں اور عزیز رشتے داروں کا رخ کرتے ہیں۔ کہیں شاہ جی کے بعد آپ کی باری نہ ہو۔“

میں نے یہ بات محض چوہدری کا مذاق اڑانے کی غرض سے کہی تھی ورنہ حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ اس کی ضعیف الاعتقادی اور جہالت کو دیکھ کر مجھے سخت غصہ آیا تھا مگر وہ میری دھمکی نما ڈراوے میں آ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر زردی پھیلتے دیکھی۔ اس کی خوفزدگی میں اچانک بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسے لوگوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔

”کیا آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں؟“ اس نے مریل سی آواز میں استفسار کیا۔

”میں بالکل سنجیدہ ہوں چوہدری صاحب!“

”لیکن شاہ جی نے تو کبھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی!“ وہ حد درجہ الجھ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ”میں بتا رہا ہوں نا۔ اگر آپ کے پیر صاحب کا فرمایا ہوا درست مان لیا جائے تو پھر جوفاطیل اس وقت بھی آستانے کے آس پاس چکرا رہا ہوگا تا کہ یہ اندازہ لگا سکے، کس شخص کو پیر لوٹے شاہ کی موت کا سب سے زیادہ دکھ ہوا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ شاہ جی کو

بھول کر فوراً اپنی حویلی میں چلے جائیں اور اللہ اللہ کریں۔ اس شریر مخلوق کے شر سے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔''

میں نے اس قسم کی لایعنی باتیں اس لئے کی تھیں کہ چوہدری خوامخواہ پوسٹ مارٹم سے متعلق کارروائی میں روڑے نہ اٹکائے۔ وہ شاہ جنات پیر لوٹے شاہ کا معتقد خاص تھا اور اس کی چیر پھاڑ کو لاش کی بے حرمتی سمجھتا تھا۔ وہ قانون سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ میں ہر صورت میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرواتا۔ یہ کہانی میں نے کسی ممکنہ بدمزگی سے بچنے کے لئے چوہدری فیروز دین کو سنائی تھی۔ بعض اوقات موقع محل کی مناسبت سے ایسی چالیں بھی چلنا پڑتی ہیں۔

میری کہانی ہٹ ہوگئی۔ چوہدری نے میری باتوں کا اتنا اثر لیا کہ جائے واردات سے جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ ''شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب!'' وہ نحیف سی آواز میں بولا۔ ''اس مخلوق کا واقعی کچھ بھروسا نہیں۔ میں حویلی جا رہا ہوں۔ اس وقت میں آرام کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''

''آپ نے بروقت اور درست فیصلہ کیا ہے چوہدری صاحب!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں موقع کی کارروائی سے فارغ ہوتے ہی سیدھا آپ کی حویلی آؤں گا۔ آپ شاہ صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ آپ کا بیان ضروری ہے۔''

چوہدری فیروز دین ''اچھا، اچھا'' اور ''ٹھیک، ٹھیک'' کہتا ہوا پیر لوٹے شاہ کے آستانے سے رخصت ہوگیا۔ وہ آستانہ جو شاہ جنات کے وجود سے خالی ہو چکا تھا۔ بقول چوہدری ایک خبیث جن جو فاطیل نے شاہ جنات کا تختہ کر دیا تھا۔ اگر ایسا فرض بھی کر لیا جاتا تو یہ عجیب وغریب صورت حالات تھی۔ ظاہر ہے گاؤں کے دوسرے لوگ بھی چوہدری کے حامی تھے۔ وہ اس کی بات سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے اس لئے اس گاؤں اور آس پاس کے علاقے میں بہت جلد یہ خبر پھیلنے والی تھی کہ پیر لوٹے شاہ کو ایک سرکش اور باغی جن نے بے دردی سے قتل کر دیا۔

میں نے پہلی فرصت میں شاہ جنات کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے اسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا پھر دیگر کارروائی میں مصروف ہوگیا۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں یہ واقعہ سناتے ہوئے مقتول کو کبھی شاہ جنات، کبھی پیر لوٹے شاہ، کبھی بابا لوٹے والا اور کبھی شاہ جی یا شاہ صاحب کہہ رہا ہوں۔ یہ مقتول کو اس کے عقیدت مندوں کی طرف سے ملنے والے ٹائیٹل ہیں۔ میرا ان سے کوئی اتفاق نہیں۔ میری نظر میں وہ صرف ایک مقتول تھا جس کے قاتل کا مجھے سراغ لگانا تھا۔ باقی داستان میں کشش اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس نوعیت کے ٹائیٹل خاصے موثر ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ جنات اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہے۔ ان کے وجود سے انکار ممکن نہیں لیکن لوٹے شاہ جیسے فراڈ پیروں اور عاملوں کا جنات سے دور کا علاقہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ معاشرتی ناسور اپنے ہتھکنڈوں اور بلند بانگ باتوں سے کمزور ذہن لوگوں کو تسخیر کر لیتے ہیں جو ان کی

اندھی عقیدت میں بعض اوقات، نعوذ باللہ انہیں خدا سے بھی برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ بہرحال پیر لوٹے شاہ میرے اس کیس میں ایک مقتول کی حیثیت کا حامل تھا اور اس کے قاتل تک پہنچنا میرے فرائض میں شامل تھا۔

میں نے جائے واردات پر موجود جتنے بھی افراد سے پوچھ گچھ کی اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا یعنی قاتل کی نشان دہی نہ ہوسکی۔ میں اطلاع کنندہ جاوید عرف جیدا کو نہیں بھولا تھا۔ وہ بندہ میری نظر میں مشکوک تھا۔ اس سے میں ذرا تسلی سے انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال مجھے جس شخص کی فوری تلاش تھی، اس کا نام تھا غفور عرف پھوری۔ پیر لوٹے شاہ کا یہ خدمت گار اچانک منظر سے غائب ہوگیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا، وہ کہاں اور کب واپس آئے گا۔ اس حوالے سے غفور عرف پھوری مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر تصور کیا جا سکتا تھا۔

میں نے آستانے پر آنے والے جن افراد کے بیانات قلم بند کیے ان میں سے اکثر پیر لوٹے شاہ کے عقیدت مند تھے اور مشترکہ طور پر سب حیرت زدہ تھے کہ ان کے مرشد کو کس نے قتل کر دیا۔ خبیث قاتل جن جو فاطیل والی کہانی ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ان لوگوں سے پھوری کے بارے میں بھی کرید کرید کر سوالات کیے لیکن اس کے خلاف کسی نے زبان نہیں کھولی۔ پیر لوٹے شاہ کے قاتل کی حیثیت سے کوئی شخص پھوری پر شک نہیں ظاہر کر رہا تھا۔

میں نے جیدا کو اپنے ساتھ لیا اور واپسی کے لئے تانگے کی جانب بڑھ گیا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! آپ نے چوہدری سے اس کی حویلی جانے کا وعدہ کیا ہے۔ کیا اس سے ملے بغیر ہی واپس چلے جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''چوہدری فیروز دین اس وقت اپنے حواس میں نہیں، عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ تم نے خود سنا ہے، وہ لوٹے شاہ کے قتل میں کس جن کو ملوث کر رہا تھا اور پورے یقین سے کر رہا تھا۔ اس وقت اس سے ملنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ اسے بعد میں دیکھیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی جناب۔'' اے ایس آئی اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

جب ہمارا تانگا گاؤں کے اندر سے گزرنے لگا تو جیدا نے مجھ سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے باقی لوگوں سے تو موقع پر ہی پوچھ تاچھ کی ہے لیکن مجھے اپنے ساتھ تھانے لے جا رہے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں، خاص وجہ ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں ہا۔ ''تم بہت خاص آدمی ہو۔ میں کچھ عرصے کے لئے تمہیں اپنا مہمان بنا کر رکھنا چاہتا ہوں...... یعنی سرکاری مہمان۔ حوالات نامی مہمان خانے میں تمہاری خوب گزرے گی۔''

وہ خوف زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''جناب! میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو

آپ مجھے حوالات میں بند کرنا چاہتے ہیں؟"

"تمہارے جرم کا فیصلہ تھانے چل کر ہو گا۔"

"یہ...... یہ تو آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔"

"یہ کوئی زیادتی نہیں۔" میں نے کہا "بلکہ زیادتی تو اس وقت شروع ہو گی جب تم میرے سوالات کے جوابات میں گڑبڑ کرو گے۔"

اس نے کہا۔ "آپ سب کچھ تو مجھ سے پوچھ چکے ہیں۔"

"نہیں، ابھی بہت کچھ باقی ہے۔"

"جناب! جو باقی بچا ہے وہ ابھی ادھر ہی پوچھ لیں۔" اس نے منت آمیز لہجے میں کہا "میرا گھر اسی گاؤں میں ہے۔ آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ وہیں بیٹھ کر ساری باتیں کر لیں گے۔"

"اوئے بدبخت! زیادہ زبان نہ چلا۔" زمان خان نے اسے دبکا مارا۔ "ملک صاحب نے جو کہہ دیا وہی حرف آخر ہے۔ اگر تم نے زیادہ بک بک کی تو سانس روک کر سو جوتے ماروں گا تمہارے سر میں...... پھر اگر تمہاری آئندہ سات نسلیں گنجی پیدا ہوئیں تو شکایت نہ کرنا۔"

جیدا اس خطرناک اور لاعلاج دھمکی کو سننے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

* * *

ہر تھانے میں "ٹرائل روم" کے نام پر ایک کمرا مخصوص ہوتا ہے جہاں "ٹرائل" لینے کے مکمل انتظامات موجود ہوتے ہیں۔ عام طور پر ٹیڑھے قسم کے مجرموں کو ٹرائل روم میں لایا جاتا ہے تاکہ ان کی زبان کو بولنا سکھایا جا سکے۔ بڑے بے لب خاموش عادی مجرم اس کمرے میں پہنچ کر "قوت گویائی" حاصل کر لیتے ہیں۔

تھانے پہنچ کر میں جیدا کو سیدھا ٹرائل روم میں لے گیا۔ اس کی زبان کھلوانے کے لئے وہاں لے جانا ضروری نہیں تھا۔ ایسا میں نے ایک خاص مقصد سے کیا تھا۔ میں اسے وہاں موجود سامان اور اس کی کارکردگی کی ایک جھلک دکھانا چاہتا تھا تاکہ وہ اس سبق آموز "جھلک" کو دیکھ کر عبرت پکڑ سکے اور مجھے اس سے زیادہ محنت نہ کرنا پڑے۔

اس "جھلک" کی تفصیل بیان کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ تاہم اس کارروائی نے جیدا پر خاصے گہرے اور "خوشگوار" اثرات مرتب کیے تھے۔ جب میں اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آیا تو وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ اس بار میں نے اسے بیٹھنے کے لئے کرسی پیش نہیں کی۔ مزید برآں جلاد صفت کانسٹیبل بھی اس کے سر پر نازل تھا۔ جیدا کی صورت سے یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اب تب میں رو دے گا۔

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اسے گھور کر دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "جیدا! تم نے دیکھا، میں غلط بیانی کرنے والوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر سکتا ہوں؟"

"ج...... جی...... دیکھا......!" وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔ جھوٹ بولو گے یا سچ؟"

"ج...... جی سچ۔" اس کی آواز میں ہکلاہٹ بدستور موجود تھی۔

میں نے کہا۔ "تمہارے لئے بہتر بھی یہی ہے کہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہ لو ورنہ مجبوراً مجھے تمہیں ٹرائل روم میں لے جا کر باقاعدہ تمہاری مہمان داری کرنا پڑے گی۔"

"مم...... میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا" وہ شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"میں لے کر جاؤں گا، زبردستی تمہیں وہاں پہنچایا جائے گا۔" میں نے اس کے خوف میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے تعاون نہ کیا تو مجھ سے کسی رو رعایت کی توقع نہ کرنا۔"

"جناب! میں نے...... پہلے بھی آپ سے...... تعاون کیا ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "اب بھی کروں گا۔ میں نے اب تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب بھی جو پوچھیں گے، میں آپ کو سچ سچ بتاؤں گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں تھانے دار صاحب!" وہ بالکل روہانسا ہو گیا۔

"دیکھ لیتے ہیں، تم نے اپنے وعدے میں کتنی کھوٹ ملائی ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا پھر اس کے عقب میں کھڑے تنومند کانسٹیبل کو ہدایت دی۔ "موسیٰ! تم جیسے ہی میرے دائیں ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھو، خود بھی حرکت میں آ جانا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو ناں؟"

"بڑی اچھی طرح ملک صاحب!" وہ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

میں جیدا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "جانتے ہو، میرا دایاں ہاتھ کب حرکت میں آئے گا؟"

"جی ہاں، جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جب میں غلط بیانی کروں گا۔"

"شاباش! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "مجھے امید ہے، کانسٹیبل کو زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"انشاء اللہ۔" وہ پورے وثوق سے بولا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں خوامخواہ کے تشدد یا مار پیٹ کا قائل نہیں ہوں۔ میں اپنے شکنجے میں آئے ہوئے لوگوں کی زبان سے سچ اگلوانے کے لئے پہلے نفسیاتی حربے آزماتا ہوں اور مجھے اس طریقہ کار میں ہمیشہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ عادی اور پیشہ ور خطرناک مجرموں کی بات دوسری ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے قابو نہیں آتے۔ انہیں کیلنے کے لئے حوالاتوں اور راتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میں نے جیدا کو نفسیاتی طور پر اس قدر "تیار" کر لیا تھا کہ مجھے امید تھی، وہ کسی چکر بازی کا خیال بھی ذہن میں نہیں لائے گا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم آج صبح پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر کیا لینے گئے تھے؟“

”انہوں نے مجھے بلایا تھا جی۔ جمعہ کی صبح کو آنے کو کہا تھا۔“ وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

”کیوں بلایا تھا؟“ میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔ ”تمہارا اپنا کوئی کام اس کے پاس پھنسا ہوا تھا یا اس نے اپنی کسی ضرورت سے تمہیں بلایا تھا۔“

وہ مسکین صورت بنا کر بولا۔ ”کام تو میرا ہی تھا جناب!“

”کیا کام تھا...... ایسا کیا کام تھا جو تمہیں ٹھنڈی ٹھار صبح وہاں جانا پڑا؟“

”مجھے ان سے ایک خاص تعویذ لینا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، میرا مطلوبہ تعویذ جمعہ کی صبح مجھے تیار ملے گا۔ میں وہ تعویذ حاصل کرنے آستانے پر گیا تھا۔“

میں بدستور اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا اور اس کی صورت خوانی مجھے بتا رہی تھی کہ وہ دروغ گوئی کا سہارا نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اسے گھسنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تم وہ خاص تعویذ کس مقصد کی خاطر لینا چاہتے تھے؟“

جواب دینے سے پہلے وہ تھوڑا سا ہچکچایا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ نہیں جیدا، ورنہ میرا ہاتھ حرکت میں آ جائے گا!“

وہ میری پیشگی اطلاع سے سہم گیا اور تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”میں کسی گڑبڑ کا ارادہ نہیں رکھتا جناب! دراصل بات ہی ایسی ہے میں زبان کھولنے سے پہلے سوچ بچار میں پڑ گیا تھا۔“

میں نے اس کے پس و پیش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی عورت کا معاملہ ہے؟“

”کسی عورت کا نہیں بلکہ میری اپنی عورت...... یعنی میری بیوی کا معاملہ ہے۔“ وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ بات آپ کو کس نے بتائی ہے؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور پوچھا۔ ”تمہاری بیوی کو کیا ہوا ہے جو تم کوئی خاص تعویذ لینے پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر جا پہنچے؟“

”زبین کو کچھ نہیں ہوا جناب!“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ زبین اس کی بیوی کا نام تھا۔ ”جو کچھ بھی ہوا ہے، مجھے ہوا ہے...... اور وہ سب کچھ زبین کا کیا دھرا ہے۔ میں اپنے لئے تعویذ لینے گیا تھا لیکن پیر لوٹے شاہ نے لوٹا گھمانے کے بعد مجھے بتایا کہ تعویذ کی ضرورت مجھے نہیں بلکہ زبین کو ہے۔ میں ان کا دیا ہوا تعویذ کسی طرح زبین کو پلا دوں تو وہ بالکل سیدھی ہو جائے گی۔“

”سیدھی ہو جائے گی۔“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے اور پوچھا۔ ”کیا تمہاری بیوی اب تک الٹی ہے جو پیر لوٹے شاہ کے تعویذ سے سیدھی ہو جاتی؟“

وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس کی مت الٹی ہے جناب! مجھے وہ کہیں سے سیدھی نظر نہیں

آتی۔ اس نے میری کھوپڑی الٹا کر رکھ دی ہے، یہ زندگی میرے لئے عذاب بن کر رہ گئی ہے۔“

یہ تو کوئی اور ہی معاملہ نکل آیا تھا۔ بعض ان پڑھ عقل مند اور اکثر پڑھے لکھے جاہل اپنی بیویوں کو سدھارنے کے لئے حکمت عملی کے بجائے پیروں، عاملوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور ازاں بعد بری طرح پچھتاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پچھتاوے کا انہیں مطلق احساس نہیں ہوتا اور وہ اپنے مالی اور اخلاقی زیاں کو کسی اور ہی کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ میاں بیوی کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ اس میں کسی تیسرے فریق کو داخل نہیں ہونا چاہیے فریق اول اور فریق ثانی ہی میں سے فریق ثالث کو جنم لینا چاہیے۔ یہ اگرچہ خاصا مشکل ہے لیکن ازواجی جھگڑوں کو نمٹانے کا اس سے زیادہ موثر اور دیرپا نسخہ اور کوئی ہو نہیں سکتا۔

میں نے جیدا کے دل کا غبار خارج کرنے کی خاطر کیا۔ ”آخر تمہاری بیوی زبین ایسا کیا کرتی ہے؟“

وہ اچانک پھٹ پڑا ”وہ مجھے مارتی ہے۔“ اس کی آواز میں دکھی دل کی فریاد تھی ”زبین مجھ پر لات جوتا چلاتی ہے اور وہ بھی بچوں کے سامنے۔ آپ اندازہ کریں، چار اور چھ سال کے دو بچوں کے معصوم ذہنوں پر کیا بیتتی ہوگی۔ میں اس زبان دراز اور ہاتھ چھٹ عورت کی شرپسندیوں سے محفوظ رہنے کے لئے پیر لوٹے شاہ کے پاس گیا تھا۔ اب پوری بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی!“ بات ختم کر کے وہ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”پوری تو نہیں، آدھی بات سمجھ سکا ہوں۔“ میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔ ”تم مرد ہو کر اپنی بیوی سے مار کھاتے ہو۔ کیا تمہارے اندر جان نہیں ہے؟“

یہ بات اس کا احوالِ واقعی جاننے کے لئے کی تھی ورنہ اس کا قد کاٹھ اور صحت و جوانی مجھے بخوبی نظر آ رہی تھی۔ وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تھانے دار صاحب! آپ نے صرف مجھے دیکھا ہے، میری بیوی کو نہیں دیکھا۔“

”یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے تائیدی لہجے میں کہا ”کیوں، تمہاری بیوی کو دیکھنے سے کیا ہوگا؟“

وہ تپتے ہوئے الفاظ میں بولا ”میں اس کے سامنے ایسے ہی ہوں جیسے کسی شیرنی کے سامنے بھیگا ہوا بلا۔ وہ پوری دو من کی لاش ہے اور اس کے وجود میں پہلوانوں جیسی طاقت ہے۔ وہ اس طرح ہاتھ پاؤں چلاتی ہے جیسے کشتی کر رہی ہو۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا، زبین کو طلاق دے دوں لیکن معصوم بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔ سوچتا ہوں، ان کا کیا بنے گا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ بڑے ہو کر وہ ماں کے حمایتی بن جائیں گے۔ میں ان کی نظروں میں مجرم اور دشمن ٹھہروں گا۔ اس قسم کے معاملات میں اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بس یہی مجبوری ہے جناب!“

وہ بڑی حد تک صحیح کہہ رہا تھا۔ والدین میں علیحدگی ہو جانے کے بعد اکثر بچوں کا یہی رویہ

ہوتا ہے۔ وہ ہر حال میں ماں کو بے قصور اور باپ کو ظالم سمجھتے ہیں۔ جیدا کی کہانی پر میں اظہار افسوس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ہمدردانہ لہجے میں اس سے کہا۔

''تمہارا مرشد پیر لوٹے شاہ تو قتل ہو گیا۔ تم وہ خاص تعویذ حاصل نہیں کر سکے ہو گے۔ میں تمہارے حق میں دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں۔ میرا مشورہ ہے، تم اپنی بیوی کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھاؤ۔ میں تمہیں بتاؤں، بیویاں کسی معصوم بچے کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ زور، زبردستی یا سختی سے قابو نہیں آتیں۔ انہیں بہلانا، پھسلانا پڑتا ہے، تھپکی لگا کر ہموار کرنا پڑتا ہے۔ انہیں رام کرنے کے لئے بعض اوقات خوش امید جھوٹ کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ ایسا جھوٹ جو بے ضرر بھی ہو اور حوصلہ افزا بھی۔ کیا سمجھے؟''

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں جناب!'' وہ فرمانبرداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ آپ کے مشورے پر عمل کروں لیکن مجھے زیادہ امید نہیں۔ آپ زبین کو نہیں جانتے۔ اس کی مار دھاڑ اور زبان درازی آپ نے دیکھی نہیں!''

میں نے کہا ''اتنا بد دل ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم واثق امید رکھو اور اپنے ذہن میں اس سوچ کو جنم دو کہ تمہارے رویے سے اس پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے اور ایک روز بالآخر وہ تمہاری بات سمجھ جائے گی۔ امید میں بڑی طاقت ہوتی ہے جیدا۔ یہ دنیا امید کے سہارے قائم ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، اگر کسی شخص کی امید ختم ہو جائے تو سمجھو، اس کی زندگی ختم ہے!''

وہ اس طرح سر ہلانے لگا جیسے میری بات کو گہرائی سے سمجھ گیا ہو۔

میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اپنی فائر مائنڈڈ نصف بہتر کو ایک فلاور مائینڈڈ شوہر کے مانند ٹریٹ کرے گا۔ اس کے بعد اس سے دوسرے سوالات کرنے لگا۔ ان سوال و جواب سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ پیر لوٹے شاہ کے قتل میں جیدا کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ فوراً اطلاع دینے تھانے چلے آنے کے سلسلے میں وہ پہلے وضاحت کر چکا تھا۔ وہ اس کی اندھی عقیدت کا معاملہ تھا جو بڑا حساس اور پیچیدہ ہوتا ہے......اندھی عقیدت تو جو بھی چمتکار دکھا ڈالے، کم ہے!

تھانے سے رخصت کرنے سے پہلے میں نے جیدا کو چند ہدایات دیں ''پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے اطلاع دیئے بغیر گاؤں سے باہر کہیں نہیں جاؤ گے بلکہ بہتر یہ ہو گا کہ جب تک لوٹے شاہ کا قاتل گرفتار نہیں ہو جاتا، تم کہیں آنے جانے کے بارے میں سوچو ہی نہیں۔''

''میں آپ کے حکم کے مطابق عمل کروں گا جناب!''

''دوسری بات یہ کہ گاؤں میں رہتے ہوئے تمہیں لوٹے شاہ کے آستانے کی خبر گیری کرنا ہو گی'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا ''جیسے ہی لوٹے شاہ کا خدمت گار پھوری تمہیں نظر آئے، تم تھانے آ کر مجھے اطلاع دو گے۔''

''یہ میں کر لوں گا'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا پھر پوچھ بیٹھا ''اگر پھوری واپس نہ

آیا تو مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں جتنا بتایا گیا ہے فی الحال تم وہی کرو۔ بعد کی بعد میں سوچی جائے گی۔''

وہ مجھے ایک بھرپور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی زمان خان میرے کمرے میں آ گیا۔ زمان اس کیس میں میری معاونت کر رہا تھا۔ ہمارے درمیان پیر لوٹے شاہ اور اس کے قاتل کے بارے میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''ملک صاحب! اب تک کی تفتیش سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، پھوری بالواسطہ اس قتل میں ملوث ہے۔ وہ کل دوپہر تک آستانے پر موجود تھا پھر اچانک غائب ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا، وہ کہاں گیا اور کیوں گیا۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہیں، وہ کب آستانے سے رخصت ہوا۔ اس بات کے روشن امکانات ہیں کہ وہ گزشتہ رات لوٹے شاہ کو قتل کر کے یہاں سے فرار ہوا ہو گا۔''

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے حقیقت حال تو اسی وقت کھلے گی جب پھوری ہمارے ہتھے چڑھے گا۔''

''ویسے ایک بات ہے ملک صاحب!'' زمان نے سوچ کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''اگر پھوری ہی لوٹے شاہ کا قاتل ہے تو پھر اس کی واپسی کا امکان صفر کے برابر ہے۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیں ناں، وہ اتنا احمق تو نہیں ہو گا کہ واپس آ کر خود کو کسی بڑی مصیبت میں ڈال دے۔''

''میں تم سے صرف ایک صورت اتفاق کر سکتا ہوں!''

''کس صورت میں؟'' اے ایس آئی کے چہرے پر الجھن نمودار ہو گئی۔

میں نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ''اگر پھوری اناڑی یا احمق مجرم ہوا تو واقعی واپس نہیں آئے گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی ملک صاحب؟''

''دیکھو زمان!'' میں نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''ہوشیار اور سمجھ دار مجرم بہت سوچ سمجھ کر واردات کرتے ہیں۔ اگر پھوری ہی لوٹے شاہ کا قاتل ہے تو میں اسے ذہین مجرموں میں شمار کروں گا۔ اس لئے وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ میرا قیاس ہے، وہ محض اس لئے جائے واردات سے غائب ہوا کہ عدم موجودگی سے وہ خود کو بے گناہ ثابت کر سکے۔ اس کے پاس ایسا ثبوت موجود ہو گا کہ گزشتہ رات اس نے کہاں اور کس کے ساتھ گزاری ہے۔ وہ آسانی سے اپنا جرم قبول نہیں کرے گا۔''

اے ایس آئی کے چہرے کی الجھن پوری طرح رفع نہیں ہوئی۔ اس نے استفسار آمیز لہجے میں کہا۔ ''چلو مان لیا، اگر پھوری منصوبہ ساز اور چالاک قاتل ہے تو وہ لوٹ کر واپس آستانے پر ضرور

آئے گا تا کہ خود کو بے قصور اور بری الذمہ ثابت کر سکے لیکن آپ نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا ہے کہ پھوری ایک ذہین مجرم ہے۔ آپ کس بنا پر اس کا شمار ذہین مجرموں میں کر رہے ہیں؟''

''تم نے بہت اچھا نکتہ اٹھایا ہے زمان خان!'' میں نے سراہنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا ''اور میں محسوس کر رہا ہوں، تم اس ''بنا'' کے بہت نزدیک پہنچ چکے ہو جس پر کھڑے ہو کر میں نے مذکورہ اندازہ قائم کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ زیر لب مسکرایا اور بولا۔ ''میں آپ کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا ملک صاحب! آپ میرے سوال کا جوب دیں۔ اس جواب سے میں خود کو اسٹیمیٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری قوتِ مشاہدہ کی پوٹینسی کیا ہے اور میرے تجزیے میں کتنا کرنٹ دوڑ رہا ہے؟'' وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ کا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہوں جو آپ کے خیال کے عین مطابق ہے۔''

''تم ایک ذہین پولیس والے ہو۔'' میں نے بے ساختہ اس کی تعریف کی۔ ''مجھے امید ہے، تم بہت ترقی کرو گے۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ملک صاحب! اگر آپ کا ساتھ میسر رہا تو اس ترقی کی رفتار تسلی بخش رہے گی میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے۔''

میں نے زمان خان میں ایک خوبی نوٹ کی تھی کہ وہ حد درجہ انکسار پسند اور احسان شناس شخص تھا۔ ایسے لوگ واقعی اپنے شعبے میں بہت نام کماتے ہیں۔ میں نے اس کے سوال اور اپنی رائے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کس وجہ سے میں نے پیر لوٹے شاہ کے قاتل کو ذہین کہا ہے۔ ہم فرض کرتے ہیں، پھوری ہی ہمارا مطلوبہ مجرم ہے۔ ہم اسی نکتے پر بحث کر رہے ہیں ناں؟''

میں نے سوالیہ نظر سے اے ایس آئی کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پھوری روز و شب لوٹے شاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا بلکہ اس کا مستقل ٹھکانا بھی آستانے ہی میں تھا۔'' (میں ماضی کا صیغہ اس لئے استعمال کر رہا تھا کہ ہم مقتول اور ممکنہ قاتل کے غیاب میں گفتگو کر رہے تھے) اے ایس آئی پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر لوٹے شاہ کا ایک مرید خاص، چوہدری فیروز دین اس راز سے واقف تھا کہ کسی جوفاطیل نامی جن نے پیر صاحب کو قتل کی دھمکی دے رکھی تھی تو یہ ممکن ہے کہ یہ بات لوٹے شاہ کے چیلے پھوری کو معلوم نہ ہو۔''

''پھوری کو یہ بات سب سے پہلے معلوم ہو گی جناب!'' اے ایس آئی نے تائید کی۔

میں نے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے اور یقیناً تم نے بھی دیکھا ہے، لوٹے شاہ کی برہنہ لاش

ایک مخصوص حصار کے اندر پائی گئی ہے اور آلہ قتل ایک خطرناک خنجر ہے۔ چوہدری کے بقول، لوٹے شاہ اسی خنجر کی مدد سے جن کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری طرح تم بھی اس غیر منطقی اور فرسودہ کہانی کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہو گے۔ قاتل نے اپنا کام اس انداز سے سرانجام دیا ہے کہ اس ''کارنامے'' کا سارا کریڈٹ جوفاطیل نامی جن کے حصے میں چلا جائے اور ایسی پلاننگ ذہانت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے، قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ جوفاطیل کی کہانی سے بخوبی آگاہ ہے۔''

''بالکل، میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔'' اے ایس آئی نے میرے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ملک صاحب! اگر ہم اس تھیوری پر یقین کر لیں تو صورتحال الجھ جاتی ہے۔ جن والی کہانی سے چوہدری فیروز دین بھی واقف ہے، اور بھی جانے کتنے لوگ واقف ہوں۔ اس طرح ہم پھوری کو فوکس نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ چوہدری فیروز دین اور چند نامعلوم دیگر افراد بھی اسی شک کے دائرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔''

''تمہارا تجزیہ معقول اور بھرپور ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے خیال میں چوہدری اور پھوری کے سوا کوئی اس جناتی راز سے واقف نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کسی نہ کسی کی زبان سے ضرور پھسل جاتی۔ ہم نے درجن بھر افراد کا بیان لیا ہے۔'' میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔ ''اور جہاں تک چوہدری فیروز کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں، وہ اس قتل میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ میں نے جائے واردات پر اس کا بغور جائزہ لیا ہے۔ اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کو اداکاری کے خانے میں فٹ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک ڈرے سہمے ضعیف الاعتقاد اور محروم الاعتماد شخص سے تاثرات تھے۔ جوفاطیل جن کی فتنہ پروری کے حوالے سے چھوڑے ہوئے میرے شوشے نے اسے خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے امید ہے، اس وقت وہ بخار میں تپ رہا ہو گا!''

اے ایس آئی نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان حالات میں تو ہمیں اپنی پوری توجہ پھوری کی جانب مرکوز رکھنا ہو گی۔ وہ اپنی ذہانت کا ثبوت دینے کسی وقت بھی آستانے پر نمودار ہو سکتا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ''ملک صاحب! آپ نے جیدا کو اس پر نگاہ رکھنے کا کام سونپا ہے۔ کیا پھوری جیسے ممکنہ خطرناک شخص کے لئے ہمارا یہ قدم کافی ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''میں اس انتظام سے قطعی مطمئن نہیں۔ وہ تو میں نے جیدا کی فرماں برداری کو ناپنے اور اسے مصروف رکھنے کے لئے ایک ٹاسک دے دیا ہے۔ تم ہوشیار قسم کے اہلکاروں کی ایک ٹیم ترتیب دو جو سادہ لباس میں لوٹے شاہ کے آستانے اور چوہدری فیروز دین کی حویلی کی نگرانی کریں گے۔''

"چوہدری کی حویلی کی نگرانی کس سلسلے میں؟" وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا۔ "میں چوہدری فیروز کی طرف سے بھی کلی طور پر مطمئن نہیں ہوں اور اس کی بیرون حویلی سرگرمیوں سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس آگاہی کی وجہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ جیسا کہہ رہے ہیں، میں بندوبست کر دیتا ہوں۔" زمان خان نے کہا۔ "میرے خیال میں اس کام کے لئے فریاد علی، رب نواز اور منظور زیادہ مناسب رہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ کام میں نے تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ تم جیسے چاہو، انجام دو۔ مجھے رزلٹ چاہیے، بس!"

"انشاء اللہ! میں بہت جلد آپ کو رزلٹ دوں گا۔" اے ایس آئی نے پورے وثوق سے کہا۔ "رب نواز کو میں آستانے پر متعین کر دیتا ہوں اور منظور حویلی کی نگرانی پر مامور ہو جائے گا جبکہ فریاد علی ان دونوں کے درمیان رابطے کا کام کرے گا۔ اس کے ساتھ وہ جیدا کی "کارکردگی" پر بھی نظر رکھے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ تینوں اہلکار پہچان تو نہیں لیے جائیں گے؟"

"ہرگز نہیں ملک صاحب!" وہ پر یقین انداز میں بولا۔ "یہ تینوں میرے آزمائے ہوئے اور بھیس بھرنے میں ماہر ہیں۔ ان کے بارے میں کسی کو ذرا سا شک بھی نہیں ہوگا۔"

زمان خان کے اعتماد نے مجھے مطمئن کر دیا۔

❁❁❁

دو روز بعد، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق، پیر لوٹے شاہ کی موت جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہی خنجر تھا جو اس کے سینے میں، عین دل کے مقام پر پیوست تھا۔ اس رپورٹ میں ایک چونکا دینے والی بات بھی درج تھی اور وہ یہ کہ بوقت قتل لوٹے شاہ کسی زود اثر نشے میں مبتلا تھا اور اسی خماری ثناری کی حالت میں اس کے سینے میں خنجر گھونپا گیا تھا۔

لیبارٹری ٹیسٹ میں مقتول کے معدے سے حاصل کردہ مواد کا تجزیہ بھی کیا گیا تھا اور اسی سے پتا چلا تھا کہ زندگی سے موت کی جانب سفر کرتے وقت پیر فرتوت لگ بھگ مدہوشی کی کیفیت میں تھا۔ شاید میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ جائے وقوعہ پر، خانہ تلاشی کے دوران میں، میں نے ایک الماری میں مختلف قسم کی جو بھری ہوئی بوتلیں دیکھی تھیں، ان میں سے ایک بوتل میں نے لوٹے شاہ کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال بھجوادی تھی تا کہ اس کا کیمیکل ٹیسٹ کیا جا سکے۔ اس بوتل میں پائے جانے والے محلول کے کیمیاوی تجزیے نے ثابت کیا تھا کہ وہ کوئی زود اثر نشہ آور شے تھی۔

پیر لوٹے شاہ کے معدے کے تجزیے نے میرے ذہن کی ایک الجھن دور کر دی۔ میں نے اس کی لاش کو جس "صبر و سکون" سے حصار کے اندر پڑے دیکھا تھا وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ سینے میں خنجر کھا کر قتل ہونے والا شخص ایسی "شرافت" کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ لوٹے شاہ کسی گہرے نشے کے زیر اثر تھا اس لئے اس نے مخصوص "جدوجہد" نہیں کی تھی۔

ہر بار یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانے میں، عدالت فنگر پرنٹس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی چنانچہ، انگلیوں کے نشانات اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا تھا۔

جس روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ موصول ہوئی وہ دن بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ اسپتال سے پیر لوٹے شاہ کی کٹی پھٹی لاش بھی آئی تھی جسے چوہدری فیروز دین نے بہ نفس نفیس وصول کیا۔ اسی روز بعد نماز عصر لوٹے شاہ کو آستانے کے احاطے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس کے جنازے میں گاؤں کے تمام مردوں نے شرکت کی۔ حاضری اتنی زیادہ اس لئے تھی کہ وہ تدفین چوہدری کے زیر انتظام ہو رہی تھی۔

پتا نہیں، یہ آئیڈیا کس کا تھا کہ قبرستان کے بجائے لوٹے شاہ کو آستانے میں دفن کیا جائے۔ اس عمل نے میرے ذہن میں خطرے کی لاتعداد گھنٹیاں بجا دی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا، پیر لوٹے شاہ کسی ہاتھی کے مانند مرنے کے بعد سوا لاکھ کا ہو گیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کی تربت مزار کی شکل اختیار کر لیتی اور پھر چڑھاوے چڑھانے والوں کا ایک تانتا بندھ جاتا۔ ممکن ہے، اس آستانے پر ہر سال پیر لوٹے شاہ کا عرس بھی منعقد ہونے لگتا اور لوگ لوٹے بھر بھر کر نذرانے پیش کرتے۔ ایسے واقعات میں افسوس ناک بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ بھیڑ چال کے اسیر ہو جاتے ہیں اور کسی تحقیق، تفتیش میں پڑے بغیر اپنے من کی مرادیں حاصل کرنے کے لئے ایسے نقلی مزاروں کی رونق کو بڑھانے میں کسی کنجوسی سے کام نہیں لیتے۔ میری نظر میں ایسے تمام اڈے نوٹ چھاپنے کی فیکٹریاں ہیں جو وہاں مسلط افراد کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔ ایسے سفاک، ظالم اور شقی القلب افراد کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ سینکڑوں ہزاروں سادہ لوح اور معصوم افراد کو گمراہی کے اندھیروں میں پھینکنے کا موجب بن رہے ہیں۔

آپ کا ذہن اس بات سے یقیناً الجھ رہا ہو گا کہ میں پیر لوٹے شاہ کا ذکر کرتے کرتے نہایت ہی تلخ اور سخت الفاظ استعمال کر رہا ہوں۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ آپ اس وقت کہانی کے وسط میں ہیں اس لئے ایسا محسوس کرنے میں حق بجانب ہیں لیکن میں اس واقعے کے آغاز تا انجام سے واقف ہوں۔ کہانی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں گے۔

ایک بات ذہن میں نقش کر لیں کہ بزرگان دین اور روحانی ہستیوں کا احترام ہم سب پر واجب ہے۔ اسی طرح ایسے عظیم انسانوں کے مزاروں کو بھی عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے ساتھ نقلی اور ڈرامے باز ڈبا پیروں سے نہ صرف ہوشیار رہنا چاہیے بلکہ حتیٰ

المقدور ان کی مذمت بھی کرنا چاہیے۔ ہمارا صرف نظر اور بے پروائی ہی ان لوگوں کے حوصلوں کو بڑھا دیتی ہے۔ اصلی اور نقلی میں فرق کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اس دن کو ہنگامہ خیز قرار دیا ہے۔ واقعی وہ ایک غیر معمولی اور سرگرم دن تھا کیونکہ اسی دن کی رات کو پھوری واپس آستانے پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک پیر لوٹے شاہ کو دفن کرنے والے آستانے سے جا چکے تھے۔ جوفاطیل جن والی کہانی اب پورے گاؤں میں گردش کر رہی تھی اس لئے شام کے بعد کسی بھی شخص نے آستانے پر رکنے کی جرأت نہ کی۔

یہ کیسے ممکن تھا، پھوری آستانے تک پہنچ جائے اور زیادہ دیر تک مجھ سے دور رہے! میرے ساتھ کے چاق و چوبند افراد نے رات نو بجے اسے گرفتار کر کے حوالات میں پہنچا دیا۔ میں نے پھوری کی گرفتاری والی خبر اپنے کوارٹر میں سنی کیونکہ میں اس وقت سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ دیہاتی اور قصباتی تھانوں میں زیادہ کام نہیں ہوتا اور ویسے بھی وہ شدید سردی کا موسم تھا۔ لگ بھگ پانچ بجے شام سورج غروب ہو جاتا اور آٹھ بجے لوگ بستر میں دبک چکے ہوتے۔

یہ خوش خبری زمان خان نے مجھ تک پہنچائی تھی۔ اس روز اس کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ وہ خاصا جوش میں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کھلے دل سے اسے مبارک باد دی اور کہا۔

"زمان! تم اس کیس کی تمام جزئیات سے واقف ہو۔ ایک نامعقول "ٹیپ ریکارڈر" تمہارے ہاتھ آ گیا ہے۔ تم اس کے کل پرزوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے دیکھو۔ اگر یہ بولنے کے قابل ہو جائے تو مجھے اطلاع بھجوا دینا۔ میں بھی اس کی بولی سننے آ جاؤں گا۔ تمہاری ویسے بھی شبینہ ڈیوٹی ہے، کچھ تو مصروفیت ہونا چاہیے ناں!"

وہ میرے ڈھکے چھپے الفاظ کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں ملک صاحب! اس "مکینک" میں آپ مجھے ناکامیاب نہیں پائیں گے۔"

میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

رات گیارہ بجے اے ایس آئی کی طرف سے سندیسہ آ گیا کہ "مال" تیار ہے۔ آپ چاہیں تو چیک کر سکتے ہیں۔ میں نے لحاف کو خیر باد کہا اور کمرے میں پہنچ کر اپنی نشست سنبھال لی۔ اسی وقت زمان خان میرے پاس آ گیا۔ میں نے اس سے استفسار کیا۔

"کیا پھوری نے اقبال جرم کر لیا ہے؟"

"وہ لوٹے شاہ کے قتل سے انکاری ہے جناب!" اے ایس آئی نے بتایا "میں نے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے۔ اس کے پاس ایک نئی ہی کہانی ہے۔ میں نے سن لی ہے، آپ بھی سن لیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اس کی کہانی خاصی جان دار ہے۔ آپ کا مجھ سے زیادہ تجربہ ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہو۔ میں اس کی دروغ گوئی کو پکڑ نہیں سکا۔ ممکن ہے، آپ کی پکڑ میں آ جائے۔ میں نے اسے ڈرانے دھمکانے اور "سیدھا" کرنے کے

نصف درجن فارمولے استعمال کر لیے ہیں۔"

"ہوں!" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی "تم اسے میرے پاس لے کر آؤ۔ میں کوئی دوسرا طریقہ آزماتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "کیا اس نے بتایا کہ اتنے دن وہ کہاں غائب تھا؟"

"جی ہاں بتایا ہے۔" اے ایس آئی نے جواب دیا۔ اس کے مطابق وہ چیچہ وطنی گیا ہوا تھا وہاں جانے سے متعلق اس نے ایک زبردست کہانی سنائی ہے۔ میں نے اس کی کہانی کو جاندار اس لئے کہا ہے کہ اس میں ایک جن کا کردار بھی موجود ہے۔"

میں نے حیرت اور دلچسپی سے اے ایس آئی کو دیکھا اور کہا۔ "یعنی ایک اور جن!" پھر میں نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا اس جن سے بھی کسی انسان کی موت وابستہ ہے؟"

اے ایس آئی نے نفی میں گردن ہلائی "نہیں جناب! یہاں معاملہ برخلاف ہے، اس کیس میں انسان سے ایک جن کی موت وابستہ ہے......اور وہ انسان غفور عرف پھوری!"

"بہت دلچسپ!" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہم یہ توقع تو کر رہے تھے کہ وہ اپنے غیاب کی کوئی زبردست کہانی سنائے گا لیکن اس طرف ہمارا دھیان نہیں گیا کہ جائے وقوعہ سے عدم موجودگی کے دوران میں وہ کسی جن سے نبرد آزما بھی ہو سکتا ہے۔ اس چکر باز کو فوراً میرے پاس لے کر آؤ۔"

اے ایس آئی "میں لے کر آیا" کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھوری کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ میرے پاس آ گیا۔ پھوری ایک دراز قامت اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک شخص تھا۔ رنگت توئے کو شرماتی تھی۔ اس کی عمر چالیس کے نزدیک تھی اور اس نے ایک بے ترتیب داڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی جس میں سیاہ اور سفید بالوں کا تناسب برابر تھا۔ سر کے بال بھی ضرورت سے زیادہ بڑھے ہوئے تھے۔ سب سے دلچسپ اور مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ وہ اس وقت صرف ایک جانگیے میں تھا۔ اے ایس آئی نے اس برفیلی اور خون منجمد کر دینے والی رات میں اسے لباس سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ موسم سرما میں اس نوعیت کی "تفتیش" خاصی موثر ثابت ہوتی ہے۔

وہ میرے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے ننگے بدن کو دیکھ کر میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ اے ایس آئی نے خاصے خطرناک فارمولے اس پر آزمائے تھے۔ عام مجرم اس قسم کی کیفیات میں سے گزر کر اقبال جرم کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔ پھوری یا تو بہت ہی پکا اور کائیاں مجرم تھا یا پھر سرے سے مجرم نہیں تھا...... میرا مطلب ہے، وہ پیر لوٹے شاہ کا قاتل نہیں تھا۔

اے ایس آئی نے اس کی زبان کھلوانے کے لئے خاصی سختی برتی تھی، میں نے نرمی کا برتاؤ

کرنے کا فیصلہ کیا اور زمان خان سے کہا۔ ''کوئی کمبل یا گرم چادر لا کر اس پر ڈال دو۔''

اے ایس آئی میری سوچ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ خاموشی سے گیا اور دو منٹ بعد اس نے واپس آ کر میرے حکم کی تعمیل کر دی اور بولا۔ ''میرے لئے مزید کیا حکم ہے ملک صاحب!''

''تم جا کر آرام سے اپنی ڈیوٹی دو۔'' میں نے کہا۔ ''پھوری سے باقی پوچھ تاچھ میں خود کر لوں گا۔''

اے ایس آئی کمرے سے نکل گیا تو میں نے پھوری کو اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا ہے۔ میں نے اپنی بات کو دہرایا تو وہ ہچکچاتے ہوئے ایک کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''آرام سے سیدھے ہو کر بیٹھو اور میں جو کچھ پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھاک جواب دینا۔''

وہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگانے کے بعد بولا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ تو بہت وکھری ٹائپ کے پولیس والے ہیں۔ آپ کے تھانے والوں نے میرے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ آپ کا رویہ بالکل مختلف ہے۔'' اس کی آنکھوں میں وحشت نے نمایاں جگہ بنا رکھی تھی۔

''ہاں، میں ان لوگوں سے واقعی مختلف ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کوشش کرتا ہوں، گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے۔ اگر بات نہ بنے تو میں اپنی انگلی کو کسی بھی طرف گھما سکتا ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا، میں نے کہا۔

''اگر تم نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو پھر میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تھانے والوں کے برے سلوک کو پہلی فرصت میں بھول جاؤ گے۔''

''آپ جو کچھ پوچھیں گے، میں اس کا صحیح جواب دوں گا۔'' وہ جلدی سے بولا ''ویسے جھوٹ تو میں نے پہلے بھی کوئی نہیں بولا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم جمعرات دوپہر سے اب تک کہاں غائب تھے؟''

''جی، میں چیچہ وطنی گیا ہوا تھا۔'' اس نے بتایا ''میں نے آپ کے ایس آئی صاحب کو پورا واقعہ سنا دیا ہے۔''

''پہلی سنی اور سنائی باتوں کو ذہن سے نکال دو اور جو میں پوچھوں، صرف اس کا جواب دو۔'' میں نے سنجیدگی سے اسے گھورا اور سوال کیا۔ ''چیچہ وطنی تم کیا لینے گئے تھے؟''

اس نے بتایا۔ ''شاہ صاحب نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ ایک مریض کا علاج کرنے۔''

''مریض یا مریضہ کا علاج کرنے؟''

''مریضہ جناب...... اس لڑکی کا نام شاداں ہے۔''

''شاداں نامی اس لڑکی کو کون سا مرض لاحق تھا؟''

''اس خوبصورت لڑکی پر ایک خبیث جن عاشق ہو گیا تھا۔''

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی باتوں پر یقین کر رہا ہوں۔

''پھوری! یا تم نے شاداں کو اس جن سے نجات دلا دی؟''

''جی، اب وہ بھلی چنگی ہو گئی ہے۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''میں نے پورے تین دن عمل کیا ہے۔ مرشد کی دعا سے مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔''

''مرشد سے تمہاری مراد پیر لوٹے شاہ، شاہ جنات ہے ناں؟''

وہ جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''بالکل جناب! شاہ صاحب بہت پہنچے ہوئے عامل تھے۔''

''جواب کہیں اور پہنچ گئے ہیں۔'' میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بلکہ انہیں پہنچا دیا گیا ہے۔''

پھوری نے افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں شاہ صاحب کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میں نے کبھی ان کی خدمت میں کمی نہیں کی اور انہوں نے بھی کچھ عطا کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ ایسی عظیم ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے غم زدہ انداز میں گردن جھکا لی۔ میں نے نرم طنز کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پھوری! پیر لوٹے شاہ کی شاگردی میں تم نے اتنا علم تو حاصل کر لیا ہو گا کہ اب ان کے چھوڑے ہوئے آستانے کو آسانی سے چلا سکو؟''

میرا سوال سن کر اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''پیر صاحب نے مجھے علم اور عمل دونوں کا درس دیا ہے۔ مرشد کی دعا سے میں اس آستانے کو اچھی طرح چلا سکتا ہوں۔ یہ آستانہ ان کا مزار بھی ہو گا اور میری گدی بھی۔ اس گدی پر صرف اور صرف میرا حق ہے کیونکہ شاہ صاحب کا کوئی رشتے دار ہے اور نہ ہی کوئی شاگرد سوائے میرے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری کرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ جی مجھ پر بہت زیادہ بھروسا کرتے تھے۔ اسی لئے تو شاداں کے علاج کے لئے مجھے انہوں نے چیچہ وطنی بھیجا تھا ورنہ لڑکی کے والدین کی تو خواہش تھی، لوٹے شاہ صاحب خود ان کے گھر جائیں لیکن مرشد نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے فرمایا، یا تو مریضہ کو ان کے آستانے پر لے آؤ یا پھر پھوری یعنی مجھ سے علاج کراؤ۔ لڑکی کے والدین کو مجبوراً شاہ جی کی بات ماننا پڑی۔ انہوں نے مجھے لڑکی کے والدین کے ساتھ چیچہ وطنی روانہ کر دیا اور دیکھ لیں، میں نے شاہ صاحب کی لاج رکھ لی۔ شاداں بالکل ٹھیک ہو چکی ہے۔ میں نے اس پر عاشق ہونے والے خبیث جن کو جلا کر بھسم کر دیا ہے۔'' پھر اس نے اپنے کانوں کو چھوا اور نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''توبہ، توبہ۔

اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ یہ تو سب شاہ جی کے سکھائے ہوئے علم کا کارنامہ ہے ورنہ جنوں سے ٹکر لینا بہت ہی خطرناک کھیل کا کام ہے۔ یہ خبیث مخلوق کسی سے رو رعایت نہیں کرتی۔"

"ہاں، وہ تو میں نے دیکھ لیا۔" میں نے پھوری کی سوچ کے مطابق کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے، پیر لوٹے شاہ کی موت میں بھی ایک خبیث جن کا ہاتھ ہے۔ بڑا عجیب و غریب نام ہے اس جن کا......؟"

میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ پھوری ترت بولا۔ "جوفاطیل!"

"تو اس کا مطلب ہے، جوفاطیل کی کہانی تمہیں بھی معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پھوری نے بتایا۔ "یہ کہانی شاہ جی نے خود مجھے سنائی تھی۔ ان کا کہنا تھا، جوفاطیل ایک قبیلے کا سردار ہے اور بہت ہی دھانسو قسم کا جن ہے۔ اگر شاہ جی اسے قابو کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے یا اس نے حصار میں آنے سے پہلے ہی کوئی انوکھا داؤ مار دیا تو مرشد کی جان بھی جا سکتی ہے اور......میرا خیال ہے، کوئی ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہوگا۔"

پھوری نے بات ختم کرنے کے بعد ایک جھرجھری لی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے دیکھے۔ اگر وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا تو پھر یہ خوف جوفاطیل کے کارنامے کی وجہ سے تھا۔

میں نے کرید جاری رکھی اور پھوری سے پوچھا۔ "تم نے بتایا ہے کہ جمعرات کی دوپہر کو تم شاداں کے والدین کے ساتھ ہی آستانے سے روانہ ہوئے تھے۔ تم لوگ سیدھے چیچہ وطنی گئے تھے یا کہیں اور سے ہوتے ہوئے وہاں پہنچے تھے؟"

"ہم سیدھے چیچہ وطنی گئے تھے؟"

"میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لئے شاداں کے والدین کو تھانے بلا سکتا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے میں ذرا سختی بھرتے ہوئے کہا۔ "اس لئے تم کسی گڑبڑ کی کوشش نہ کرنا پھوری!"

وہ لجاجت بھری آواز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے اس لئے کسی گڑبڑ کے بارے میں نہ سوچیں۔ اس سلسلے میں، میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔" پھر وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر میں آپ سے کوئی غلط بیانی کروں یا آپ کو چکر دینے کی کوشش کروں تو جوفاطیل میری گردن توڑ دے۔"

وہ اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "تھانے دار صاحب! آپ جیسے چاہیں، اپنی تسلی کر لیں۔ شاداں بے چاری تو اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی البتہ اس کے باپ کرم دین اور ماں شائستہ سے آپ پوچھ سکتے ہیں۔ میں ان دونوں کے ساتھ ہی چیچہ وطنی گیا تھا پھر تین دن تک میں نے ان کے گھر میں قیام کیا ہے اور مسلسل عمل پڑھتا رہا ہوں۔ اگر میرا دھیان بٹ جاتا یا شاداں سے خیال ہٹ جاتا

تو اس پر عاشق جن میری زندگی کا چراغ گل کر دیتا۔ جب تک میں نے اس خبیث کو جلا نہیں دیا، اس گھر سے قدم باہر نہیں نکالا۔"

پھوری نے دوسری مرتبہ کسی جن کو جلانے کا ذکر کیا تھا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا واقعی تم نے کسی جن کو جلا دیا ہے؟"

"آپ کو یقین نہیں آ رہا تو شاداں کے والدین سے پوچھ لیں۔" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے ان کے سامنے اس جن کو جلایا تھا۔"

میں نے کہا۔ "بات یقین اور بے یقینی کی نہیں۔ جن ایک ناری مخلوق ہے۔ تم نے اسے کیسے جلا ڈالا؟"

پھوری نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے وہ میری عقل پر ماتم کر رہا ہو۔ میں اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے الجھن زدہ انداز میں اسے تکتا رہا۔ وہ مدبرانہ لہجے میں بولا۔

"بے شک جنات ناری مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگ سے تخلیق کیا ہے لیکن خاک کو نار پر فوقیت بھی دی ہے۔ انسان کو خاک سے بنایا گیا ہے۔ یہ اپنی عقل اور علم کو استعمال کر کے ناری مخلوق کو زیر کر سکتا ہے۔ جس طرح ہر بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے بالکل اسی طرح بڑی آگ، چھوٹی آگ کو فنا کر دیتی ہے۔ جنات سے نمٹنے کے لئے انسان کو اپنے عناصر ترکیبی میں تبدیلی لانا پڑتی ہے۔ بے شک انسان بنیادی طور پر خاکی ہے مگر اس کی تخلیق میں دیگر عناصر آگ، پانی اور ہوا کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اگر کوئی عامل اپنے عمل سے اپنے آتشی عنصر کو بڑھا کر جنات سے زیادہ درجے پر لے جائے تو وہ خود بخود جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔ یہ کھیل بہت مشکل ہے اور برسوں کی ریاضت کے بعد اس میں مہارت حاصل ہوتی ہے۔ مرشد کے فضل و کرم سے میں نے عملیات کے شعبے میں بہت کچھ سیکھ رکھا ہے۔ ویسے عام لوگوں کے سامنے اس قسم کے کھیل پیش نہیں کیے جاتے۔ ان کی آنکھیں ایسے مناظر کی متحمل نہیں ہو سکتیں اس لئے ہمیں پردے سے کام لینا پڑتا ہے۔"

پھوری نے مجھے متاثر کرنے کے لئے جنات اور عملیات پر ایک الٹی سیدھی تقریر کر ڈالی تھی اور میں بھی ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کے بیان سے قائل ہو گیا ہوں۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ میں اس سے حقیقت احوال اگلوانا چاہتا تھا۔

میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ "تم عامل کامل لوگ پردے سے کس طرح کام لیتے ہو؟"

"مجھے یقین تھا، آپ یہ سوال ضرور پوچھیں گے۔" وہ مربیانہ انداز میں اپنی موٹی گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "پردے سے میری مراد یہ ہے کہ ہم جنات کو عوام کی نظروں سے اوجھل رکھتے ہیں۔ اب شاداں والے کیس ہی کو دیکھ لیں۔ وہ ایک روز نیم کے درخت تلے بیٹھی اپنے لانبے

بال سکھا رہی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور نیم کے درخت کے اوپر ایک عاشق مزاج جن موجود تھا۔ وہ جن شاداں کے جوبن اور خوبصورتی پر مر مٹا اور پلک جھپکتے میں اس پر عاشق ہو گیا۔ جب اس جن نے شاداں کو تنگ کرنا شروع کیا تو والدین کو اس کے علاج معالجے کی فکر ہوئی اور وہ لوگ ہمارے آستانے پر پہنچ گئے۔ شاہ جنات مرحوم ومغفور پیر لوٹے شاہ کی شہرت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے اور......"

"ایک منٹ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "جن تو شاداں کے حسن اور جوانی پر عاشق ہو گیا تھا پھر وہ اسے تنگ کیوں کرتا تھا۔ عاشق تو اپنے محبوب کو ایک ذرا تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ جن کس قسم کا بے غیرت و بے حمیت عاشق تھا؟"

میرے لہجے کی نرمی رفتہ رفتہ سختی میں بدل رہی تھی۔ قصے کہانی کے لئے وقت کا مخصوص کوٹا قریب الختم تھا اور میں...... ڈراپ سین کی طرف آنے والا تھا۔

پھوری نے خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا۔ "آپ انسان عاشقوں کی بات کر رہے ہیں۔ جن عاشقوں کے بارے میں شاید آپ کو کچھ پتا نہیں۔ یہ عاشق بہت حاسد اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ جس پر یہ عاشق ہیں وہ کسی دوسرے انسان سے تعلق رکھے۔ یہ اپنی محبوبہ سے ملنے والوں سے بہت جلتے ہیں۔"

"پھر تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنی محبوبہ کے بجائے لوگوں کو تنگ کریں جو اس بے چاری کے تعلق دار ہوتے ہیں۔ اس محبوبہ کا کیا قصور۔ وہ مظلوم کیوں پستی ہے؟"

پھوری نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ "یہ ایسا بھی کرتے ہیں جناب۔ اب دیکھ لیں، شاداں کی وجہ سے اس کے والدین بھی کتنی مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ شاداں کے سب سے زیادہ قریب کرم دین اور شائستہ ہی تھے۔ ان بے چاروں نے بڑی پریشانی اٹھائی ہے۔ وہ تو مرشد کا کرم اور اللہ کا شکر ہے، شاداں شادی شدہ نہیں تھی۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ورنہ یہ خبیث جن اس کے شوہر کو ایسی کم تیسی کر دیتا۔"

میں نے اس طولانی بحث کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اور اس "پردے" کا قصہ کیا ہوا جو تم لوگ عوام کی نگاہوں کے سامنے تان دیتے ہو؟"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں جناب۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے شاداں پر عمل کیا اور اس پر عاشق جن کو حاضر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پردے کی بات یہ ہے کہ وہ جن صرف مجھے نظر آ رہا تھا، کرم دین اور شائستہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔"

"گویا تم نے ان دونوں کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

اس نے بڑی ہمت سے میرے سخت الفاظ کو برداشت کیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے جن کو حاضر کرنے کے لئے اپنے سامنے ایک تکیہ رکھ لیا تھا۔ جب میرا مخصوص عمل پورا ہوا تو شاداں پر عاشق جن اس تکیے پر آ کر بیٹھ گیا۔ شائستہ، کرم دین اور شاداں بھی اسی کمرے میں موجود تھے لیکن وہ جن میرے سوا کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس سے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے اپنا نام شجاعیل بتایا۔ میں نے کہا شجاعیل! شاداں کا پیچھا چھوڑ دے ورنہ میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔ وہ بولا، میں اس لڑکی پر فریفتہ ہوں۔ اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ اگر تم نے مجھے جلانے کی کوشش کی تو میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔ میں شجاعیل کی دھمکی میں آنے والا نہیں تھا۔ میرے عمل نے اسے تکیے پر آ کر بیٹھنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا، میری اجازت کے بغیر وہ وہاں سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے سخت انداز میں اسے تنبیہ کی، شجاعیل! میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں، اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کھا کر وعدہ کرو، اب کبھی شاداں کو تنگ نہیں کرو گے۔ اگر دس سیکنڈ کے اندر تم نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تو سمجھو، میں اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے میں حق بجانب ہوں گا۔ تمہارے لئے جان بچانے کا یہ آخری موقع ہے...... لیکن تھانے دار صاحب! شجاعیل بہت ہی ڈھیٹ اور سرکش جن ثابت ہو رہا تھا، شاید اسے اپنی طاقت پر بھی گھمنڈ ہو۔ وہ تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔ مجبوراً مجھے اپنی دھمکی پر عمل کرنا پڑا۔ میں نے شجاعیل نامی اس عاشق نامراد جن کو جلا کر خاکستر کر دیا۔"

"وہ کیسے بھئی؟" اس کے بیان کے خاتمے پر میں نے پوچھا۔

"میں نے اس تکیے کو ماچس دکھا دی جس پر شجاعیل بیٹھا ہوا تھا۔" اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ "اس طرح وہ تکیہ جل کر راکھ میں بدل گیا اور شاداں کے والدین کو یقین آ گیا کہ تکیے کے ساتھ ہی جن بھی فنا ہو گیا؟"

"اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شاداں بھلی چنگی ہو چکی ہے۔" پھوری نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "آپ چیچہ وطنی جا کر یا انہیں یہاں بلا کر تصدیق کر سکتے ہیں۔"

"تصدیق تو میں ضرور کروں گا پھوری...... اور تمہارے بیان کے ایک ایک حصے کی تصدیق کروں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری ان جناتی کہانیوں پر یقین کر لوں گا۔"

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "آپ ضرور تصدیق کریں جناب۔ تجربہ کسوٹی کا محتاج نہیں ہوتا۔ شاید آپ کا کسی جن سے پالا نہیں پڑا اسی لئے بداعتقادی کی باتیں کر رہے ہیں۔"

"جن سے پالا تو پڑ گیا ہے پھوری۔ اب آہستہ آہستہ تجربہ بھی ہو جائے گا۔"

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ "کون سے جن سے آپ کا پالا پڑا ہے جناب؟"

"اس جن کا نام ہے جوفاطیل۔" میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہا۔ "اور یہ پالا میں مار کر رہوں گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جوفاطیل نے تو مرشد صاحب قبلہ پیر لوٹے شاہ کی جان لی ہے۔ وہ بہت خطرناک جن ہے۔ آپ کہاں اس سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "پھوری! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں، لوٹے شاہ کو بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ مجھے اس کے قاتل کی تلاش ہے۔ میں اس قاتل کا نام نہیں جانتا اس لئے میں نے قاتل کا نام جوفاطیل فرض کر لیا ہے۔ ایک بات ذہن میں بٹھا لو پھوری! میں اس قاتل کو انسانی قالب ہی میں گرفتار کروں گا، چاہے وہ کسی بھی انسان کے روپ میں مل جائے اور...... وہ انسان تم بھی ہو سکتے ہو!"

"م...... میں......" پہلی مرتبہ اس کی آواز میں لکنت در آئی "میں مرشد صاحب کو کیوں قتل کروں گا...... اور میں تو قتل کے وقت جائے وقوعہ سے کئی میل دور چیچہ وطنی میں تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہوشیار مجرم اس قسم کی واردات کرتے وقت جائے وقوعہ سے عدم موجودگی کا کامل بندوبست کر لیتے ہیں۔ اور جہاں تک تمہارے پہلے سوال کا تعلق ہے تو تمہارے پیر لوٹے شاہ کو قتل کرنے کا بڑا منافع بخش جواز ہے۔"

"منافع بخش جواز؟" وہ بگڑتے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "تم اس آستانے کو بڑے ٹھیک ٹھاک طریقے سے چلانے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ اس بات کا تم اقرار بھی کر چکے ہو۔ اب تو آستانے کے اندر پیر لوٹے شاہ کے مزار کا اضافہ بھی ہو جائے گا گویا تمہاری پانچوں گھی میں ہیں۔"

"آپ بہت خطرناک باتیں کر رہے ہیں۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ "میں شاہ صاحب کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ میرے باپ کی جگہ تھے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں۔ لوگ مال و جائداد کی خاطر اپنے سگے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں، خاص طور پر وہ باپ جو اولاد کی نظر میں ان کی وراثت پر سانپ بن کر بیٹھا ہو۔ پیر لوٹے شاہ تمہارا سگا باپ نہیں تھا، بلکہ سوتیلا بھی نہیں تھا۔ وہ تمہارا مخدوم تھا اور تم اس کے چیلے چانٹے خدمت گار۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ لوٹے شاہ کے کیا مزے ہیں۔ اگر اس کی گدی تمہارے قبضے میں آ جاتی تو تم ساری زندگی عیش میں گزار سکتے تھے۔ تم اچانک خادم سے مخدوم ہو جاتے۔" میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا۔ "کسی خبیث جن جوفاطیل کی کہانی تم نے سن رکھی تھی۔ لوٹے شاہ نے تمہیں بتایا تھا کہ اس جن کی طرف سے وہ جان کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ تم نے لوٹے شاہ کی اس کمزوری

سے فائدہ اٹھایا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد تم نے سارا الزام جوفاطیل کے کھاتے میں لکھ ڈالا۔ جائے وقوعہ کو تم نے ایسی شکل دے دی کہ دیکھنے والے اس قتل کو کسی جن کی کارروائی ہی سمجھیں...... اور ایسا ہوا بھی۔ لوٹے شاہ کے سب سے بڑے حمایتی چوہدری فیروز دین نے لاش دیکھتے ہی اعلان کر دیا کہ شاہ جی کو جوفاطیل نے قتل کیا ہے۔ پھوری! تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری پانچوں گھی میں ہیں تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ دیکھ لینا، میں بہت جلد تمہارا سر کڑاہی میں کروں گا...... ایسی کڑاہی جس کے نیچے کندۂ جہنم کی آگ دہک رہی ہو گی اور کڑاہی میں موجود گھی کی کڑکڑاہٹ سے تمہارا دل دہل کر رہ جائے گا۔ ذرا تصور کرو، تمہارا کتنا حسرت ناک خاتمہ ہونے والا ہے۔"

"م...... میں نے کچھ...... نہیں کیا تھانے دار صاحب!" وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ چیچہ وطنی جا کر تصدیق کر......"

"میں نے کہا نا، تصدیق کروں گا۔" میں نے دبکا مار کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

وہ منت ریز انداز میں بولا۔ "تصدیق کے بعد آپ کا شک رفع ہو جائے گا لیکن آپ سے ایک درخواست کروں گا۔"

"کیسی درخواست؟" میں نے بے اعتنائی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو جوفاطیل کی کارروائی کا یقین نہیں ہے ناں؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "میں جوفاطیل اور شجاعیل جیسے تمام فراڈ جنوں اور ان کے عاملوں پر یقین نہیں رکھتا۔ بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جناب! جنات کا ذکر تو قرآن میں بھی آیا ہے۔"

اس نے اپنی جہالت کا آخری ثبوت بھی پیش کر دیا۔ میں نے برہمی سے کہا۔ "میں قرآن مجید کو دل و جان سے مانتا ہوں اور اس میں موجود تمام تذکروں پر ایمان رکھتا ہوں مجھے بتاؤ، تمہارے جوفاطیل یا شجاعیل کا ذکر کس پارے اور کس آیت میں درج ہے۔ اگر تم نے اللہ کی مقدس کتاب کا حوالہ دیا ہے تو اس کا یہی مطلب ہے، تم ان فرضی جنوں کو قرآن سے ثابت کرنا چاہتے ہو!"

وہ میرے ترش اور سخت رویے سے گھبرا کر بغلیں جھانکنے لگا اور مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان جنات کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ قرآن پاک میں تو نشانیاں بیان کی گئی ہیں، سمجھنے والوں کے لئے۔ بہر حال......"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خجالت کے اثرات تھے۔ میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "پھر تمہارا کیا مطلب تھا پھوری؟" میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم نے یہ کیوں پوچھا تھا کہ مجھے جوفاطیل کی کارروائی پر یقین ہے یا نہیں؟"

"وہ جنات!" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "دراصل! یہ خبیث جن کچھ عرصہ پہلے گاؤں کی ایک حسین وجمیل لڑکی پر عاشق ہوگیا تھا۔ پیر لوٹے شاہ اس لڑکی کا علاج کر رہے تھے کہ اس جن نے انہیں جان سے مارنے کی دھمکی دے ڈالی۔ آپ کو اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ جیواں بی بی سے جوفاطیل کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔"

میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "یعنی ایک اور عاشق جن کی کہانی۔ بہرحال، تمہاری یہ جیواں بی بی کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟"

"جیواں، فرزانہ کی بوڑھی ماں ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ اسی گاؤں میں رہتی ہے۔ فرزانہ پر جوفاطیل عاشق ہوگیا تھا۔"

"پیر لوٹے شاہ نے فرزانہ کا علاج کیا تو وہ خبیث جن تمہارے مرشد کا دشمن ہوگیا۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "یہی کہنا چاہتے ہو ناں؟"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! اگر فرزانہ کا علاج مکمل ہو جاتا تو شاہ جنات، پیر لوٹے شاہ اس مکار جن کو جلا کر راکھ کر دیتے۔ یہ خبیث کسی زمانے میں شاہ صاحب کے قبضے میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی منت سماجت اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم کے بعد شاہ جی نے اسے آزاد کر دیا تھا۔"

یہ بات جائے وقوعہ پر چوہدری فیروز دین نے بھی مجھے بتائی تھی۔ یعنی جوفاطیل کے قبضے اور رہائی والی بات! میں نے پھوری کے تازہ ترین انکشاف کے حوالے سے سوال کیا۔ "لوٹے شاہ فرزانہ کا علاج مکمل کیوں نہ کر سکا۔ اس میں ایسی کیا رکاوٹ آگئی تھی؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں جناب!" وہ سادگی سے بولا۔ "علاج کی آخری حاضری باقی تھی کہ میں چیچہ وطنی چلا گیا۔"

"آخری حاضری...... کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے بتایا۔ "جناب! فرزانہ کا علاج چار جمعرات پر محیط تھا۔ چار نوچندی جمعرات پر یعنی چار مہینوں میں اسے جوفاطیل سے نجات ملنا تھی۔ میرے ہوتے ہوئے تین نوچندی جمعرات تک تو فرزانہ باقاعدگی کے ساتھ آستانے پر آتی رہی تھی لیکن آخری اور چوتھی جمعرات وہی تھی جب میں شاداں کا جن اتارنے چیچہ وطنی چلا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم اس جمعرات کو فرزانہ آستانے پر آئی تھی یا نہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "شاہ صاحب کی موت جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب واقع ہوئی ہے۔ آپ حقیقت حال کو جاننے کے لئے فرزانہ سے رابطہ کیوں نہیں کرتے؟"

اس کے آخری سوال نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا فرزانہ رات کے وقت آستانے پر اپنا علاج کروانے آئی تھی؟"

اس نے جواب دیا۔ "تین نوچندی جمعرات کو تو عصر اور مغرب کے درمیان وہ آستانے پر آئی تھی۔ شاہ جی نے مجھے بتایا تھا کہ چوتھی جمعرات کو اسے مغرب کے بعد آنا تھا۔ تین جمعرات کے عمل سے شاہ صاحب نے جوفاطیل کو فرزانہ پر سے اتارا تھا اور چوتھی جمعرات کو وہ اس باغی جن کو اپنے قبضے میں کرنے والے تھے تاکہ اس کے بعد وہ مخلوق خدا کو تنگ کرنے کے قابل نہ رہے۔ اس موقع پر فرزانہ کا وہاں موجود رہنا ضروری تھا اسی لئے شاہ صاحب نے اسے سورج غروب ہونے کے بعد بلایا تھا لیکن لوٹے شاہ کا قتل یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس رات یقیناً کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب جوفاطیل کو قابو کرنے میں ناکامیاب رہے اور وہ اپنا کام کر کے فرار ہوگیا۔"

میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "پیر لوٹے شاہ اس خبیث جن کو اس لئے قابو نہ کر سکے کہ ان کے لوٹے میں کوئی سوراخ موجود ہوگا۔ بہرحال، تم نے فرزانہ اور جیواں بی بی کی راہ خوب سجھائی ہے۔ میں کل صبح ہی گاؤں جا کر ان سے ملوں گا۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے تھانے دار صاحب!" وہ فدویانہ انداز میں بولا۔ "اب تو آپ مجھے جانے کی اجازت دے دیں۔"

میں نے کڑک کر کہا۔ "تھانے سے جانے کا نام نہیں لینا پھوری۔ میں جب تک تمہاری باتوں کو پرکھ نہ لوں تمہارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتا...... اور اس وقت تک تم خود کو سرکاری مہمان تصور کرو۔"

"اب تو آپ بھی زیادتی کرنے لگے تھانے دار صاحب!" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔ "میں نے آپ کو ایک ایک بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتا دی ہے پھر بھی مجھے تھانے میں بند کر رہے ہیں۔ یہ تو انصاف نہ ہوا؟"

"اوئے انصاف کے گھوڑے۔" میں نے اسے گھرکا۔ "جج بننے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے تو مجھے تمہارے صرف اس بیان کی تصدیق کرنا تھی کہ تم جمعرات دوپہر سے اب تک چیچہ وطنی میں تھے یا نہیں۔ اب یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ تم نے فرزانہ والے واقعے کے بارے میں جو انکشاف کیا ہے، اس میں کتنی حقیقت ہے۔ چیچہ وطنی والی تصدیق تو کل دوپہر تک ہی ہو سکے گی البتہ فرزانہ کی ماں سے میں صبح ہی جا کر ملوں گا اس لئے......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر پھوری کی آنکھوں میں جھانکا اور سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "تمہارے پاس صرف آدھی رات کی مہلت ہے۔ میں اپنے تھانے کے عملے سے صرف اتنی سفارش کر سکتا ہوں کہ وہ کل میرے تھانے آنے تک تمہیں ہاتھ نہ لگائیں۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر تم کسی بھی طور پیر لوٹے شاہ کے قتل میں ملوث ہو یا اس کے قتل کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو شرافت سے اقرار کر لو۔ قتل کے ذیل میں کسی جوفاطیل شوفاطیل کا نام نہیں سنوں گا۔ تم کل صبح سے پہلے فیصلہ کر لینا کہ تمہیں سچ بول کر جان چھڑانا ہے یا

غلط بیانی سے کام لے کر جان گنوانا ہے کیونکہ اگر تمہارا بیان درست ثابت نہ ہوا تو میرے تھانے کا عملہ موت کے فرشتے کا روپ دھار لے گا......''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بے حد خوف کے عالم میں بولا۔''جناب! میں نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں۔''

''مجھے تمہاری قسموں اور وعدوں کی ضرورت نہیں۔'' میں نے رکھائی سے کہا۔''میرا تسلی کرنے کا اپنا طریقہ کار ہے اور جب تک میں تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہو جاتا، تمہاری جان یونہی سولی پر ٹنگی رہے گی۔''

وہ مایوسی بھرے انداز میں خاموشی سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اسے واپس حوالدار کے حوالے کیا اور خود اپنے سرکاری کوارٹر میں آ کر سو گیا۔ کل کا دن بہت مصروفیت میں گزرنے والا تھا اور اس کے لئے بھرپور نیند لینا ضروری تھا۔

❁❁❁

اگلی صبح میں جیواں نامی عورت سے ملنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ اے ایس آئی زمان خان بوجوہ میرے ساتھ نہ جا سکا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ چیچہ وطنی والے معاملے کو نمٹا لے۔ میرے لئے اس بات کی تصدیق بہت ضروری تھی کہ وقوعہ کی رات پھوری جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ میں نے ایک سنیئر کانسٹیبل وہاب کو اس دورے میں شامل کر لیا۔ جیواں کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے دروازے پر دستک دینے سے قبل میں اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک بیوہ عورت تھی اور اپنی اکلوتی بیٹی فرزانہ کے ساتھ رہتی تھی، فرزانہ کا باپ اپنی موت سے پہلے ان کے لئے بہت کچھ کر گیا تھا اس لئے جیواں کسی معاشی مسئلے سے دوچار نہیں تھی۔ اس کے شوہر کی چھوڑی ہوئی زمینیں ان کی ساری زندگی کے لئے کافی تھیں۔

دستک کے جواب میں ایک پچاس پچپن سالہ عورت نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور پوچھا ''کون ہے؟''

پھر ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی کیونکہ اس وقت ہم باقاعدہ یونیفارم میں تھے پتا نہیں کیوں، پولیس کے حوالے سے عوام کے دل میں بڑا خوفناک تصور ہے۔ وردی دیکھتے ہی اکثر لوگ خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں حالانکہ پولیس والے بھی عام انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عوام کے اس ڈر خوف اور جھجک میں دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا بھی ہاتھ ہے۔

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ دروازہ کھولنے والی وہ بوڑھی عورت جیواں کے سوا اور کوئی نہیں ہو گی کیونکہ اس گھر کا دوسرا فرد فرزانہ تھی جو یقیناً جوان تھی جبھی تو

جو فاطیل نامی وہ خبیث جن اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ میں نے جیواں کے ''کون؟'' کے جواب میں کہا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کے تھانے کا انچارج ہوں۔''

''اچھا جی، اچھا جی۔'' وہ مرعوب ہوتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔''خیریت تو ہے۔ آپ یہاں میرے دروازے پر؟''

''خیریت نہیں ہے جیواں۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔''

''اللہ خیر کرے۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی پھر گلی میں دائیں بائیں نظر دوڑانے کے بعد اس نے کہا۔''آپ اندر آ جائیں۔ دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنا مناسب نہیں۔''

ہم دونوں جیواں کی پیشکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ ایک عام سا گھر تھا جیسا کہ چھوٹی فیملی کی ضرورت کے تحت ہوتا ہے۔ جیواں نے ہمیں ایک بیٹھک نما کمرے میں بٹھایا اور خاطر داری کے حوالے سے سرگرمی دکھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی بیٹھک میں بیٹھ گئی۔

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں جیواں۔ میں تم سے چند باتیں کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ مجھے امید ہے، تم میرے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دو گی۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔''تمہاری بیٹی فرزانہ نظر نہیں آ رہی۔ کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''ہاں، وہ اپنے چاچے کے گھر گئی ہے۔''

''کیا اس کے چاچے یعنی تمہارے دیور کا گھر اسی گاؤں میں ہے؟''

''نہیں، غفار علی چک چونتی (چونتیس) میں رہتا ہے۔'' جیواں نے جواب دیا۔

چک چونتیس اس گاؤں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے جیواں سے پوچھا۔''فرزانہ کو اپنے چاچے کے گھر گئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''وہ اسی جمعے کو گئی ہے۔'' جیواں نے بتایا۔''غفار ہمارے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ کچھ دن اس کے گھر رہنے کو چلی گئی۔''

فرزانہ کی روانگی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جمعہ وہی دن تھا جب میں پیر لوٹے شاہ کے قتل کی اطلاع پر اس کے آستانے پر پہنچا تھا اور پھوری کے بیان کے مطابق فرزانہ کو جمعرات کی رات اپنے علاج کے سلسلے میں آخری حاضری بھرنے آستانے پر آنا تھا۔ اب تک حاصل شدہ معلومات کے مطابق فرزانہ ہی وہ ہستی ہو سکتی تھی جو لوٹے شاہ کی زندگی میں آخری مرتبہ اس سے ملی ہو اس حوالے سے فرزانہ میرے لئے بہت اہم تھی۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر جیواں نے پوچھا۔''آپ بار بار فرزانہ کا ذکر کیوں کر رہے ہیں،

آخر بات کیا ہے؟''

''بات بہت ہی خطرناک ہے جیواں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم یہ بتاؤ، فرزانہ واپس کب آئے گی؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ''ابھی تو وہ گئی ہے۔ چند دن رہنے کے بعد ہی واپس آئے گی۔ غفار کے گھر میں اس کا بہت دل لگتا ہے مگر......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اضطراری انداز میں مجھے دیکھا۔ ''آپ کس قسم کی تفتیش کرتے پھر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں دراصل پیر لوٹے شاہ کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اسی سلسلے میں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''لل...... لیکن میرا یا فرزانہ کا شاہ جی کے قتل سے کیا واسطہ۔'' وہ حد درجہ ہراساں نظر آنے لگی۔

''بہت گہرا تعلق اور واسطہ ہے جیواں بی بی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''خاص طور پر تمہاری جوان بیٹی فرزانہ تو اس قتل کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے، وقوعہ کی رات وہ جائے واردات پر گئی تھی۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' جیواں نے سختی سے کہا۔ ''کسی نے آپ کو بالکل غلط بتایا ہے۔ فرزانہ کا شاہ جی کے قتل یا قاتل سے کوئی تعلق نہیں۔''

''یہ تو نہ کہو جیواں۔'' میں نے اسے ایک اور زاویے سے گھیرنے کی کوشش کی۔ ''قتل سے نہ سہی لیکن لوٹے شاہ کے قاتل سے تو تمہاری بیٹی کا بہت گہرا تعلق ہے۔''

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''شاہ صاحب کو تو ایک جن نے قتل کیا ہے اور...... یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سارا پنڈ جانتا ہے۔''

''تم جوفاطیل نامی جن کی بات کر رہی ہو ناں؟''

''ہاں، ہاں۔ اسی خبیث نے شاہ جی کو قتل کیا ہے۔''

''اسی لئے تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ فرزانہ کا قاتل سے بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا پھر اسی کی سوچ کے مطابق پوچھا۔ ''کیا کچھ عرصہ پہلے یہی جوفاطیل تمہاری بیٹی پر عاشق نہیں رہا تھا۔ شاہ صاحب کے علاج نے فرزانہ کو ٹھیک کر دیا تو یہ نامراد لوٹے شاہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''یہ بات تو آپ سولہ آنے ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس بات میں بھی کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں کہ فرزانہ وقوعہ کی رات آستانے پر گئی تھی۔''

''میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔'' وہ گردن جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''فرزانہ وہاں نہیں گئی۔ آخر

اسے وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھا؟''

''ضرورت...... علاج کی تکمیل!''

''اس کا علاج تو مکمل ہو گیا تھا۔'' جیواں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں، ایک نوچندی جمعرات ابھی باقی تھی...... وہی جمعرات جب لوٹے شاہ کو قتل کیا گیا۔ تم میری بات سے انکار نہیں کر سکتی۔''

''میں انکار کروں گی۔'' وہ شدت سے بولی۔ ''کیونکہ فرزانہ کا علاج تین نوچندی جمعرات کی حاضری سے مکمل ہو گیا تھا۔ چوتھی جمعرات کو آستانے پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ایک لمحے کو مجھے محسوس ہوا، پھوری نے کہیں مجھے غلط راہ پر ڈالنے کے لئے تو چوتھی جمعرات کی کہانی نہیں سنائی تھی۔ عین ممکن تھا، وہ اپنی طرف سے میری توجہ ہٹانا چاہتا ہو۔

میں نے جیواں سے کہا۔ ''تین نوچندی جمعرات کے عمل سے پیر لوٹے شاہ نے تمہاری بیٹی کا جن اتار دیا تھا اور چوتھی جمعرات کو وہ جوفاطیل نامی اس جن کو قابو میں کرنے کا کوئی عمل کرنا چاہتا تھا اور اس نے شرط لگا دی تھی کہ اس موقع پر فرزانہ کو آستانے پر موجود ہونا چاہیے۔''

''آپ کو کسی نے بالکل غلط بتایا ہے۔'' وہ روہانسا ہو گئی۔ ''تین نوچندی جمعرات کے بعد شاہ جی نے فرزانہ کو بالکل تندرست قرار دے دیا تھا۔ چوتھی جمعرات کو انہیں جوفاطیل کے ساتھ جو کچھ بھی کرنا تھا اس کے لئے فرزانہ کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ پتا نہیں کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟''

میں واقعی نہیں جانتا تھا کہ اس وقت سچا کسے سمجھوں اور کسے جھوٹا جانوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں جن کی اس کہانی کو سرے سے ہضم ہی نہیں کر پایا تھا۔ اس قتل کے پیچھے کوئی گہرا راز تھا اور اس راز تک پہنچے بغیر میں قاتل کو بے نقاب نہیں کر سکتا تھا۔ اس راز تک پھوری اور فرزانہ ہی میری راہنمائی کر سکتے تھے۔ پھوری میرے چنگل میں آ چکا تھا، فرزانہ پر ہاتھ ڈالنا باقی تھا۔ میں نے فرزادہ تک رسائی حاصل کرنے کے لئے جیواں سے پوچھا۔

''چک چونتیس میں فرزانہ کا چاچا کیا کرتا ہے؟''

''زمیں دار، زمیں داری ہی کریگا۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن آپ یہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں فرزانہ سے ملنے وہاں جانا چاہتا ہوں یا پھر اپنے کسی بندے کو چک چونتیس بھیج کر اسے یہاں بلاؤں گا تا کہ حقیقت حال سے پردہ اٹھ سکے۔''

''حقیقت وہی ہے جو میں آپ کو بتا چکی ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''فرزانہ وقوعہ کی رات آستانے پر گئی تھی اور نہ ہی شاہ جی کے قتل سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ آپ خوامخواہ میری بیٹی کو پریشان کریں گے۔''

''لوٹے شاہ کے قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں جیواں۔'' میں نے سنسناتے ہوئے الفاظ میں کہا۔ ''جو شخص بھی قانون کی راہ میں رکاوٹ بنے گا، رگڑا

جائے گا۔"

وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگی پھر ڈرتے ڈرتے پوچھ بیٹھی۔ "ایک بات تو بتائیں تھانے دار صاحب! آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے کہ میری بیٹی وقوعہ والی جمعرات کو پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر گئی تھی؟"

اس کا سوال نہایت ہی معقول تھا لہٰذا میں نے جواب دینے میں کوئی عار محسوس نہ کی اور کہا۔ "پیر لوٹے شاہ کے خادم خاص اور مستقبل کے لوٹا نواز غفور عرف پھوری نے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھوری ایسی بات کیوں کرے گا؟ وہ تو شاہ جی کے بہت قریب تھا۔ اسے بھی یہ بات معلوم تھی کہ فرزانہ کا علاج ختم ہو چکا ہے مجھے یقین نہیں آ رہا۔ میں پھوری سے جا کر پوچھوں گی۔"

"ضرور پوچھنا۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "لیکن پھوری سے سوال و جواب کے لئے تمہیں میرے تھانے کی حوالات تک آنا ہوگا۔ جنات کو قبضے میں کرنے والا لوٹے شاہ کا چیلا اس وقت قانون کے قبضے میں ہے۔"

"آ...... آپ نے اسے...... کس جرم میں پکڑا ہے...... تھانے دار صاحب؟" وہ شکستہ لہجے میں بولی۔

میں نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ "اس پر ممکنہ قاتل ہونے کا شبہ ہے۔ اس نے تفتیش کے دوران میں یہ انکشاف کیا ہے کہ چوتھی جمعرات کو مغرب کے بعد فرزانہ کی آخری حاضری تھی۔ فرزانہ کی موجودگی میں لوٹے شاہ نے جوفاطیل کو کسی خطرناک عمل کے ذریعے اپنے قبضے میں کرنا تھا۔"

"اگر پھوری نے اس قسم کی بات کی ہے تو بہت غلط کیا ہے۔" جیواں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میں تین نوچندی جمعرات تک خود فرزانہ کے ساتھ شاہ جی کے آستانے پر جاتی رہی ہوں۔ اگر انہوں نے چوتھی جمعرات کو بلایا ہوتا تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ فرزانہ اکیلی، مجھے بتائے بغیر تو آستانے پر نہیں جا سکتی تھی۔"

جیواں کی الجھن اور رد انکار کو دیکھتے ہوئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر پھوری نے چوتھی نوچندی جمعرات کے حوالے سے کسی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تو پھر ایسا ہوگا کہ لوٹے شاہ نے آخری حاضری کے بارے میں فرزانہ کی ماں کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ اس سلسلے میں بات فرزانہ اور لوٹے شاہ کے درمیان رہی ہوگی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یقیناً وقوعہ کی رات آستانے پر کوئی بڑا اور برا واقعہ پیش آیا ہوگا۔ میں لوٹے شاہ جیسے ڈبا پیروں اور نقلی عاملوں سے بخوبی واقف تھا۔ ایسے ایک دو ناسوروں کی میں بڑے شافی طریقے سے سرکوبی بھی کر چکا تھا۔ قارئین نے یہ عبرت اثر کہانیاں سسپنس کے انہی صفحات میں یقیناً پڑھی ہوں گی۔

میں نے کرید جاری رکھتے ہوئے جیواں سے پوچھا۔ "تم تین نوچندی جمعرات تک فرزانہ

کے ساتھ آستانے پر جاتی رہی ہو۔ مجھے بتاؤ، لوٹے شاہ تمہاری بیٹی کا جن اتارنے کے لئے کس قسم کا عمل کرتا تھا؟"

"مجھے وہ عمل دیکھنے کی اجازت نہیں تھی۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ عمل تمہارے سامنے بھی نہیں کیا جاتا ہوگا؟"

"شاہ جی کا حکم تھا، میں فرزانہ کو عصر کے وقت آستانے پر پہنچا دوں۔" جیواں نے بتایا۔ "وہ اسے اپنے ساتھ خاص حجرے میں لے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا، جوفاطیل کو اگر کسی کی موجودگی میں کیلا گیا تو وہ آس پاس نظر آنے والے لوگوں کی جان بھی لے سکتا ہے۔"

لوٹے شاہ کی عیاریاں ایک ایک کر کے کھل رہی تھیں۔ میں نے جیواں سے پوچھا۔ "تم اس عمل کے دوران یقیناً آستانے کے ہال نما کمرے میں بیٹھی رہتی ہو گی جہاں وہ دن بھر اپنے پاس آنے والوں سے ملاقات کرتا تھا؟"

"مجھے آستانے پر رکنے کی اجازت نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "شاہ جی کے حکم کے مطابق میں فرزانہ کو عصر کے وقت آستانے پر چھوڑ کر گھر واپس آ جاتی تھی اور مغرب کے بعد اسے لینے جاتی تھی۔ عصر سے مغرب تک وہ شاہ جی کے ساتھ ان کے حجرے میں رہتی تھی۔"

"اور تمہارے خیال میں لوٹے شاہ کے عمل سے تمہاری بیٹی صحت یاب ہو رہی تھی؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پہلے عمل ہی سے نمایاں فرق نظر آنے لگا تھا پھر دوسری نوچندی جمعرات کو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اس روز جب مغرب کے بعد میں اسے لینے گئی تو شاہ جی نے کہا تھا، ہم نے تمہاری بیٹی کا جن اتار دیا ہے اور اسے ضروری ہدایت بھی دی ہیں۔ اگر یہ ہمارے مشوروں پر عمل کرتی رہی تو یہ خبیث جن اس کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ ویسے آئندہ نوچندی جمعرات کو ہم جوفاطیل کو اپنے قبضے میں کر لیں گے پھر نہ رہے گا بانس اور نہ بج سکے گی بانسری۔"

لوٹے شاہ کے داؤ پیچ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ میں نے جیواں سے پوچھا۔ "لوٹے شاہ نے تمہاری بیٹی کو کس قسم کی ہدایات دی تھیں؟"

"یہ تو میں نے ان سے نہیں پوچھا۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ "ظاہر ہے، کچھ پڑھنے ہی کو بتایا ہوگا۔ میں نے دیکھا تھا، اس روز کے بعد وہ زیر لب کوئی وظیفہ پڑھتی رہتی تھی۔ میں یہی سمجھی کہ وہ شاہ جی کی ہدایات پر عمل کر رہی ہے۔"

اس گفتگو کے دوران میں، میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ جیواں چوتھی نوچندی جمعرات کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اگر پھوری کا بیان درست تھا تو پھر اس معمے پر فرزانہ ہی روشنی ڈال سکتی تھی۔ میں نے پہلی فرصت میں فرزانہ تک پہنچنے کا ارادہ کیا اور جیواں سے اس کی بیماری کی بابت سوالات کرنے لگا تا کہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے کوئی مناسب سا سرا ہاتھ آ سکے۔

"جیواں!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "تم نے فرزانہ کے علاج کی

جو کہانی سنائی ہے اس سے تو لگتا ہے، لوٹے شاہ کوئی بہت ہی اونچی چیز تھا ورنہ جنات سے ٹکر لینا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"وہ بہت کرنی والے تھے!" جیواں معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہاری بیٹی کو آخر بیماری کیا تھی؟"

"فرزانہ پر ایک جن عاشق ہو گیا تھا۔" اس نے وہی رٹا رٹایا جواب دیا جو میں پھوری کی زبانی سن چکا تھا۔

میں نے جیواں کے گھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "میں نے تو سن رکھا ہے، یہ جن جب کسی پر عاشق ہو جاتے ہی تو اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔" پھر میں نے اپنی بات میں بگھار لگانے کی خاطر غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اضافہ کیا۔ "اللہ بخشے! میں نے اپنی دادای کا قصہ سن رکھا ہے۔ ان پر ایک دیو عاشق تھا۔ شاید اس کا نام "کاشو" تھا۔ کاشو دادی جان کے بہت مزے کراتا تھا۔ انہیں کھانے پینے کا بہت شوق تھا چنانچہ ان کے شوق کو پورا کرنے کے لئے کاشو پتا نہیں کہاں کہاں سے کھانے پینے کی اشیا اٹھا اٹھا کر ہمارے گھر لاتا رہتا تھا۔ ہمارے گھر مختلف قسم کی مٹھائیوں اور پھلوں سے بھرا رہتا۔ ابا جان بتاتے ہیں ان تحائف میں بعض تو ایسے ہوتے تھے جو کسی اور ہی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسی لذیذ مٹھائیاں اور پھل پہلے کسی نے دیکھنے تھے اور نہ ہی چکھے تھے۔"

"کوئی نہیں۔" جیواں ہاتھ نچاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "جوفاطیل تو میری بچی کو بہت تنگ کرتا تھا۔ آپ کی دادی پر عاشق ہونے والا دیو کوئی شریف النفس ہو گا۔ یہ جوفاطیل تو خبیثوں کا سردار تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "جوفاطیل تمہاری بیٹی فرزانہ کو کس طرح تنگ کرتا تھا؟"

"وہ جب فرزانہ کے پاس آتا تو اسے دورہ پڑ جاتا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اسے اپنا کچھ ہوش نہ رہتا۔ گردن اکڑ جاتی، ہاتھوں اور پاؤں کی حالت بھی بگڑ جاتی، گردن مڑ جاتی اور منہ سے جھاگ جاری ہو جاتے۔" یہ ساری علامتیں مرگی کے مرض کی تھیں۔ جیواں نے مزید بتایا۔ "اس کیفیت میں فرزانہ بہت جنونی ہو جاتی۔ چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکتی اور جو بھی اسے روکنے یا پکڑنے کی کوشش کرتا، وہ اسے بے دریغ کوٹ کر رکھ دیتی حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو بھی نوچنے کھسوٹنے سے باز نہیں آتی تھی۔" اب یہ کیس ہسٹیریا کے دائرے میں داخل ہو رہا تھا۔ شائزو فیرینیا (SCHIZO PHRENIA) کے مریض بھی کچھ اسی قسم کا رویہ پیش کرتے ہیں۔

جیواں کی بات جاری تھی۔ "ایک مرتبہ تو اس نے میری بھابی کو جھنجھوڑ کر اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرائی اور اس کا سر پھٹ گیا۔ اس روز کے بعد وہ ہمارے گھر بھی نہیں آئی حالانکہ اسے بڑا چاؤ تھا، وہ اپنے بیٹے طفیل کی شادی فرزانہ سے کرے گی۔ فرزانہ کے دوروں نے طفیل کو

اس قدر خوف زدہ کیا کہ اس نے اس سے شادی کا خیال دل سے نکال دیا۔ ایسی آسیب زدہ لڑکی سے بھلا کون شادی کی ہمت کر سکتا ہے...... اور وہ بھی کسی خبیث جن کی محبوبہ سے!"

جیواں نے ایک جھرجھری لی اور خاموش ہو گئی۔ فرزانہ کے رشتے کے حوالے سے اس نے رواروی میں بہت اہم باتیں اگل دی تھیں۔ میں بڑی سنجیدگی سے جیواں کی بھابی اور اس کے بیٹے طفیل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس وقت میرے ذہن میں بہت سے سوالات چکرا رہے تھے اور میں فوری طور پر کسی نتیجے پر پہنچنے کی پوزیشن میں نہیں تھا چنانچہ میں دوبارہ جیواں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"فرزانہ کے اس دورے کو کس طرح کنٹرول کیا جاتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"شاہ صاحب نے ایسے موقع کے لئے ایک خاص قسم کا شربت دے رکھا تھا۔" جیواں نے بتایا۔ "ہم کسی طرح کوشش کر کے وہ شربت تھوڑا سا اس کے حلق میں انڈیل دیتے۔ تھوڑی دیر بعد وہ شانت ہو جاتی۔"

"یہ دورہ اسے کتنے عرصہ بعد پڑتا تھا؟"

"ہفتے، دس دن میں ایک مرتبہ۔" اس نے بتایا۔ "شاہ صاحب کے علاج سے فائدہ ہونے لگا اور یہ وقفہ بڑھتے بڑھتے ایک ماہ تک پہنچ گیا۔ تیسری نوچندی جمعرات کے بعد فرزانہ کو دورہ نہیں پڑا۔ شاہ جی نے کہا، اب یہ لڑکی خبیث جن کے اثرات سے پاک ہو گئی ہے۔ آج میں نے جو عمل کیا ہے اس کا نتیجہ صبح ہونے سے پہلے ظاہر ہو گا۔ تم اپنی آنکھوں سے ثبوت دیکھ سکو گی کہ جوفاطیل چلا گیا...... تمہاری بیٹی کی جان چھوٹ گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔"

"تو کیا تم نے دوسری صبح وہ ثبوت دیکھا تھا؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔ "جن تو تمہیں نظر نہیں آیا ہو گا، پھر وہ کس قسم کا ثبوت تھا؟"

اس نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔ "شاہ جی نے جوفاطیل کے جانے کی ایک مخصوص نشانی بتائی تھی۔ تیسری نوچندی جمعرات کے بعد جمعے کی صبح جب میں سو کر اٹھی تو میرے گھر کے صحن میں شاہ صاحب کی بتائی ہوئی نشانی موجود تھی۔"

"اور وہ نشانی کیا تھی؟" میں نے اس سادہ لوح عورت کی عقل پر صف ماتم بچھاتے ہوئے پوچھا۔

"جوفاطیل کے قدموں کے نشان۔" اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "صحن میں، ہمارے کمرے سے لے کر بیرونی دروازے تک بڑے بڑے قدموں کے نشان بنے ہوئے تھے جو یقینی طور پر کسی جن کے پاؤں ہی ہو سکتے تھے۔ میں نے سن رکھا ہے اور شاہ جی نے بھی بتایا تھا، جن کسی قسم کا لباس نہیں پہنتے، صرف ایک لنگوٹ میں رہتے ہیں تاکہ ستر پوشی ہوتی رہے اور وہ اپنے جسم پر پہلوانوں کی طرح ہر وقت تیل مل کر رکھتے ہیں۔ جوفاطیل کے قدموں کے نشان بھی

اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ بہت چکنے نشان تھے۔"

اس احمقانہ انکشاف کے بعد میرا دھیان خود بخود پھوری کی طرف چلا گیا۔ وہ ڈیل ڈول میں کسی جن کی مانند تھا۔ لوٹے شاہ جیواں جیسی سادہ لوح عورت کو الّو بنانے کے لئے پھوری سے کام لے سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے پاؤں پر تیل یا گھی مل کر جیواں کے گھر کے صحن سے گزر جاتا تو لوٹے شاہ کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ اب میں اس کھیل کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں جیواں کے گھر سے اٹھ کر تھانے آ گیا۔

❁❁❁

اسی شام اے ایس آئی زمان خان چیچہ وطنی سے واپس آ گیا اور اس نے مجھے جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق، پھوری اپنے بیان میں سچا نظر آنے لگا۔ بیان سے مراد اس کے کلام کا وہ حصہ ہے جس میں جائے واردات سے اس کی عدم موجودگی ثابت ہوتی تھی۔ یہ بات صاف ہو گئی کہ پھوری نے اپنے مرشد پیر لوٹے شاہ کو قتل نہیں کیا تھا۔ مذکورہ شب اول و آخر وہ چیچہ وطنی میں کرم دین کے گھر پر موجود رہا تھا۔ کرم دین اور اس کی گھر والی شائستہ نے تو شاداں کے جن شجاعیل اور پھوری کے عملیات کی تصدیق بھی کی تھی تاہم مجھے اس قسم کے ناٹکی اور فضول قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر پھوری کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اسے یہ بات پتا چل چکی تھی کہ اے ایس آئی چیچہ وطنی سے کیا رپوٹ لایا ہے اسی وجہ سے وہ خاصا بااعتماد اور مطمئن نظر آتا تھا۔ میں نے پیر لوٹے شاہ کے قتل کے سلسلے میں اس سے کوئی بات نہیں کی اور اختراعی جن جوفاطیل کے بارے میں سوال کیا۔

واضح رہے کہ جوفاطیل اور شجاعیل اس کہانی کے بیان کردہ کرداروں کے نام ہیں اس لئے میں انہیں من و عن بیان کر رہا ہوں تاکہ عوام کی ذہنیت اور فراڈ لوگوں کے کارنامے کھل کر سامنے آ سکیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں کہانی کے جناتی قصوں سے قطعاً اتفاق نہیں کرتا۔

"پھوری!" میں نے اپنے سامنے کھڑے مستقبل کے عامل کامل پیر کھوٹے شاہ کو مخاطب کیا۔ "لوٹے شاہ کے جوفاطیلی کھیل میں تم نے بڑا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ، تم نے اپنے پاؤں پر تیل ملا تھا یا گھی؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!" وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "شاید آپ کا اشارہ قدموں کے ان نشانات کی طرف ہے جو جوفاطیل نے جیواں کے صحن میں ڈالے تھے!"

"شاید یا غالباً نہیں۔" میں نے اسے گھورا۔ "بلکہ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ لوٹے شاہ کے جناتی ڈرامے کا آخری سین تمہارے کردار کا رہین منت ہے۔ وہ نشانات تمہارے

قدموں کے سوا کسی اور کے نہیں ہو سکتے!"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں نے اس کی زبان کھولنے کے لئے اسے ایک جلاد صفت کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔ پانچ منٹ کے بعد اس کی گویائی کے بند کھل گئے۔ دراصل جب سے اسے معلوم ہوا تھا، قاتل کی حیثیت سے اس پر سے شک جاتا رہا ہے، وہ خاصا پراعتماد نظر آنے لگا تھا اسی لئے اس نے "خاطر مدارت" کروانے کے بجائے سچ اگلنے کو ترجیح دی اور اس بات کا اقرار کر لیا کہ لوٹے شاہ المعروف بہ شاہ جنات کے ایما پر اسی نے جوفاطیل کے قدموں والا ڈراما رچایا تھا۔ سخت سردیوں کی رات میں لوگ اپنے لحاف میں دبکے پڑے تھے۔ فرزانہ اور اس کی ماں جیواں بھی کمرے سے نکلنے کا تصور نہیں کر سکتی تھیں چنانچہ آدھی رات کے بعد پھوری نے اپنے پاؤں پر گھی کی اچھی خاصی مقدار مل کر وہ اداکاری دکھائی۔ گھر کے کچے صحن میں اس کے جناتی پاؤں کے چکنے نشانات ثبت ہو گئے جنہیں ازاں بعد جیواں اور فرزانہ نے جوفاطیل نامی جن کے قدموں کے نشانات تسلیم کر لیا۔ وہ دونوں پیر لوٹے شاہ کی عقیدت میں بصیرت سے پیدل ہو چکی تھیں لہٰذا انہوں نے اپنے مرشد کی پیش گوئی کو من و عن درست تسلیم کر لیا۔

میں نے پھوری کو دوبارہ حوالات کی طرف روانہ کر دیا۔ قاتل کی حیثیت سے اس کا نام اگرچہ معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم میں اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ابھی اس سے بہت سا حساب باقی کرنا تھا۔

آئندہ روز میں زمان خان کو لے کر پھر اس مہم پر روانہ ہو گیا۔ پہلے ہم جیواں کے گاؤں پہنچے۔ ارادہ یہی تھا کہ معلوم کیا جائے، اس کی بیٹی فرزانہ چک چونتیس سے لوٹی ہے یا نہیں۔ پیر لوٹے شاہ کے قتل کے معاملات کو فرزانہ کی مدد اور تعاون کے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ چک چونتیس کا رخ کرنے سے قبل فرزانہ کے گاؤں میں جھانک لینا ضروری تھا۔

جیواں کے گھر سے پتا چلا، فرزانہ ہنوز اپنے چاچے غفار علی کے پاس تھی۔ ہم اس گاؤں سے نکل کر چک چونتیس کی جانب بڑھ گئے۔ اے ایس آئی زمان نے ایک صحت مند اور چاق و چوبند گھوڑے والے تانگے کا بندوبست کر لیا تھا جس کا کوچوان بھی خاصا تندرست اور زندہ دل تھا۔

ہم گاؤں سے باہر نکلے ہی تھے کہ سامنے سے چوہدری فیروز دین گھوڑے پر سوار آتا نظر آیا۔ اس کے ساتھ دو خدمت گار نما مصاحب بھی تھے۔ آمنا سامنا ہونے پر ہماری علیک سلیک ہوئی۔ رسمی باتوں کے بعد چوہدری نے پوچھا۔

"تھانے دار صاحب! کیا آپ شاہ جی کے قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"اگر میں نے یہ کارنامہ انجام دے لیا ہوتا تو یقیناً آپ بے خبر نہ ہوتے۔" میں نے بھی مبہم سا جواب دیا۔ "پھر آپ کو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔"

وہ میری اس چوٹ کو خندہ پیشانی سے سہہ گیا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ

خوامخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ شاہ جی کو جوفاطیل نے قتل کیا ہے۔ آپ اسے تو گرفتار نہیں کر سکتے البتہ یہ ہو سکتا ہے، اسی کوشش میں آپ کسی بے گناہ کو بلی چڑھا دیں گے۔ کوئی نہ کوئی کارروائی تو ڈالنا ہے ناں۔"

چوہدری کے اس طنز نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "چوہدری صاحب! آپ دیکھ لینا، میں بہت جلد لوٹے شاہ کے قاتل کو منظر عام پر لے آؤں گا۔ اس سلسلے میں میں کامیابی کے بہت قریب ہوں۔ انشاء اللہ چند روز میں آپ کے کان یہ خوشخبری سنیں گے۔"

"مجھے پتا چلا ہے، آپ نے شاہ جی کے خادم پھوری کو تھانے میں بند کر رکھا ہے۔ خدا کا خوف کریں تھانے دار صاحب!" اس نے مجھے عجیب سی نظر سے دیکھا۔ "ایسی بابرکت ہستیوں کے ساتھ یہ سلوک آپ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔"

"میں اپنا نقصان بخوبی سمجھتا ہوں۔ چوہدری جی۔" میں نے جواباً اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھوری کتنا بابرکت اور پہنچا ہوا ہے، یہ راز بھی کھل چکا ہے۔ میں نے اسے خوامخواہ بند نہیں کر رکھا۔ وہ کیا، لوٹے شاہ کے قتل کی تفتیش کے لیے میں ایسے درجن بھر مشتبہ افراد کو بھی حراست میں لے سکتا ہو اور وہ بھی بلا تخصیص اعلیٰ و ادنیٰ! اس پکڑ دھکڑ میں کمی کمین اور جاگیردار میں کوئی تمیز نہیں کی جائے گی۔"

چوہدری فیروز دین معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے کوچوان کو تانگا آگے بڑھانے کا حکم دیا اور ہم چوہدری کو وہیں چھوڑ کر چک چونتیس کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوہدری فیروز دین کے ساتھ میں نے خاصی ترش و تلخ مکالمت کر ڈالی تھی اور مجھے اس بات کی مطلق پروا نہیں تھی کہ وہ میری ان باتوں کا کیا اثر کرے گا۔ فرض کی ادائیگی سب سے اہم اور مقدم تھی، باقی باتیں فروعی حیثیت کی حامل تھیں۔

غفار علی زمیں دار کا گھر تلاش کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ وہ چک چونتیس کا ایک معروف شخص تھا۔ غفار سے رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے فرزانہ کو طلب کر لیا۔ غفار علی ہماری آمد سے خاصا الجھ گیا تھا لیکن ظاہر ہے، قانون کی مخالفت اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے تعاون پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ وہاں ہماری آمد کا مقصد کیا تھا۔ وہ فرزانہ کے لیے خاصی تشویش میں مبتلا تھا تاہم اس نے میری ہدایت کے مطابق فرزانہ کو "انٹرویو" کے لیے میرے پاس بھیج دیا۔

فرزانہ کی عمر اٹھارہ اور بیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور جوانی سے بھرپور لڑکی تھی۔ میں نے گھما پھرا کر اس سے درجنوں سوالات کیے جن میں جوفاطیل، چوتھی نوچندی جمعرات، مغرب کے بعد آستانے پر جانا، جوفاطیل کے قدموں کے نشانات اور پیر لوٹے شاہ کا قتل سب کچھ شامل تھا۔ وہ بہت دائیں بائیں کرتی رہی تاہم میری تھانے دارانہ تفتیش کے سامنے

وہ زیادہ ٹھہر نہ سکی۔ جب میں نے اسے دروغ گوئی کے سنگین ترین نتائج کی دھمکی دی تو وہ تعاون کے لیے آمادہ ہو گئی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے اسے ڈرانے کے لیے کہا تھا کہ میں نے جائے وقوعہ اور آلہ قتل پر سے فنگر پرنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ اب میں اس کی انگلیوں کے نشانات لوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ وہ میری اس دھمکی سے ڈر گئی اور اس نے چوتھی نوچندی جمعرات کو لوٹے شاہ کے آستانے پر جانے کا اقرار کر لیا۔ یہ اقرار گویا اس کا اقبال جرم تھا۔ پیر لوٹے شاہ کو فرزانہ ہی نے قتل کیا تھا۔

اقرار جرم کے بعد فرزانہ نے روہانسے الفاظ میں مجھے جو ستم گر روداد سنائی، میں یہاں اس کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں۔ تاکہ پڑھنے اور سننے والے ہوشیار ہو جائیں۔ یہ ایک داستان عبرت ہے اور سبق آموز کہانی بھی جو لوٹے شاہ جیسے معاشری ناسوروں کی نقاب کشائی کرتی ہے۔

❁❁❁

جیواں اپنی بیٹی فرزانہ کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے طفیل کے کرنا چاہتی تھی مگر طفیل اپنے کرتوتوں کے طفیل فرزانہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ اپنے چچا کے بیٹے ایوب کو پسند کرتی تھی۔ اس نے اس رشتے کے خلاف کمزور سا احتجاج بھی کیا مگر بات نہ بن سکی۔ مایوسی اور دل شکستگی اسے پیر لوٹے شاہ کے آستانے پر لے گئی۔ اس نے سن رکھا تھا، لوٹے شاہ بہت پہنچا ہوا عامل ہے۔ پہلی مرتبہ وہ اکیلی ہی شاہ جنات کے پاس گئی۔ لوٹے شاہ نے اس کا مسئلہ سنا اور کہا تم بے فکر ہو جاؤ۔ ہمارے عمل سے تمہاری بگڑی بن جائے گی لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارے مشوروں پر عمل کرنا ہوگا۔

فرزانہ نے لوٹے شاہ کی بات ماننے کا وعدہ کیا اور پوچھا کہ اس کے عمل سے وہ اپنے من کی مراد پا لے گی ناں؟ لوٹے شاہ نے اسے یقین دلایا کہ طفیل اس سے شادی کرنے سے منع کر دے گا۔ طفیل کی ماں خود یہ رشتہ توڑ دے گی۔ بعد میں ایوب سے اس کی شادی ہو جائے گی۔ اس یقین دہانی کے بعد لوٹے شاہ نے فرزانہ پر واضح کر دیا کہ اسے کس قسم کا تعاون کرنا ہوگا۔ اس نے فرزانہ کو ایک ناٹک کرنے کی ہدایات دیں۔ پہلے ایکٹ کے طور پر اس نے لوٹے شاہ کی ہدایات پر گھر میں ہنگامہ کر دیا۔ وہ اس طرح ظاہر کر رہی تھی کہ جیسے اسے دورہ پڑ گیا ہو۔ گاؤں میں ایک ہی "سیانا" تھا۔ جیواں نے لوٹے شاہ سے رابطہ کیا اور قبلہ شاہ صاحب نے حساب کتاب جوڑ کر اعلان فرما دیا، لڑکی پر ایک خبیث جن عاشق ہو گیا ہے۔ پھر لوٹے شاہ علاج کے نام پر فرزانہ کو ایک نشہ آور محلول پلانے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ اس محلول اور دورے کے ناٹک پر عادی ہو گئی۔ اس جنونی کیفیت کے دوران میں فرزانہ نے طفیل کی ماں کو بھی دھکا دے کر دیوار سے ٹکرا دیا تھا جس کے نتیجے میں وہ لوگ اس رشتے سے دستبردار ہو گئے۔ فرزانہ خوش تھی کہ لوٹے شاہ نے ایک چال چلی اور فرزانہ سے کہا کہ اس دوران میں جوفاطیل نامی ایک جن واقعی اس پر

فریفتہ ہو چکا ہے اور اگر اب اس نے کسی سے شادی کرنے کی کوشش کی تو وہ خبیث جن اس کے ہونے والے شوہر کو ختم کر دے گا۔

فرزانہ نشہ آور محلول پی پی کر دیوانگی کا ناٹک کر کر کے ذہنی اور جسمانی طور پر خاصی کمزور ہو چکی تھی پھر وہ لوٹے شاہ کو ایک طاقت ور عامل بھی تسلیم کر چکی تھی اس لیے اس کی بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے گھبرائے انداز میں لوٹے شاہ سے پوچھا، اب اس جن سے کس طرح نجات ملے گی؟ ہم دلائیں گے تمہیں نجات۔ لوٹے شاہ نے پورے یقین سے کہا اور بتایا کہ اس کے لیے فرزانہ کو چار نوچندی جمعرات کو ایک خاص عمل کے لیے اس کے آستانے پر آنا ہو گا لیکن وہ چوتھی نوچندی جمعرات کے بارے میں اپنی ماں یا کسی بھی شخص کو کچھ نہ بتائے گی۔ لوٹے شاہ بھی جیواں سے تین ہی جمعرات کا ذکر کرے گا۔ فرزانہ نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا کہ چوتھی جمعرات کو کیا ہو گا؟ لوٹے شاہ نے گمبھیر انداز میں بتایا، پہلی نوچندی جمعرات کو ہم ایک مخصوص عمل سے تمہارا جن اتاریں گے۔ اس کے بعد تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی لیکن اس کے بعد بھی یہ خدشہ موجود رہے گا کہ جوفاطیل تم پر دوبارہ سوار ہو جائے۔ تم ہو ہی اتنی حسین اور بھرپور کہ کوئی بھی جن و بشر تم پر فریفتہ ہو سکتا ہے یقین جانو فرزانہ، ہم نے اپنی پوری زندگی میں تم جیسی پرکشش اور جاذب نظر لڑکی نہیں دیکھی حالانکہ ہم نے جنت کی حوروں کا کشفی نظارہ بھی کیا ہے مگر تمہاری بات ہی کچھ دوسری ہے۔ تمہارے اندر قدرت نے حسن و جوانی کوٹ کوٹ کر بھر رکھی ہے۔ یہ کم بخت جوفاطیل تم پر ایسے ہی تو عاشق نہیں ہو گیا۔ فرزانہ اس جن اور لوٹے شاہ کی باتوں سے پہلے ہی بہت پریشان تھی اس نے لوٹے شاہ سے کہا کہ جیسے بھی ہو، وہ اسے جوفاطیل سے مکمل چھٹکارا دلا دے۔

لوٹے شاہ نے اپنی مکاری کی انتہا کو پہنچتے ہوئے فرزانہ کو تسلی دی اور کہا کہ چوتھی نوچندی جمعرات کو وہ جوفاطیل کو اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اس موقع پر فرزانہ کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے کیونکہ جوفاطیل کو حصار کے اندر بلانے کے لیے فرزانہ کا چارا ہی موثر ہو گا۔ اس عمل کے دوران میں فرزانہ کو لوٹے شاہ کے پاس رہنا ہو گا۔ فرزانہ لوٹے شاہ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہو گئی۔ تین نوچندی جمعرات تک اسے اپنی ماں کے ساتھ آستانے پر آنا جانا تھا اور چوتھی جمعرات کو کسی کے علم میں لائے بغیر چپ چپاتے وہاں پہنچنا تھا۔ لوٹے شاہ نے اسے کہہ کر مزید ڈرا دیا کہ اگر اس نے اس راز میں کسی کو شریک کیا تو جوفاطیل اس کے ساتھ ساتھ شریک راز کو بھی ختم کر دے گا۔

پہلی دو نوچندی جمعرات تک عام سا عمل ہوتا رہا مگر تیسری جمعرات کو فرزانہ کے ساتھ جو واقعات پیش آئے، ازاں بعد وہ ان کے بارے میں سوچ کر بکھر گئی۔ اس روز لوٹے شاہ نے عمل سے پہلے اسے اچھی خاصی مقدار میں نشہ آور محلول پلا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش و حواس سے

بیگانہ ہو گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے، فرش پر کھینچے ہوئے حصار میں خود کو برہنہ پڑے ہوئے پایا۔ اس کے نزدیک ہی لوٹے شاہ اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد فرزانہ کو یہ اندازہ لگانے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ دوران غفلت میں وہ اپنی کون سی متاع عزیز لٹا بیٹھی تھی۔ اس نے اس سلسلے میں جب لوٹے شاہ سے استفسار کیا تو اس نے مختلف دقیق اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں سے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں لوٹے شاہ کا کوئی دوش نہیں۔ یہ سب کچھ ضروری تھا۔ اس کے بغیر جوفاطیل کو قابو نہیں کیا جا سکتا۔

اس رات وہ اپنی ماں کے ساتھ آستانے سے گھر واپس تو آ گئی لیکن ساری رات وہ اس شرمناک واقعے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس وقت فرزانہ کا ذہن ہر قسم کے آسیبی اثرات سے آزاد تھا۔ شاید اپنی زندگی کا قیمتی ترین سرمایہ لٹانے کے بعد اسے ہوش آ گیا تھا۔ ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد اس نے ہونٹوں کو سی لیا۔ اپنی ماں سمیت کسی بھی شخص کو اس نے اس سانحے کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ اس لیے نہیں کہ لوٹے شاہ نے اسے ایسی ہدایات دے رکھی تھیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس پیر فرتوت، سیاہ کرتوت، شیطان صفت شخص سے انتقام لینا چاہتی تھی، بھیانک اور خاموش انتقام...... جس کی صدا کسی انسان کی سماعت تک، نہ پہنچ سکے اور یہ دنیا آئندہ کے لیے لوٹے شاہ کے شر سے بھی محفوظ ہو جائے۔

اس نے نہایت ہی صبر و تحمل کے ساتھ آئندہ نوچندی جمعرات کا انتظار کیا اور خاموشی کے ساتھ لوٹے شاہ کے آستانے پر پہنچ گئی۔ لوٹے شاہ نے اس رات عمل شروع کرنے سے پہلے نشہ آور محلول میں اچھی خاصی مقدار اپنے معدے میں بھی انڈیلی۔ شاید وہ ترنگ میں آ کر کوئی بڑا کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ فرزانہ کی طرف سے کامل اطمینان حاصل کر چکا تھا۔ گزشتہ نوچندی جمعرات والے واقعے کے بعد بھی اگر وہ اس کے بلانے پر تن تنہا اس کی خلوت گاہ تک چلی آئی تھی تو لوٹے شاہ کے نزدیک اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ فرزانہ کو اس "کھیل" پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر فرزانہ تو اس رات اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچی تھی۔ جوفاطیل کو کیلنے والی کہانی سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔ لوٹے شاہ کئی افراد کو بتا چکا تھا کہ اس عمل میں ناکامیابی کے بعد جن اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔

جن کو کیلنے کا عمل شروع ہوا تو فرزانہ لوٹے شاہ پر قابو حاصل کرنے کے لیے اس کی چھوٹی موٹی ابتدائی فرمائشوں کو مانتی چلی گئی۔ انہی فرمائشوں میں بے لباس ہونا بھی شامل تھا۔ لوٹے شاہ اپنی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ پنک میں بہت زیادہ نشہ چڑھا گیا۔ اس سلسلے میں فرزانہ نے بھی اس کی مدد کی البتہ خود اس نے ایک بوند بھی حلق میں نہ اتاری اور جب اس نے دیکھا کہ لوٹے شاہ اعصابی اور مدافعاتی طور پر خاصا کمزور ہو چکا ہے تو اس نے اچانک اس پر قابو پا کر، حصار کے کنارے پڑا ہوا خنجر اٹھا کر اس کے سینے میں اتار دیا۔ اس عمل کے لیے اسے جس

’’جواں مردی‘‘ کا مظاہرہ کرنا پڑا ہوگا اس کی تحریک کے لیے جذبہ نفرت ہی کافی تھا۔ وہ انتقا آگ میں پورا ایک مہینہ جل جل کر کندن بن چکی تھی لہٰذا اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر کے لیے اسے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اپنے جرم کے اعتراف کے بعد فرزانہ نے دونوں کلائیاں میری جانب بڑھائیں اور ہوئی آواز میں بولی۔ ’’میں نے اپنے سینے میں روشن انتقام کی آگ کو لوٹے شاہ کے ناپاک سے ٹھنڈا کر لیا۔ اب آپ اپنا فرض پورا کر لیں۔ میں گرفتاری کے عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالوں گی۔‘‘

میں یک ٹک اس کی گوری چٹی بانہوں کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ وہ نسوانی بازو تھے جنہوں نے کی مردانگی سے زیادہ بڑا کام کر دکھایا تھا۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ بعض نازک معاملات یہ نازک اندام جنس فولاد سے زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ عورت کو کمزور سمجھنے والے غلط فہمی کا شکار اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو خود اپنی طاقت کا اندازہ نہیں۔

محبت سے کہیں زیادہ طاقت ور جذبہ نفرت کا ہوتا ہے کیونکہ...... نفرت کرنے کے لیے چیز کا خیال نہیں رکھنا پڑتا۔ انتقام کی آگ ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔ عورت کو اگر اپنی ضد قوت کا اندازہ ہو جائے تو وہ اینٹ پر کھڑی ہو کر ماؤنٹ ایورسٹ سے ٹکرانے سے بھی دریغ نہ کرے گی۔

میں فرزانہ کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ میں اس کے جرم کو بہر حال نظر انداز نہیں کر تھا۔ اس نے ایک معاشرتی ناسور کو تلف کر کے اگرچہ بہتوں کا انتقام لے لیا تھا۔ تاہم اس اس کی مجرمانہ حیثیت میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کافی سوچ بچار کے بعد اس کے ایک سزا کا تعین کیا لیکن اپنے فیصلے سے میں آپ کو آگاہ نہیں کروں گا۔ قارئین سے درخوا ہے کہ وہ اپنی ذہانت کو ثابت کرنے کے لیے میرے فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

ڈاکا زن

ڈاکوؤں کے مسلح گروہ نے تھانے پر حملہ کر دیا۔ اتفاق سے اس رات میں تھانے میں موجود نہیں تھا۔ میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں دوسرے شہر گیا ہوا تھا، اگلی صبح میں واپس آیا تو پتا چلا، پاسا پلٹ چکا ہے۔

ڈاکوؤں اور گروہی مجرموں کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے، ان کا کوئی اہم آدمی اگر پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ کوئی موقع نکال کر اسے چھڑانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، یہ اسی ذیل کی ایک مجرمانہ کارروائی تھی پچھلے چند روز سے میں نے ایک ڈاکو کو حوالات میں بند کر رکھا تھا، تفتیش آخری مرحلے میں تھی اور ایک آدھ روز بعد میں اسے عدالت کے حوالے کرنے والا تھا کہ یہ ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا۔ حملہ آور ڈاکوؤں کو میری غیر موجودگی میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ اپنے سردار سلطان کو حوالات سے نکال لے جانے میں کامیاب رہے البتہ ان کا ایک ساتھی پولیس کی مزاحمت کی نذر ہو گیا، گویا ایک عام ڈاکو کی جان کا نذرانہ پیش کر کے وہ اپنے سردار سلطان کو چھڑا لے گئے۔

مجھے تھانے میں قدم رکھتے ہی ان حالات کا علم ہوا تو میں نے اپنے نائب کو کمرے میں بلا لیا، وہ ایک انسپکٹر تھا۔

’’شمشاد علی!‘‘ میں نے غصیلے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔ ’’میں تو تھانا تم پر چھوڑ کر گیا تھا پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟‘‘

’’سر! ہم نے مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کی۔‘‘ وہ ندامت آمیز آواز میں بولا ’’اور دوطرفہ فائرنگ کے نتیجے میں ڈاکوؤں کا ایک ساتھی مارا گیا اور......‘‘

’’میں نے اس ڈاکو کی لاش کا اچار نہیں ڈالنا۔‘‘ میں نے ایس آئی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ’’وہ لوگ زیر حراست اپنے سردار کو چھڑا لے گئے سب سے اہم اور افسوس ناک بات یہی ہے۔‘‘

ایس آئی نے شرمندگی سے گردن جھکا دی۔

میں اس واقعے سے بہت اپ سیٹ ہوا تھا، سلطان ڈاکو کو زیر دام لانے کے لیے میں نے کتنے پاپڑ بیلے تھے یہ میں ہی جانتا تھا اور اب جب کہ میں اسے ایک بھرپور چالان کے ساتھ قانون کے حوالے کرنے والا تھا تو اس کے ساتھی اسے تھانے کی حوالات سے نکال کر لے گئے

تھے یہ ایک نا قابل تلافی نقصان تھا۔

''یہ افسوس ناک واقعہ کتنے بجے پیش آیا؟'' میں نے ایس آئی سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔'' لگ بھگ صبح چار بجے۔''

اس زمانے میں آج کی طرح تھانوں میں اتنا زیادہ عملہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ مذکورہ تھانے میں میرے علاوہ سب انسپکٹر شمشاد علی، اے ایس آئی ممتاز خان، حوالدار اور چار پانچ کانسٹیبلز تھے۔ اس نفری کے حساب سے میں نے شمشاد علی سے پوچھا۔

''حملہ آور ڈاکوؤں کی تعداد کیا تھی؟''

''نصف درجن سے زیادہ تھے۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''ایک ڈاکو فائرنگ کے دوران مارا گیا اور وہ لوگ سلطان کو حوالات سے نکال کر لے گئے۔''

میں نے نہایت برہمی سے کہا۔''ان کی تعداد پوری رہی ہم سراسر گھاٹے میں رہے۔''

''سر ہم کوشش کر رہے ہیں۔'' سب انسپکٹر نے مجھے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔''جلد ہی ان ڈاکوؤں کا سراغ مل جائے گا۔''

میں نے سخت لہجے میں سوال کیا۔''اب تک تم لوگوں نے کیا کوشش کی ہے؟''

''میں نے کھوجی کو تھانہ بلوا کر کام پر لگا دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

وزیر علی نامی وہ کھوجی اپنے کام کا ماہر اور تجربہ کار شخص تھا۔ بعض معاملات میں اس نے نا قابل یقین حد تک قانون کی مدد کی تھی میں اس کے ریکارڈ سے اچھی طرح واقف تھا اور اس کے کارناموں کی قدر کرتا تھا۔

میں نے سب انسپکٹر سے دریافت کیا۔''کیا صرف ایک کھوجی پر انحصار کیا جا سکتا ہے؟''

''ہم نے ڈاکوؤں کے فرار ہوتے ہی ان کا تعاقب بھی کیا تھا۔''

''جو کہ ناکامیاب رہا!'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''جناب! وہ سب کے سب چاق و چوبند گھوڑوں پر سوار تھے۔'' ایس آئی نے کہا۔''ہمارے دو جوانوں نے ان کا پیچھا کیا کیوں کہ ہمارے پاس اس وقت یہی دو گھوڑے تھے اور ان گھوڑوں کی صحت بھی آپ سے ڈھکی چھپی نہیں۔''

بات ختم کر کے وہ دوبارہ خاموش ہو گیا۔ میں نے زیادہ گرجنا برسنا مناسب نہ سمجھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے اور یہ واردات صبح چار بجے پیش آئی تھی گویا ان گزرے ہوئے سات گھنٹوں میں وہ ڈاکو کہیں کے کہیں نکل گئے ہوں گے اور عین ممکن تھا وہ کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکے ہوں۔

تھانے پہنچتے ہی جب مجھے ڈاکوؤں کی اس کارروائی کی اطلاع ملی تو میں نے سب سے پہلے جا کر حوالات کا معائنہ کیا تھا اور حوالدار سے سوالات بھی کیے تھے، اپنے عملے کے بیانات سے یہ

نتیجہ اخذ ہوا کہ ڈاکوؤں نے آناً فاناً گن پوائنٹ پر وہ کارروائی کی تھی۔ تھانے کے عملے نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تاہم بدقسمتی سے کامیابی حملہ آوروں کے حصے میں آئی، سانپ نکل چکا تھا اس لیے فی الحال رسی پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنے عملے سے تفصیلی سوال و جواب بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔ پہلی فرصت میں مجھے ڈاکوؤں تک پہنچنا تھا یہ بہت ہی افسوس ناک سبکی والا معاملہ تھا۔ اگر اس رات میں تھانے میں موجود ہوتا تو شاید یہ واقعہ پیش نہ آتا یا اس انداز میں پیش نہ آتا۔ میں اپنی اور اپنے عملے کی جان داؤ پر لگا کر حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کرتا، بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔

میں نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔''کھوجی کو کب روانہ کیا ہے تم نے؟''

''صبح آٹھ بجے۔'' اس نے بتایا۔''اس کے ساتھ اے ایس آئی نوازش اور کانسٹیبل نثار بھی ہیں، موسم اچھا ہے مجھے امید ہے کہ اچھے اور مفید نتائج برآمد ہوں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے کہا اور سب انسپکٹر کو اپنے کمرے سے رخصت کر دیا۔

وہ فروری کا مہینہ تھا اور سردی ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی، دن تو معتدل رہتا لیکن شام ہوتے ہی خنکی شروع ہو جاتی اور رات کو بھی خاصی ٹھنڈ ہو جاتی۔ میں حالیہ واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ سلطان ڈاکو نے آس پاس کے علاقے میں بہت افراتفری مچا رکھی تھی میں کم و بیش ایک سال سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اسی کوشش کے نتیجے میں وہ چند روز پہلے میرے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اگر میں سلطان ڈاکو اور اس کے ''کارناموں'' کی تفصیل میں چلا گیا تو کئی کہانیوں کے دروازے کھل جائیں گے اور ان راستوں میں اصل داستان کہیں کھو کر رہ جائے گی......وہ داستان جس کا انتخاب اس ماہ کے لیے کیا گیا ہے اگر پھر کبھی موقع ملا تو سلطان ڈاکو پر ایک مفصل کہانی لکھوں گا، فی الحال وہ ایک ایسا خطرناک مجرم تھا جو میرے قابو میں آنے کے بعد ہاتھ سے نکل چکا تھا، زخمی سانپ اور چھوٹا ہوا مجرم نہایت ہی خوفناک ہو جاتے ہیں اور مجھے اسی خطرناک ڈاکو کو دوبارہ گرفت میں لانا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد اطلاع ملی کہ کھوجی وزیر علی واپس آ گیا ہے۔ میں نے اسے فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا، اے ایس آئی نوازش اور کانسٹیبل نثار اس کے ساتھ تھے۔ لہٰذا میں نے انہیں بھی طلب کر لیا، کھوجی نے جو رپورٹ پیش کی اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

گھڑ سوار ڈاکوؤں کا کھرا نکالنے میں کھوجی کی خاطر خواہ کامیاب حاصل ہوئی تھی میرے تھانے کی مشرقی جانب لگ بھگ ایک میل کے فاصلے پر جنگل شروع ہو جاتا تھا، کھوجی کے مطابق مسلح گھڑ سوار اسی جنگل کی سمت فرار ہوئے تھے اس نے فرار ہونے والے گھوڑوں کی تعداد چھ بتائی۔ گھڑ سواروں کی تعداد کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ چھ بھی ہو سکتے تھے اور بارہ بھی بہرحال سب انسپکٹر کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا وہ چھ آئے تھے اور چھ ہی واپس

گئے۔ یعنی ایک گھوڑے پر ایک۔ خیر کھوجی کی فراہم کردہ اطلاع کافی سنسنی خیز تھی کہ وہ ڈاکو جنگل کی طرف فرار ہوئے تھے۔ میں نے چند روز قبل ایک زبردست معرکے کے بعد اس جنگل سے سلطان کو گرفتار کیا تھا، ایک طرح سے اسے ڈاکوؤں کی انتقامی کارروائی بھی کہا جا سکتا تھا۔ کھوجی کے دوسرے انکشاف نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"ملک صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ڈاکوؤں کے فرار کا راستہ تو میں نے واضح کر دیا لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ تھانے پر چڑھائی کرنے کہیں اور سے آئے تھے۔"

"کیا مطلب...... کہیں اور سے آئے تھے؟" میں واقعی حیران رہ گیا۔ "اگر وہ جنگل میں گھسے ہیں تو آئے بھی ادھر ہی سے ہوں گے میں تو اگلے مرحلے پر اس جنگل میں انہیں تلاش کرنے والا ہوں، تمہاری مدد سے۔"

وہ تعاون آمیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جناب میں آپ کی ہر قسم کی مدد کو تیار ہوں، ڈاکوؤں کا کھرا جہاں تک لے جائے گا میں آپ کی رہنمائی کروں گا لیکن میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ وہ لوگ مغربی سمت سے سفر کر کے اس تھانے پہنچے تھے۔"

تھانے کی مغربی جانب بستی تھی جو ایک فرلانگ تک پھیلی ہوئی تھی، کھوجی کی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا، بظاہر یہ ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا میں نے وزیر علی سے استفسار کیا۔

"کہیں ڈاکوؤں کا کھرا اٹھانے میں تم سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی!"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ "میں نے بڑی مشکل صورتحال میں کھرا نکالا ہے، وہ ڈاکو جو اپنے گھوڑوں کے سموں پر کپڑا یا پلاسٹک باندھ کر سفر کرتے ہیں میں نے ان کا بھی سراغ لگایا ہے، میں اس قسم کی غلطی نہیں کر سکتا۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس معاملے میں تو سب کچھ صاف صاف ہے ڈاکوؤں کے قدموں اور گھوڑوں کے سموں کے نشان بستی سے لے کر تھانے تک اور تھانے سے جنگل تک بالکل واضح نظر آ رہے ہیں میرا حساب کتاب غلط نہیں ہو سکتا۔"

جن دو پولیس اہلکاروں نے گھوڑوں پر ڈاکوؤں کا تعاقب کیا، میں ان سے تفصیلی بات چیت کر چکا تھا، ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ مسلح گھڑ سوار ڈاکو جنگل کی طرف جانے والے راستے پر غائب ہو گئے تھے ان کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ مزید تعاقب جاری نہ رکھ سکے مجبوراً انہیں واپس لوٹنا پڑا۔ اس مجبوری میں غیر اطمینان بخش صحت والے گھوڑوں کے ساتھ ساتھ گھڑ سوار ڈاکوؤں کی فائرنگ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ پولیس کے جوانوں کے پاس روایتی اسلحہ تھا، جب کہ ڈاکوؤں کے پاس جدید (اس زمانے کے لحاظ سے) رائفلیں تھیں، پھر وہ تعداد میں بھی غالب اکثریت میں تھے۔ اس نوعیت کی صورتحال میں اسلحے سے زیادہ حکمت عملی کام آتی ہے اگر میں تھانے میں موجود ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

وزیر علی کی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ وہ ڈاکو بستی کی جانب سے سفر کر کے تھانے تک پہنچے تھے میں نے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ لوگ بستی سے آئے تھے؟"

"سولہ آنے یقین ہے سرکار" وہ اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ کو میری بات پر اعتبار نہ ہو تو اپنے بندوں سے پوچھ لیں۔" اس نے کانسٹیبل نثار اور اے ایس آئی نوازش کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دونوں میرے ساتھ تھے، آپ کا حکم ہو تو میں جنگل میں بھی آگے تک ان کا کھرا نکالوں گا۔"

"وہ تو تمہیں کرنا ہی ہو گا، میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھا رہوں گا۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "بستی کی سمت پایا جانے والا کھرا کہاں جا کر ختم ہوتا ہے؟"

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ مجھے یہ معلوم ہو سکے، آیا وہ ڈاکو اسی بستی سے آئے تھے یا پھر کہیں اور سے آئے تھے اور بستی کے نزدیک سے ان کا صرف گزر ہوا تھا، کھوجی وزیر علی کے بجائے اے ایس آئی نوازش نے کہا، اس کا لہجہ خاصا انکشاف انگیز تھا۔

"ملک صاحب! کھوجی نے جو کھرا نکالا ہے وہ خوشیا کے گھر پر جا کر ختم ہوتا ہے"

"یہ خوشیا کون ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

اے ایس آئی نے بتایا۔ "ایک بوڑھا شخص ہے جو اپنی بیوی اور جوان بیٹی کے ساتھ بستی کے ایک گھر میں رہتا ہے، یہ گھر بستی کے آخری کنارے پر آبادی سے ذرا ہٹ کر واقع ہے۔"

یہ خاصی اہم اور سنسنی خیز اطلاع تھی، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں نے خوشیا کے گھر میں کچھ وقت گزارا تھا، میں نے مزید معلومات کی خاطر دریافت کیا۔

"آپ لوگوں نے خوشیا سے کسی قسم کی کوئی پوچھ گچھ کی ہے؟"

اے ایس آئی نے جواب دیا۔ "ملک صاحب! ابھی تک ہم نے خوشیا سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم آپ کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ نے صبح آنے کو کہا تھا۔"

میں جس کام سے دوسرے شہر گیا تھا اگر اس میں کچھ پیچیدگی پیدا نہ ہو جاتی تو میں صبح ہی اپنے تھانے پہنچ چکا ہوتا، بہرحال میں ایس پی علاقہ کے حکم پر وہ کام نمٹانے گیا تھا اس لیے اسے ادھورا چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتا تھا میں دوبارہ کھوجی وزیر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"وزیر علی! تمہارا کہنا ہے وہ ڈاکو خوشیا کے گھر سے سفر کر کے تھانے پہنچے اور یہاں کی حوالات میں سے اپنے سردار کو چھڑا کر جنگل کی طرف فرار ہو گئے، کیا تم نے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ خوشیا کے گھر کب اور کہاں سے آئے تھے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "فی الحال اس سلسلے میں، میں نے کوئی کوشش نہیں کی، آپ کا حکم ہو تو میں اپنے تجربے کو کام میں لا کر کم از کم یہ ضرور پتا چلا لوں گا کہ وہ کس سمت سے سفر کر کے خوشیا کے گھر پہنچے تھے، اگر انہیں وہاں آئے زیادہ وقت نہیں گزرا تو ان کا کھرا

سلامت ہوگا۔“

اے ایس آئی نے وضاحت آمیز انداز میں کہا۔ ”ملک صاحب! بستی ہمارے تھانے سے مغربی جانب واقع ہے بستی کے ختم ہوتے ہی کھیتوں کا سلسلہ ہےاور اس کے بعد بڑی نہر، نہر کی دوسری سمت بھی کھیت ہی کھیت ہیں۔ آج کل کھیتوں میں فصل بھی کھڑی ہے، اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ ڈاکو اسی طرف سے آئے تھے تو کھیتوں میں ان کا کھرا اٹھانا خاصا مشکل کام ہوگا۔“

”مشکل اور آسان تو بعد میں دیکھا جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ضروری کارروائی فوراً ہونا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ کا جو حکم ہو۔“ اے ایس آئی نوازش فرماں برادری سے بولا۔ میں نے نوازش کو اپنے کمرے میں روک کر دوسرے افراد کو باہر جانے کا حکم دیا، کھوجی سے میں نے برآمدے میں ٹھہرنے کو کہہ دیا۔ جب میں اور ایس آئی کمرے میں رہ گئے تو میں نے اس سے کہا۔

”نوازش علی! تم فوری طور پر ایس پی آفس روانہ ہو جاؤ، اس واقع کی اطلاع وہاں تک پہنچنا ضروری ہے۔ میں تمہیں ایس پی صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا اس نے کسی قسم کا کوئی سوال کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میں اگر چاہتا تو صورتحال کی وضاحت کے لیے خود بھی ایس پی صاحب سے ملنے جا سکتا تھا لیکن تھانے میں میری موجودگی اس قدر ضروری ہوگئی تھی کہ میں نے اے ایس آئی کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ رقعے میں، میں نے سلطان ڈاکو کے بارے میں تفصیلاً درج کر دیا، ایس پی صاحب اس بات سے آگاہ تھے کہ وہ خطرناک ڈاکو عدالتی ریمانڈ پر میری تحویل میں تھا۔ میں نے ایس پی سے یہ درخواست بھی کی کہ میرے تھانے کو مزید نفری مہیا کی جائے تا کہ ڈاکوؤں کی تلاش کے لیے چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دی جا سکیں، پہلے میں نے سلطان کو جنگل میں اس کے ایک خفیہ ٹھکانے سے گرفتار کیا تھا اس مشن میں افرادی قوت سے زیادہ میری حکمت عملی کا دخل تھا مگر اب ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ اس مرتبہ سلطان اور اس کے ساتھی ڈاکو اس جنگل میں کہیں پناہ نہیں لیں گے اور بالفرض اگر انہوں نے جنگل ہی میں کہیں روپوشی اختیار کی تو ان کی وہ پناہ گاہ میرے لیے خاصی مشکل ثابت ہوگی۔ جنگل اچھا خاصا گھنا اور وسیع وعریض تھا، ڈاکوؤں کی تلاش میں اس کے مختلف حصوں میں چھاپے مارنے کی ضرورت تھی...... اور نہایت ہی پلاننگ کے ساتھ، ویسے اس بات کے قوی امکانات تھے کہ وہ لوگ کسی اور طرف نکل گئے ہوں یا وقتی طور پر انہوں نے اس جنگل کو خیر باد کہہ دیا ہوتا کہ پولیس کی کارروائی سے محفوظ رہ سکیں۔

اے ایس آئی کے روانہ ہونے کے بعد میں نے ڈاکو کی لاش کو سرکاری اسپتال بھیجنے کا بندوبست کیا لاش کا تفصیلی معائنہ میں پہلے ہی کر چکا تھا، اس پر زیادہ مغز ماری کی ضرورت نہیں تھی۔

لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے میں نے کھوجی کو اپنے ساتھ لیا اور خوشیا کے گھر کی جانب چل پڑا۔ ایس آئی شمشاد کا تھانے میں رہنا ضروری تھا چنانچہ حوالدار فرزند علی اور ایک کانسٹیبل کو میں نے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ رسول نگر نامی وہ بستی تھانے سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی اور خوشیا کا گھر بستی کے آخری کنارے پر ذرا ہٹ کر واقع تھا، تھوڑی دیر بعد ہم اس کے دروازے پر کھڑے تھے میں اور حوالدار یونیفارم میں تھے۔ جب کہ کھوجی نے پاپلین کا کرتہ اور تہ بند زیب تن کر رکھا تھا سر پر اس کی مخصوص پگڑی بھی نظر آ رہی تھی، وزیر علی کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی وہ اس عمر میں بھی عینک کے بغیر تلاوت کلام پاک کر سکتا تھا اور دور دیکھنے کے لیے بھی اسے آنکھوں کو چندھا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

دستک کے جواب میں ایک بوڑھی عورت نے دروازہ کھولنے سے پہلے سوال کیا۔ ”کون ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میں خوشیا سے ملنے آیا ہوں، کیا وہ گھر پر ہے؟“

اندر چند لمحے خاموشی رہی ”کون ہے؟“ پوچھنے والی کی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کوئی بوڑھی عورت ہوگی ورنہ ابھی تک کوئی میرے سامنے نہیں آیا تھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ عورت کسی سے مشورہ کر رہی ہے میری سماعت تک کچھ اس قسم کی آوازیں پہنچیں جیسے دروازے کے پیچھے کھسر پھسر کی جا رہی ہے، میں سمجھ گیا، دروازہ کھولنے میں پس و پیش سے کام لیا جا رہا تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا کوئی گڑبڑ ہے۔

میں نے دوبارہ دستک دی اور بہ آواز بلند کہا۔ ”خوشیا! دروازہ کھولو میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں، میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانا انچارج ہوں۔“

اندر ایک دم سناٹا چھا گیا، چند لمحات بعد دروازے کی کنڈی گری اور نیم وا دروازے میں ایک ادھیڑ عمر عورت کی صورت نظر آئی اور اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تھانے دار صاحب! آپ کو خوشیا سے کیا کام ہے؟“

اس عورت کی صورت اور آواز سے بڑھاپا جھلکتا تھا، بہرحال میں نے اس تضاد کو فی الحال نظر انداز کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”خوشیا سے مجھے جو کام ہے وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا، تم اسے باہر بھیجو۔“ ایک لمحے کو توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ”تم غالباً خوشیا کی بیوی ہو!“

میرا اندازہ درست ثابت ہوا، اس نے بتایا۔ ”جی! میں خوشیا کی بیوی بخت بھری ہوں، خوشیا کو رات سے بخار ہے وہ اندر سویا پڑا ہے۔“

مجھے اس کے بیان پر یقین نہ آیا، اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے بند دروازے کے پیچھے کھسر پھسر کی جو آوازیں سنی تھیں وہ کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے دروازہ کھولنے سے قبل تم نے کسی سے صلاح مشورہ کیا تھا وہ کون تھا؟ کیا وہ تمہاری بیٹی ہے؟ تم تینوں کے سوا اس گھر میں اور تو کوئی نہیں رہتا!''

وہ میرے ان سوالیہ جملوں سے گھبرا گئی، گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''نن...... نہیں جی ...... میں نے کسی سے صلاح مشورہ نہیں کیا۔''

میں سمجھ گیا وہ واضح طور پر جھوٹ بول رہی تھی آنکھیں اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے گھور کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر خوشیا کو بخار ہے، وہ باہر نہیں آسکتا تو کیا ہوا، تم دروازہ کھولو میں اندر جا کر اس سے مل لیتا ہوں، یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔''

وہ میرے تیور بھانپ گئی کہ میں کسی بھی صورت ٹلنے والا نہیں ہوں، کھوجی وزیر علی نے بڑے وثوق سے مجھے بتایا تھا کہ ڈاکوؤں کا کھرا اسی گھر سے تھانے تک پہنچا ہے اور پھر تھانے سے وہ جنگل کی طرف گئے ہیں، میں خوشیا اور خوشیا کے گھر کو کسی بھی صورت نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔

خوشیا کی بیوی کو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا اور ہم گھر کے اندر پہنچ گئے، وہ ایک کشادہ صحن والا گھر تھا جس کے پچھلے حصے میں تین چار کچے کمرے بنے ہوئے تھے۔ اونچی چھتوں والے یہ کمرے ہر قسم کے موسم کے لیے موزوں تھے یعنی گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں گرم۔ کشادہ صحن میں آم، جامن، امرود اور نیم کے درخت بھی استادہ نظر آئے چند مویشی بھی اپنی موجودگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ کنڈلی بنائی گئی تھی جس میں بیک وقت درجن بھر جانور چارا کھا سکتے تھے۔

کھوجی نے صحن عبور کرتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''ملک صاحب! میں اس صحن کو بھی چیک کرنا چاہتا ہوں، اگر ڈاکوؤں نے اپنے گھوڑوں کے ساتھ یہاں کچھ وقت گزارا ہے تو اس کے آثار مل جائیں گے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم کانسٹیبل کو ساتھ رکھو اور اپنے کام میں مصروف ہو جاؤ، میں حوالدار کے ساتھ خوشیا کی طرف جاتا ہوں، دیکھوں تو وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے!''

خوشا کی بیوی ہماری ان سرگوشیوں سے خاصی متوحش ہوئی تاہم اس نے مجھ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کی، بخت بھری نے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا جہاں ایک بوڑھا شخص چارپائی پر لیٹا تھا وہ یقیناً خوشیا ہی تھا۔

ہمیں دیکھ کر خوشیا نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے لیٹا رہنے کا اشارہ کر دیا، بخت بھری نے ہمارے لیے دوسری چارپائی پر ایک اجلی چادر بچھا دی اور جلدی سے بولی۔

''میں آپ کے لیے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرتی ہوں۔''

''اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''ہم سب کچھ کھا پی کر آئے ہیں تم تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلی جاؤ، میں تنہائی میں خوشیا سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ خاصی جزبز نظر آئی تاہم تھوڑے سے تامل کے بعد وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے حوالدار فرزند علی سے کہا۔ ''تم اس پر نظر رکھو جب تک میں اپنے کام سے فارغ نہیں ہو جاتا، اس گھر کے کسی مکین کو باہر نہیں جانا چاہیے اور نہ ہی باہر سے کوئی اندر آئے...... بیرونی دروازے کی نگرانی بہت ضروری ہے اگر کوئی خاص بات نوٹ کرو تو فوراً مجھے اطلاع دو۔''

''اوکے سر!'' حوالدار نے مستعد لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آخر معاملہ کیا ہے تھانے دار صاحب؟'' خوشیا مریل سی آواز میں مستفسر ہوا۔

میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا، اس دوران میں وہ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا تھا اس کی ظاہری حالت اس بات کی تصدیق کرتی تھی کہ وہ اس وقت بخار میں مبتلا تھا خوشیا کی عمر پینسٹھ کے قریب تھی اور اس کا پورا سر سفید ہو چکا تھا، میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''خوشیا! معاملے کے بارے میں تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔''

وہ اپنے سر کو تھام کر بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں جناب! میرا تو سر پہلے ہی قابو نہیں، کچھ چکر سا آ رہا ہے۔''

''اگر تم اداکاری سے باز نہ آئے تو مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔'' اچانک میرا لہجہ بے حد سنگین ہو گیا۔ ''اور تمہیں اتنا معلوم ہوگا پولیس والوں کا دوسرا راستہ کتنا بھیانک اور پرخار ہوتا ہے اپنی بوڑھی ہڈیوں پر رحم کھاؤ۔''

وہ گھگھیایا ''جناب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں میں نے آپ سے کوئی جھوٹ بولا ہے نہ ہی کسی قسم کی اداکاری کر رہا ہوں، اللہ پاک جانتا ہے میں پچھلی رات سے بخار میں تپ رہا ہوں اس وقت بھی میرا جسم جہنم بنا ہوا ہے اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو چھو کر دیکھ لیں، آپ کو میری بات کی سچائی کا پتا چل جائے گا۔''

''ہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تم بخار میں مبتلا ہو اس کے لیے چھونے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''اگر تیز بخار ہے تو سر میں درد ہوگا اور چکر بھی آسکتے ہیں۔''

میرے جواب سے اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی جلدی سے بولا۔ ''جناب! جب آپ یہ

سب مان رہے ہیں تو پھر آپ کو میری بات پر اعتبار کیوں نہیں، آپ یقین جانیں میں کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہا۔"

میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری اداکاری سے میری مراد یہ ہے کہ تم بے خبری کا ناٹک کر رہے ہو، تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون سا معاملہ مجھے کھینچ کر تمہارے دروازے تک لے آیا ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

میں بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور میرے سوال نے اس کی آنکھوں میں وحشت نمودار کر دیا تھا، اس کے چہرے کا ہر حصہ خوف کی لپیٹ میں نظر آ رہا تھا تاہم خوشیا کی زبان نے حتیٰ الامکان ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا، اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا۔

"مم...... میں...... ابھی تک...... سمجھ نہیں سکا ہوں کہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں......؟"

میں نے کہا۔ "خوشیا! میں تمہارے ساتھ "بوجھو تو جانیں" کھیلنے نہیں آیا لگتا ہے شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" اچانک میرا لہجہ سنگین ہو گیا۔ "اگر تم اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ حوالات کی ہوا کھانے کا شوق رکھتے ہو تو تمہاری مرضی ہے تھانے میں تو بے زبان بھی بولنے لگتے ہیں، لگتا ہے تمہارے ساتھ دوسرے راستے پر سفر کرنا پڑے گا۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا، آنکھوں میں بے پناہ وحشت بھر گئی، نحیف آواز میں منمنایا۔

"مم...... میری...... خطا کیا ہے؟"

"تمہاری خطا یہ ہے کہ تم نے پچھلی رات چھ ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔" میں نے کڑک کر کہا۔

"آپ کو غلط فہمی......"

"غلط فہمی کے بچے!" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سخت انداز میں کہا۔ "میں مکمل تسلی کیے بغیر کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتا، میں نے تمہارے پاس آنے سے پہلے اچھی طرح یقین کر لیا ہے کہ مذکورہ ڈاکو تمہارے گھر میں ٹھہرے تھے...... ایک دو پل کے لیے یا پوری رات اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بتاؤ تمہارا ان ڈاکوؤں سے کیا تعلق ہے وہ کہاں سے آئے تھے اور کدھر گئے ہیں؟"

خوشیا کا وجود کپکپانے لگا اس لرزے میں بخار سے زیادہ میرے ٹریٹمنٹ کا ہاتھ تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا، کھوجی وزیر علی میرے پاس آ گیا میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ملک صاحب!" کھوجی سنسنی خیز لہجے میں بولا "میں نے کشادہ صحن سمیت پورے گھر کو اچھی طرح چیک کر لیا ہے گھر کے ایک کمرے میں چند افراد نے کچھ وقت گزارا ہے، صحن میں کے اور ان کے گھوڑوں کے قدموں کا کھرا ابھی ملا ہے، یہ انہی گھوڑوں کے قدموں کے نشان

ہیں جو اس گھر سے نکل کر تھانے کی طرف گئے تھے۔"

"سن رہے ہو خوشیا!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ ایک ماہر اور تجربہ کار کھوجی کا تجزیہ ہے کیا تم اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہو؟"

خوشیا میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سینے پر ہاتھ رکھ کر کمزور آواز میں "ہائے ہائے" کرنے لگا میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ "اس کی بیوی اور بیٹی کو بلا کر لاؤ۔"

"جناب! اس گھر میں ایک بوڑھی عورت کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔" کانسٹیبل نے کہا "وہی عورت جس نے ہمارے لئے دروازہ کھولا تھا، بیٹی تو ہمیں کہیں نظر نہیں آئی۔"

"ٹھیک ہے تم بخت بھری کو یہاں لاؤ۔"

کانسٹیبل کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے کھوجی سے کہا۔ "کانسٹیبل واپس آئے تو تم اس کے ساتھ چلے جانا۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ ڈاکو کہاں کہاں سے گزر کر اس بستی تک پہنچے تھے۔ میں خوشیا کا انٹرویو کرتا ہوں، اگر اس نے کوئی جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو تمہاری تحقیق سے اس کو پکڑ لیں گے، جنگل کی جانب بعد میں جائیں گے اس راہ کا کھرا زیادہ دیر تک محفوظ رہے گا، جب کہ ادھر فوری طور پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ تم بستی سے آگے پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف نکل جاؤ۔"

وہ پُرمعنی انداز میں سر ہلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بخت بھری بھی کمرے میں موجود تھی وہ خوشیا کی طرف بڑھی، اسے پانی پلایا گیا، دس پندرہ منٹ بعد وہ قدرے سنبھل گیا، اس دوران میں کھوجی وزیر علی، کانسٹیبل کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔

میں نے خوشیا کا بغور جائزہ لیتے ہوئے بخت بھری سے سوال کیا۔ "تمہاری بیٹی گھر میں موجود نہیں، کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہے؟"

"جی، وہ اپنے ماموں کے گھر چن والی گئی ہوئی ہے۔" بخت بھری نے اپنے شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"چن والی" ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو میرے تھانے سے شمال کی سمت واقع تھا، بیوی کے جواب پر خوشیا نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا میں نے اس کی آنکھوں سے جھلکتی سرزنش کو واضح طور پر پڑھ لیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے بخت بھری کا جواب پسند نہ آیا ہو، خوشیا کافی حد تک سنبھل چکا تھا لہٰذا میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خوشیا! تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس فالتو وقت نہیں کہ یہاں بیٹھ کر تمہارا چہرہ تکتا رہوں، اگر تم تعاون کرنے پر آمادہ نہیں تو میں تم دونوں کو اپنے ساتھ تھانے لے جانے پر مجبور ہو جاؤں گا، بولو کیا کہتے ہو؟ ڈاکوؤں کے بارے میں بتانے کا ارادہ ہے یا پھر......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا، اس نامکمل جملے کے پیچھے ایک سنگین دھمکی پوشیدہ تھی، ڈاکوؤں کے ذکر پر بخت بھری نے چونک کر مجھے دیکھا اور خوشیا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''تت...... تو آپ ڈاکوؤں کے سلسلے میں...... یہاں آئے ہیں!''

اس کی آواز میں خوف کی آمیزش تھی پہلے میں نے اس کی غیر موجودگی میں خوشیا سے ڈاکوؤں کے حوالے سے سوالات کیے تھے جس کے نتیجے میں وہ ''ہائے ہائے'' کرنے لگا تھا۔ بخت بھری کا چونکنا اس بات کا بین ثبوت تھا کہ اس گھر میں کوئی بڑی گڑ بڑ ہوئی تھی۔ میں نے بخت بھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سلسلے تو اور بھی بہت ہیں بی بی لیکن فی الحال ڈاکوؤں کا معاملہ زیر غور ہے۔''

وہ سراسیمہ نگاہ سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی اس کی ایک نگاہ میں سینکڑوں سوال تھے۔

خوشیا نے اچانک رونا شروع کر دیا، پتا نہیں بخت بھری کی نگاہ میں ایسی کون سی بات تھی جس نے خوشیا کے آنسو نکال دیے، اس کی یہ حرکت میرے لیے خلاف توقع تھی وہ دھواں دھار انداز میں بہ آواز بلند رو رہا تھا، پہلے میں یہی سمجھا کہ اسے شاید تیز بخار کی وجہ سے کوئی دورہ وغیرہ پڑ گیا ہے۔ اونچے درجے کا بخار اگر سر کو چڑھ جائے تو انسان اسی قسم کی کیفیت میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات شدید بخار کے سبب انسان بے ہوش بھی ہو جاتا ہے، بے ہوشی کی کیفیت زیادہ خطرناک بھی ہوتی ہے اور اس سے جان جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ بہر حال خوشیا دو تین منٹ ہی میں سنبھل گیا اس نے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا اور گلوگیر آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! ہم بے قصور ہیں ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور نہ ہی ڈاکوؤں کا ساتھ دیا ہے انہوں نے ہمیں مجبور کر دیا تھا، وہ اچانک ہی ہمارے گھر میں گھس آئے تھے ہم...... ہم ان کے سامنے بے بس ہو گئے......''

بخت بھری سکتے کی سی کیفیت میں خوشیا کو دیکھ رہی تھی شاید انہوں نے ڈاکوؤں کے حوالے سے آپس میں زبان بندی کا کوئی عہد کر رکھا تھا، جب خوشیا کی زبان کے بند کھل گئے تو بخت بھری نے سوچا وہ بھی اپنے شوہر سے پیچھے کیوں رہے، اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب!'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''اگر وہ ہماری بیٹی کو رائفل کے نشانے پر نہ رکھ لیتے تو شاید ہم انہیں اپنے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے، ہم سوہنی کی وجہ سے بہت مجبور ہو گئے تھے۔''

بیٹی کے ذکر پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھوڑی دیر پہلے بخت بھری مجھے بتا چکی تھی کہ اس کی بیٹی اپنے ماموں کے گھر ''چن والی'' گئی ہوئی تھی۔ اس کا ڈاکوؤں کے حوالے سے ذکر چونکا دینے والی بات تھی میں خوشیا کو نظر انداز کر کے بخت بھری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہاری بیٹی کا نام سوہنی ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

''تمہاری کتنی بیٹیاں ہیں بخت بھری؟''

''صرف ایک ہی بیٹی ہے جناب! یہی سوہنی'' وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''اور وہ کون ہے...... جو اپنے ماموں یعنی تمہارے بھائی سے ملنے اس کے گھر ''چن والی'' گئی ہوئی ہے؟''

''آں......!'' وہ بری طرح گڑبڑا گئی ''سوہنی ہی تو چن والی......''

وہ یک لخت خاموش ہو گئی اور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے خنک لہجے میں کہا۔ ''بہت خوب بخت بھری! تمہیں اس عمر میں جھوٹ بولتے ہوئے ذرا شرم نہیں آ رہی؟ سوہنی تمہاری کس قسم کی اکلوتی بیٹی ہے جو بیک وقت دو مختلف اور دور دراز گاؤں میں پائی جا رہی ہے، یہاں رسول نگر میں ڈاکو اسے رائفل کے نشانے پر رکھ کر تم لوگوں کو تعاون کے لیے مجبور کر دیتے ہیں اور ادھر چن والی میں وہ اپنے ماموں کے گھر میں بھی موجود ہے، یہ کیسا ماروائی چکر ہے کیا تم مجھے کوئی ہمزاد والی پٹی پڑھانے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

وہ میری سخت اور چبھتی ہوئی باتیں سن کر گھبرا گئی، لکنت زدہ لہجے میں بولی۔ ''مم...... میرا مطلب یہ تھا کہ......''

''بخت بھری!'' خوشیا نے اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں سے جاؤ، میں خود تھانے دار صاحب کو ساری بات بتاتا ہوں، جب ڈاکوؤں والی بات چھپی نہیں رہی تو پھر ہم بھی کوئی جھوٹ کیوں بولیں۔'' اس نے ذرا توقف کر کے پہلو بدلا پھر خفیف آواز میں اپنی بیوی کو اپنی خاطر داری کے بارے میں کچھ ہدایت دینے لگا۔

میرے ''نہ نہ'' کرنے کے دوران میں بخت بھری کمرے سے نکل گئی، میں نے حوالدار فرزند علی کی طرف معنی خیز نظر سے دیکھا وہ میری نگاہ میں پوشیدہ اشارے کو سمجھ گیا اور اٹھ کر بخت بھری کے پیچھے ہی کمرے سے رخصت ہو گیا۔ اس نے ایک پل میں اندازہ لگا لیا تھا کہ میں بخت بھری کی نگرانی چاہتا ہوں، سلطان ڈاکو کے حوالے سے وہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ نظر آتا تھا۔

میں دوبارہ خوشیا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''ہاں بھئی خوشیا! اب تم جلدی سے شروع ہو جاؤ میں اصل کہانی سننے کے لیے بے چین ہوں۔''

وہ تھوڑی دیر تک تعاون آمیز نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر رک کر اس نے کم زور لہجے میں مجھے جو کچھ بتایا میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

خوشیا کے مطابق، گزشتہ رات وہ اپنی بیوی بخت بھری اور بیٹی سوہنی کے ساتھ گھر میں موجود تھا۔ حسب معمول انہوں نے رات کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد سونے کے لیے لیٹ گئے،

گاؤں دیہات میں لوگوں کے پاس زیادہ کام نہیں ہوتا ہر شخص کی روزمرہ مصروفیات بھی طے شدہ ہوتی ہیں جس میں موسموں کے تغیر وتبدل سے صرف اتنا فرق آتا ہے کہ ان کے جملہ کام ایک آدھ گھنٹے کی کمی بیشی سے انجام پانے لگتے ہیں، باقی سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہتا ہے۔ رات میں اور خاص طور پر موسم سرما کی رات میں لوگ بہت جلد اپنے بستر میں جا پہنچتے ہیں شہری زندگی کی آدھی رات تک اور بسا اوقات اس کے بعد بھی تادیر جاگ کر صحت کا کباڑا نہیں کیا جاتا جلدی سونا اور جلدی اٹھنا گاؤں کے ہر باسی کا معمول ہوتا ہے۔ خوشا اور اس کی بیوی بیٹی بھی رات کے پہلے پہر سونے کے لیے لیٹ گئے اور جلد ہی نیند کی پُرکیف وادی نے ان پر اپنے دروازے کر دیئے، سوہنی کی عمر اکیس بائیس کے درمیان تھی یہ بھرپور جوانی کی عمر ہوتی ہے اور گاؤں دیہات کی خالص فضا کی تازگی سے ہم آہنگ ہو کر عجیب بہار دکھاتی ہے۔ مرد ہو یا زن، اس عمر میں سب پر جوانی ٹوٹ کر برستی ہے، سوہنی اسم بامسمیٰ تھی، خوشیا اور بخت بھری ایک کمرے میں سوتے تھے۔ جب کہ سوہنی دوسرے کمرے میں، بخت بھری نے کئی مرتبہ سوہنی سے کہا کہ وہ اکیلی نہ سویا کرے لیکن وہ یہ کہہ کر ٹال جاتی کہ ابا یعنی خوشیا کی موجودگی میں والدین کے کمرے میں سونا اسے اچھا نہیں لگتا، پھر وہ یہ دلیل بھی دیتی کہ اس کا کمرا ان کے کمرے سے زیادہ دور تھوڑا ہے، درحقیقت وہ دونوں کمرے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور دونوں کی درمیانی دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا جہاں سے بہ آسانی کمرے سے نکلے بغیر ادھر اُدھر آیا جا سکتا تھا، سوہنی یہ کہہ کر ماں کو مطمئن کر دیتی کہ بیچ کا دروازہ تو کھلا ہی رہتا ہے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ فوراً انہیں مطلع کر دے گی۔

الغرض، وقوعہ کی رات وہ لوگ اپنے اپنے کمروں میں پرسکون نیند سو رہے تھے کہ رات کے کسی پہر خوشیا کی آنکھ کھل گئی، یہ ایک خلاف معمول بات تھی وہ رات کا سویا اذان فجر کے وقت ہی اٹھتا تھا اس نے دوسری چارپائی کے اوپر سوئی ہوئی بخت بھری کو جگایا، وہ اس طرح جھنجھوڑ کر اٹھائے جانے پر بوکھلا گئی۔

’’کیا ہو گیا خوشیا؟‘‘ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

خوشیا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور نیچی آواز میں بولا۔ ’’میں محسوس کر رہا ہوں، گھر میں کوئی گڑبڑ ہے!‘‘

’’کیسی گڑبڑ؟‘‘ بخت بھری نے جواباً سرگوشیانہ انداز میں پوچھا اور سوہنی کے کمرے میں کھلنے والے مشترکہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ بخت بھری ایک ماں تھی اور گڑبڑ کے حوالے سے آپوں آپ اس کا دھیان سوہنی کی طرف چلا گیا تھا۔ مذکورہ دروازہ بھڑا ہوا تھا تاہم اسے کنڈی نہیں لگائی جاتی تھی۔

خوشیا نے آواز دبا کر کہا۔ ’’میں نے تھوڑی دیر پہلے کسی دوسرے کمرے کی طرف آوازیں سنی

ہیں، شاید انہی آوازوں کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔‘‘ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ’’میں محسوس کر رہا ہوں ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ اس گھر میں موجود ہیں۔‘‘

’’تم ڈرانے والی باتیں کر رہے ہو خوشیا‘‘ بخت بھری کی آواز میں سراسیمگی تھی، اس صورت حال نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا تھا۔ ’’میں سوہنی کو جا کر دیکھتی ہوں۔‘‘ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی اور چارپائی سے نیچے اتر آئی۔

’’ٹھیک ہے تم اس کی خیریت معلوم کرو۔‘‘ خوشا نے بھی بستر چھوڑ دیا۔ ’’پھر گھر کے دوسرے حصوں میں جا کر دیکھتے ہیں۔‘‘

اگلے دو منٹ کے اندر یہ انکشاف ہو گیا کہ سوہنی اپنے کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اس صورت حال نے بوڑھے والدین کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا وہ اپنے کمرے سے صحن میں نکل آئے اور اسی وقت انہیں حیرت کا ایک شدید جھٹکا سا لگا، صحن میں نصف درجن گھوڑے دیکھ کر وہ شدید الجھن میں پڑ گئے اس وقت ایک کمرے میں سے چند افراد کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں، وہ دونوں کمان میں سے نکلے ہوئے تیروں کی مانند مذکورہ کمرے کی جانب بڑھ گئے کیونکہ سنائی دینے والی آوازوں میں سوہنی کی آواز بھی شامل تھی۔

اس کمرے کے وحشت ناک منظر نے ان کی پریشانی میں ہزار گنا اضافہ کر دیا، چھ ڈاکوؤں نے سوہنی کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا، ان ظالموں نے پتا نہیں کس طرح وہاں ایک دیا بھی روشن کر لیا تھا اس سلسلے میں انہوں نے سوہنی سے مدد لی ہو گی دیے کی ناکافی روشنی میں سوہنی کی صورت خوف و دہشت کی علامت بن کر رہ گئی تھی۔

خوشیا اور بخت بھری ڈاکوؤں کی نظر سے چھپے نہ رہ سکے اور انہیں بھی بے بس کر دیا گیا تھوڑی دیر بعد تین ڈاکو سوہنی اور بخت بھری کے پاس ہی رک گئے اور باقی تین خوشیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد دو ڈاکو دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے اور تیسرا خوشیا سے مذاکرات کرنے لگا۔

’’ہم تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔‘‘ ڈاکو نے سخت لہجے میں کہا۔ ’’شرط یہی ہے کہ تم ہمارے ساتھ تعاون کرو۔‘‘

’’تم لوگ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟‘‘ خوشیا نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

وہ بولا۔ ’’ہم دو ڈھائی گھنٹے تمہارے گھر میں گزارنا چاہتے ہیں اگر تم لوگوں نے شرافت کا ثبوت دیا تو ہم جیسے خاموشی سے آئے ہیں بالکل ویسے ہی یہاں سے رخصت بھی ہو جائیں گے لیکن کسی گڑبڑ یا تمہاری چالاکی کی صورت میں تم تینوں جان سے جاؤ گے بولو کیا ارادہ ہے؟‘‘

اس موقع پر کوئی بھی کمزور اور شریف انسان کسی خطرناک ارادے کا اظہار نہیں کر سکتا، خوشیا نے کہا۔ ’’ٹھیک ہے تم جب تک چاہو یہاں رک جاؤ، میری بیٹی اور بیوی کو کوئی تکلیف یا نقصان

نہیں پہنچنا چاہیے۔"

"ان کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔" ڈاکو نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ اپنے عمل سے وہ ان کا سرغنہ نظر آتا تھا، دوسرے پانچ اسے بہت تعظیم دے رہے تھے۔

اگلے چند لمحات میں خوشیا کو پتا چل گیا کہ وہ لوگ کس طرح گھر میں داخل ہوئے تھے اور سوہنی کو انہوں نے کیسے ٹریپ کرلیا گھر کے صحن کے اندر ہی ایک کونے میں دیہاتی ٹوائلٹ بنا ہوا تھا جس وقت وہ لوگ گھر کے صحن میں پہنچے، سوہنی ضرورت کے تحت ٹوائلٹ میں موجود تھی وہ جیسے ہی باہر آئی انہوں نے اسے گن پوائنٹ پر رکھ لیا پھر وہ اسے دھکیلتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئے تھے گھر میں داخلے کے لیے انہوں نے روایتی طریقہ اپنایا تھا یعنی ایک شخص صحن کی دیوار کود کر گھر کے صحن میں پہنچا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کے لئے داخلی دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے چھ گھوڑے اور گھڑسوار صحن میں موجود تھے داخلی دروازے کو دوبارہ بند کر دیا گیا۔

خوشیا کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کی جان اور عزت کو کوئی سنگین خطرہ لاحق نہیں تو اس کے خوف میں واضح کمی ہوگئی اس نے ڈاکوؤں کا سردار نظر آنے والے شخص سے استفسار کیا۔ "آپ لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

"""" کیا تمہیں ابھی تک ہمارے حلیوں سے کچھ اندازہ نہیں ہوا؟"

"اندازہ تو میں لگا چکا ہوں۔" خوشیا نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "تم لوگوں کے حلیے تو تمہیں ڈاکو ظاہر کر رہے ہیں میں یہ پوچھ رہا تھا، تم لوگ کہاں ڈاکا ڈالنے جا رہے ہو؟"

"اوئے بڈھے! شکل سے تو تم اتنے احمق نظر نہیں آتے۔" ڈاکوؤں کے سربراہ نے سخت لہجے میں کہا۔ "کیا ہم تمہیں بتا دیں گے کہ کہاں سے آ رہے ہیں، کہاں ڈاکا ڈالیں گے اور اس کے بعد کس طرف کا رخ کریں گے۔ کیا تم نے ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟"

ڈاکو کی ڈانٹ پھٹکار نے خوشیا کو خاموش کر دیا۔ ڈاکو کے تیور بتاتے تھے کہ اگر خوشیا نے مزید کوئی سوال کیا تو وہ آپے سے باہر ہو جائے گا...... اور ڈاکو کا آپے سے باہر ہو جانا نہایت ہی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اسے اپنی جان کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ وہ بخت بھری اور سوہنی کو کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان نازک لمحات میں وہ تینوں پوری طرح ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر تھے لہٰذا خوشیا کا چپ سادھ لینا ہی وقت کی ضرورت، مصلحت کا تقاضا اور دانش مندی کا شیوہ تھا۔

لگ بھگ دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد جب وہ ڈاکو خوشیا کے گھر سے رخصت ہونے لگے تو انہوں نے سوہنی کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنا دیا۔

"یہ تو سراسر زیادتی ہے" خوشیا چیخ اٹھا۔ "ہم نے آپ لوگوں سے ہر ممکنہ تعاون کیا ہے، آپ میری بیٹی کو چھوڑ دیں اور خاموشی سے اپنی راہ لیں۔"

خوشیا کا گھر بستی سے ذرا ہٹ کر تھا اس لیے وہاں ہونے والی کارروائی کسی کی نظر میں نہیں آ سکی تھی۔ خاموش اور ٹھنڈی ٹھار رات کے اس پہر ویسے بھی بستی کے لوگ گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہوں گے لہٰذا کسی کا خوشیا کے گھر کی جانب متوجہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

ڈاکوؤں کے سردار (یہاں سردار سے مراد وہ شخص ہے جو اس شیطانی ٹولے کو لیڈ کر رہا تھا۔ دراصل ان کا سردار تو سلطان تھا) نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اوئے بڈھے! تم نے پچھلے دو گھنٹوں میں اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ہم نے تم سے کسی قسم کی بدتمیزی کی ہے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہے کہ میری نیت صاف ہے۔ تم میری بات پر بھروسہ کر سکتے ہو۔"

وہ خوشیا کی جوان جہان بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کر رہا تھا اور ساتھ ہی یہ تلقین بھی کہ وہ ایک ڈاکو پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرے۔ اس کی منطق عجیب اور تجویز نرالی تھی۔

خوشیا نے کہا۔ "میں مانتا ہوں، تم لوگوں نے پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں میں انتہائی شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکوؤں یا جرائم پیشہ افراد سے ایسے رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اب خود کو شریف ڈاکو ثابت کرنے کے لیے تم میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ مجھے یقین آ جائے گا کہ تم ایک عظیم اور خداترس انسان ہو...... ڈاکو کا پیشہ تمہاری مجبوری ہوگی۔"

سردار دھیمے لہجے میں ہنسا اور بولا۔ "تمہاری بیٹی کو ہم ضمانت کے طور پر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ یہ میری بیٹی اور بہن کی طرح ہے۔ اگر تم نے اپنی زبان بند رکھی اور ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی غلطی نہ کی تو آج کا سورج ڈوبنے سے پہلے تمہاری بیٹی، تمہاری نظر کے سامنے ہوگی لیکن اگر تم نے کوئی ہوشیاری یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو پھر تمہاری بیٹی کی جان یا عزت کی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی۔"

"وہ میری سوہنی کو اپنے ساتھ لے گئے، تھانے دار صاحب!" داستان کے اختتام پر خوشیا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"اور تم بخار چڑھائے خاموشی سے گھر بیٹھے ہو؟" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"پھر کیا کروں...... کیا کروں میں؟" وہ پھٹ پڑا۔

میں نے کہا۔ "کم از کم اتنا تو کر سکتے تھے کہ تھانے میں آ کر اس واقعے کی رپورٹ ہی درج کروا دیتے تاکہ انہیں تلاش کرنے میں ہمیں کوئی آسانی حاصل ہو جاتی۔"

"آپ اپنی آسانیوں کی بات کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!" وہ برہمی سے بولا۔ "میری اس رپورٹ کو مخبری سمجھ کر اگر ڈاکو سوہنی کو کوئی نقصان پہنچا دیتے تو اس کا ذمے دار کون ہوتا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، اب سوہنی پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ڈاکو اپنی زبان کا پاس کریں گے؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! میں آپ کی طرح کا کوئی پڑھا لکھا اور قانون دان شخص نہیں ہوں۔ میری موٹی عقل میں جو بات آئی، میں نے اسی پر عمل کیا۔ ہم میاں بیوی نے طے کرلیا تھا کہ اس دوران میں ہم سے اگر کوئی سوہنی کے بارے میں سوال کرے گا تو ہم یہی بہانہ کریں گے کہ وہ اپنے ماموں کے گھر چن والی گئی ہوئی ہے۔ چن والی میں واقعی سوہنی کا ماموں عبدالقدیر رہتا ہے۔"

اسی دوران میں خوشیا کی بیوی بخت بھری کھانے کے لوازمات سے بھری ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ہی مجھے حوالدار فرزند علی کی صورت نظر آئی۔ میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

"اب کسی نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ تو پہلے ہی لٹے پٹے بیٹھے ہیں۔"

بخت بھری نے میری بات سے اندازہ لگا لیا کہ خوشیا نے اپنی داستان غم مجھے سنا دی تھی۔ وہ بھی ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بڑی محنت سے سامان خاطر داری تیار کر کے لائی تھی۔ لہٰذا اس کی کاوش کو نظر انداز کر دینا کفران نعمت ہوتا۔ میں اور حوالدار ٹرے میں موجود اللہ کی نعمتوں سے انصاف کرنے لگے۔

خوشیا نے ڈاکوؤں کے حوالے سے مجھے جو کہانی سنائی تھی، اس میں بہت سے پہلو تشنہ تھے خاص طور پر یہی بات کہ انہوں نے دو گھنٹے اس کے گھر میں قیام کیوں کیا تھا؟

وہ جہاں سے بھی آئے تھے، ایک بات تو طے تھی کہ وہ اپنے سردار سلطان ڈاکو کو پولیس کی تحویل سے نکالنے آئے تھے۔ وہ سیدھے تھانے کیوں نہ آگئے؟ اگر خوشیا کے گھر میں وہ دو گھنٹے ٹھہرے تو کیوں؟ کیا اس طرح وہ اپنا کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے؟

میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ ایس آئی شمشاد کے مطابق مسلح ڈاکوؤں کے ایک جتھے نے لگ بھگ چار بجے صبح تھانے پر ہلا بولا تھا۔ اس حساب سے کہا جا سکتا تھا، وہ کم و بیش دو بجے خوشیا کے گھر پہنچے ہوں گے۔ اس بات کی تصدیق کے لئے میں نے خوشیا سے پوچھا۔

"ڈاکو کتنے بجے تمہارے گھر میں داخل ہوئے تھے؟"

"صحیح وقت کا اندازہ تو مجھے نہیں جناب!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے، وہ آدھی رات کے بعد یہاں آئے تھے البتہ ان کے جانے کے بعد میں اور بخت بھری صبح تک سو نہیں سکے تھے۔ یہ واقعہ ہی ایسا تھا کہ کسی کو نیند نہیں آ سکتی تھی۔ ڈاکوؤں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد فجر کی اذان ہو گئی تھی۔"

ایک بات مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی اور وہ یہ کہ خوشیا کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد ڈاکوؤں نے تھانے کا رخ کیا تھا اور خوشیا کے بیان کے مطابق اس کی بیٹی سوہنی بھی ان کے

ساتھ تھی۔ تو کیا انہوں نے سوہنی کی معیت میں تھانے پر دھاوا بولا تھا؟ یا اس اغوا شدہ دوشیزہ کو انہوں نے کہیں راستے میں بٹھا دیا تھا۔ تھانے سے واپسی میں وہ بہت جلدی اور افراتفری میں تھے اور دو پولیس اہلکار گھوڑوں پر ان کا تعاقب بھی کر رہے تھے اور لہٰذا سوہنی کو راستے میں سے اٹھانے کے امکانات تو صفر کے برابر تھے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ سامنے آتا تھا کہ یا تو سوہنی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہی تھی یا پھر انہوں نے اسے خود سے الگ کر دیا تھا۔ ممکن ہے، ان کا کوئی ساتھی سوہنی کو اپنے ساتھ پہلے ہی جنگل کی طرف لے گیا ہو؟

اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے میں نے خوشیا سے پوچھا۔ "اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، وہ ڈاکو تعداد میں کتنے تھے؟"

اس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "جناب وہ پورے چھ افراد تھے اور ان کے پاس اسی تعداد میں گھوڑے بھی تھے۔"

خوشیا کی بات کی تصدیق جب بخت بھری نے بھی کر دی تو میں مخمصے میں پڑ گیا۔ یہ تو ڈاکوؤں کی وہی تعداد تھی جو تھانے پر حملہ آور ہوئی تھی۔ کہیں کوئی گڑبڑ تھی جو فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ڈاکوؤں نے سوہنی کو اپنے ساتھ رکھ کر تھانے والا معرکہ مارا ہوگا۔ وہ معرکہ جس میں وہ اپنے سردار کو چھڑانے کے ساتھ ساتھ اپنے ایک ساتھی کی لاش تھانے میں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے خوشیا سے اتمام حجت ضروری جانا۔ "کیا تم نے ڈاکوؤں کو باقاعدہ گنا تھا یا یونہی اندازے سے ان کی تعداد کے بارے میں بتا رہے ہو۔ ہوسکتا ہے، وہ چھ نہ ہوں۔ وہ پانچ بھی ہو سکتے ہیں اور سات بھی۔"

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب! ان کی تعداد میں کسی کی بیشی کی گنجائش نہیں۔ میں نے ان دو گھنٹوں میں کم از کم آٹھ بار انہیں گنا تھا اور ہر مرتبہ وہ چھ ہی تھے۔"

"کیا ڈاکو سوہنی کے علاوہ بھی تمہارے گھر سے کوئی شے اٹھا لے گئے ہیں؟"

"ہماری سب سے قیمتی چیز تو سوہنی ہی تھی جناب!" بخت بھری نے دکھی لہجے میں کہا۔ "جب وہ اسی کو ساتھ لے گئے تو باقی چیزوں کی ہمارے لیے کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔ سوہنی کے بغیر تو یہ گھر سونا سونا لگتا ہے۔"

وہ ایک ماں کا جذباتی جواب تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے خوشیا کو دیکھا کیونکہ ابھی تک میرا سوال جواب طلب تھا۔ وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔

"نہیں جناب! انہوں نے میرے گھر سے کوئی شے نہیں اٹھائی۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے خوشیا سے پوچھا۔ "کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو، وہ ڈاکو کہاں

سے آئے تھے؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''تمہارے خیال میں انہوں نے یہاں سے جانے کے بعد کیا کیا ہوگا؟''

''میں تو صبح سے بخار میں جل رہا ہوں جناب!'' وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے کچھ نہیں اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ سوہنی کی المناک جدائی نے مجھے قبر سے قریب کر دیا ہے۔'' پھر وہ چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کرے، وہ لوگ اپنے وعدے کی پابندی کریں اور آج شام سے پہلے میری سوہنی یہاں ہو۔''

امید اور دلاسا بہت ہی قوی جذبات ہیں جن کے سہارے بڑے سے بڑا غم کا پہاڑ بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ ڈاکوؤں کے عبوری سردار نے خوشیا کو دلاسا دیا تھا کہ اگر اس نے کسی کو ان کے بارے میں نہ بتایا تو وہ سورج غروب ہونے سے قبل اس کی بیٹی کو زندہ سلامت اس کے گھر پہنچا دیں گے۔ وہ بے چارہ اسی امید پر دن ڈھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے بخت بھری سے پوچھا۔ ''تم تو آج گھر سے باہر نکلی ہوگی۔ کیا تمہیں خبر ہے ڈاکوؤں کے جانے کے بعد اس علاقے میں کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے؟''

''جی، میں نے اڑتی اڑتی سنی ہے۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ کے تھانے میں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ کچھ لوگ ایک حوالاتی کو چھڑا کر لے گئے ہیں۔''

''وہ (کچھ لوگ) وہی چھ ڈاکو تھے جو زبردستی تمہارے گھر میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔'' میں نے بوڑھے میاں بیوی کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور جس حوالاتی کو انہوں نے تھانے سے نکالا ہے، وہ ان کا سردار تھا، سلطان ڈاکو!''

بخت بھری نے گھبراہٹ بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''یہ تو اندھیر نگری والی بات ہو گئی۔ جب ڈاکو تھانا توڑ کر اپنے بندے کو چھڑا سکتے ہیں تو پھر ہم غریب غربا کس گنتی میں آتے ہیں۔ یہاں تو کوئی بھی محفوظ نہیں۔''

خوشیا نے کہا۔ ''ڈاکوؤں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہم نے فائرنگ کی کچھ آوازیں سنی تھیں لیکن ہمیں یہ پتا نہیں تھا، آپ کے تھانے میں کوئی معرکہ ہو رہا ہے۔ بہرحال......'' اس نے اتنا کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ''اب کیا ہو سکتا ہے۔ اللہ کرے، میری بیٹی خیریت سے گھر آ جائے۔''

میں مزید آدھا گھنٹا وہاں رک کر ان دونوں میاں بیوی سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن کوئی مفید اور اہم بات معلوم نہ ہو سکی۔ خوشیا تو بخار کی وجہ سے ایک مصیبت میں مبتلا تھا اور بخت بھری اپنی سوہنی کے غم میں نڈھال۔ میں نے انہیں زیادہ پریشان کرنا ضروری نہ سمجھا اور جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

خوشیا نے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! میری آپ سے التجا ہے اگر آپ

مان لیں تو''

''ہاں کہو۔'' مجھے اس لاچار و مجبور باپ پر ترس آ گیا۔

اس نے کہا۔ ''ابھی تک یہ بات ہم نے صرف آپ کو بتائی ہے کہ سوہنی کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ شام تک یہ راز کسی کو نہ بتائیں ورنہ ہماری بڑی بدنامی ہوگی۔''

''اور شام کے بعد کیا ہوگا؟'' میں نے اس خوش گمان بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ''ڈاکوؤں نے وعدہ کیا ہے، وہ رات سے پہلے میری بیٹی کو گھر پہنچا دیں گے۔''

خوشیا کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں اسے یہ نہ کہہ سکا کہ ڈاکو اب کبھی تمہاری بیٹی کو واپس نہیں کریں گے۔ رات تک ہی کی تو بات تھی۔ اس کی امید وقت کا بے رحم تیشہ کاٹ کر رکھ دیتا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے خوشیا! میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

پھر میں نے ان دونوں کو تاکید کی کہ وہ ہماری اس کارروائی کا کسی سے کوئی ذکر نہ کریں۔ اس کے بعد میں حوالدار کے ساتھ خوشیا کے گھر سے نکل آیا۔

حوالدار نے کہا۔ ''ملک صاحب! لگتا ہے کھوجی کچھ زیادہ دور نکل گیا۔ ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی۔''

''یہ ایک اچھی اور خوش آئند بات ہے۔'' میں نے تھانے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں، وہ کوئی اہم خبر لے کر تھانے پہنچیں گے۔''

کانسٹیبل اور کھوجی وزیر علی کو میں نے ہدایت کی تھی کہ اگر انہیں اپنے کام میں زیادہ دیر لگ جائے تو پھر خوشیا کے گھر جانے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ سیدھے تھانے ہی آ جائیں۔''

حوالدار نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! کھوجی کی تاخیر سے خوش آئند بات کا کیا تعلق ہے؟''

''فرزند علی!'' میں نے حوالدار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر اب تک وہ واپس نہیں آئے تو اس کا یہی مطلب ہے، کھوجی کو ڈاکوؤں کا کوئی سراغ مل گیا۔ کھرا اس کی مدد کر رہا ہے اور وہ یہ جاننے کے لیے بہت دور نکل گئے ہیں کہ ڈاکو کس طرف سے آئے تھے۔ مجھے امید ہے، وہ کوئی خوش خبری لے کر ہی واپس آئیں گے۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ایک مرتبہ سلطان ڈاکو کا سراغ مل جائے تو پھر میں اسے بتاؤں گا کہ حوالدار فرزند علی کس مصیبت کا نام ہے۔ میں نے بھی اس کی ساری ڈاکو گیری ناک کے راستے باہر نہ نکال دی تو اپنے باپ کا نہیں۔''

فرزند علی کے لہجے میں بڑی تپش تھی۔ میں نے اس کے ادا کیے ہوئے الفاظ میں خاصی آنچ

محسوس کی اور یہ سب اس واقعے کا نتیجہ تھا جو آج صبح تھانے میں پیش آیا تھا۔ حوالات سے سلطان ڈاکو کو چھڑا کر لے جانا، فرزند علی کی بے عزتی تھی۔ اسے بے بس کر کے وہ پالا مار گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا دل و دماغ غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک فطری ردعمل تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ سلطان ڈاکو کی گرفتاری کے سلسلے میں، میں فرزند علی کو اپنے ساتھ رکھوں گا تاکہ وہ اپنے جذبات کی تسکین کر سکے۔ اس طرح اس کا غبار بھی نکل جاتا اور مجھے بھی ایک جوشیلا، خطرات میں کود پڑنے والا ساتھی میسر آ جاتا۔ مجھے امید تھی، فرزند علی اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے جان کی بازی لگا سکتا تھا۔

"تم فکر نہ کرو فرزند علی!" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "انشاء اللہ، بہت جلد سلطان ڈاکو میرے تھانے کی حوالات میں ہوگا...... یعنی ایک مرتبہ پھر تمہارے حوالے!"

"میں اس لمحے کو جلد از جلد دیکھنا چاہتا ہوں، جب ایسا ہو جائے گا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ سوچ نہیں سکتے، مجھے اپنی ناکامی پر کتنی شرمندگی ہے۔ میں سود در سود سلطان سے حساب کرنا چاہتا ہوں۔ میری آپ سے درخواست ہے، اس مشن میں آپ مجھے اپنے ساتھ رکھیں۔ میں...... میں کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے شانے پر تھپکی دی اور کہا۔ "تم ضرور کوئی کارنامہ انجام دو گے۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں قدم قدم پر اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میں سوچ بھی سکتا ہوں اور محسوس بھی کر رہا ہوں، اس وقت تمہارے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ مجھے تمہارے جذبات کا پوری طرح احساس ہے۔" پھر میں نے اس کی دل جوئی کی خاطر کہا۔ "وہ یہ تم ناکامی اور شرمندگی کی بات کر رہے ہو۔ ناکامیاب تو تم اس وقت ہوتے جب تمہیں کوشش کرنے کا موقع ملتا۔ تمہیں تو پہلے ہی مرحلے پر بے بس کر دیا گیا تھا۔ بہرحال، تمہاری ندامت یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ تم ایک غیرت مند اور خوددار شخص ہو۔ مجھے تم جیسے جوانوں پر فخر ہے فرزند علی!"

اشک شوئی اور دل جوئی سے قطع نظر فرزند علی کا ریکارڈ ایسا شفاف اور قابل فخر تھا کہ میں اس کی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ ایک وقتی ناکامی نے اسے حد درجہ دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کا ولولہ زندہ تھا اور وہ سلطان کو دوبارہ حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے جذبات قابل قدر تھے۔ اس موقع پر میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم فکر نہ کرو فرزند علی! کامیابی ہماری راہ دیکھ رہی ہے۔ ہم بہت جلد سلطان تک پہنچ جائیں گے۔ وہ زیادہ دیر تک بچ نہیں سکے گا۔ تم دیکھو گے، عنقریب وہ ڈاکو ہمارے تھانے کی فضا میں سانس لے رہا ہوگا۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ ملک صاحب!" وہ پرعزم لہجے میں بولا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے تھانے کی جانب قدم بڑھاتے رہے۔ اچانک فرزند علی نے مجھ سے پوچھا۔ "ملک صاحب، آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی نہیں لگی؟"

"کون سی بات؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

حوالدار کا سوال چونکہ سیاق و سباق سے خالی تھا اس لیے میرا چونک جانا لازمی بات تھی، اس نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میں سوہنی کی بات کر رہا ہوں جناب! اگر ڈاکو واقعی اسے ساتھ لے گئے تھے تو پھر تھانے والے معرکے میں وہ کہاں تھی؟ میں نے آپ کے سوالات سے اندازہ لگا لیا ہے کہ خوشیا کے بیان کا یہ حصہ آپ کو بھی ہضم نہیں ہوا۔"

"ہاں فرزند علی!" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "یہ معاملہ مجھے بھی الجھا رہا ہے۔ خوشیا اگر جھوٹ نہیں بول رہا تو سوہنی والا قصہ کسی معمے سے کم نہیں۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

میں نے بات کے اختتام پر گیند اسی کی کورٹ میں ڈال دی تو وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "خوشیا اور بخت بھری کی باتوں سے تو لگتا ہے، وہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے۔ ان کے غم اور حالت کو دیکھ کر یقین آ جاتا ہے کہ ڈاکو سوہنی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اب آ جا کر ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ ڈاکوؤں کی تعداد چھ سے زیادہ تھی۔ سات یا آٹھ۔" وہ ایک لمحے سانس لینے کی خاطر رکا تو مجھے محسوس ہوا وہ میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں بھی سردست اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی ساتواں یا آٹھواں ساتھی بھی تھا جو سوہنی کے ساتھ رہا ہوگا۔ خوشیا کے گھر میں وہ داخل نہیں ہوا یا ہوئے ہوں گے (دو ساتھیوں کی صورت میں)۔ بلکہ نگرانی اور حفاظت کے پیش نظر وہ باہر ہی رک گئے ہوں گے اور تھانے پر ہلا بولنے سے پہلے ہی وہ سوہنی کے ساتھ جنگل کی طرف نکل گئے ہوں گے۔

یہ سب امکانات تھے جو "ہوں گے" پر مشتمل تھے۔ فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

حوالدار بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ڈاکوؤں کا جو ساتھی سامنے نہیں آیا، یا آئے۔ ممکن ہے وہ سوہنی کے ساتھ پہلے ہی جنگل کی طرف نکل گئے ہوں۔ باقی ڈاکو اپنے سردار کو چھڑانے کے بعد اس طرف گئے ہوں گے۔"

"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن ایک بات ابھی تک واضح نہیں ہو سکی کہ ڈاکوؤں نے خوشیا کے گھر میں دو گھنٹے تک قیام کیوں کیا؟"

حوالدار نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے ابھی ابھی اس کے ذہن میں کوئی تازہ ترین خیال آیا ہو پھر وہ انکشاف انگیز لہجے میں گویا ہوا۔ "ملک صاحب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے، ڈاکوؤں کو اپنے کسی ساتھی یا ساتھیوں کا انتظار ہو اس لیے انہوں نے خوشیا کے گھر کو موزوں (انتظار گاہ) جان کر دو ڈھائی گھنٹے وہاں گزار لیے۔ میں جس ممکنہ ساتھی یا ساتھیوں کی بات کر رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ

سوہنی انہی کے ساتھ گئی ہو۔ ازاں بعد جنگل میں وہ سب آپس میں مل گئے ہوں۔'' وہ چند لمحے تک متوقف رہنے کے بعد بولا۔ ''خوشیا نے چھ ڈاکوؤں کو دیکھا اور تھانے کے عملے نے بھی حملہ آور ڈاکوؤں ہی کا دیدار کیا۔ اس لیے بھی ذہن ساتویں، آٹھویں کی طرف نہیں جا رہا۔ اگر خوشیا کی بیٹی سوہنی واقعی ڈاکوؤں کے پاس ہے تو پھر ممکنہ ساتویں، آٹھویں ڈاکو کے بارے میں اپنی سوچ میں گنجائش پیدا کرنا ہوگی۔''

حوالدار کا تجزیہ بہت جاندار اور حالات کے عین مطابق تھا۔ میں نے اس کی تائید کی اور کہا۔ ''ہمیں بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے، ایس پی صاحب، میری درخواست پر غور کرتے ہوئے ہمیں مزید نفری مہیا کر دیں گے۔ فوری طور پر ہمیں دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلوں کو خوشیا کے گھر کی نگرانی پر مامور کرنا ہوگا اور وہ بھی سادہ لباس میں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

میں نے جملہ ختم کر کے سوالیہ نگاہ سے حوالدار کو دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے، آپ نے بھی ڈاکوؤں کے وعدے والی بات پر یقین کر لیا ہے؟''

اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ بے یقینی بھی شامل تھی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مجھے ایسی سطحی سوچ رکھنے والا تھانے دار سمجھتے ہو؟''

''نہیں جناب! میں آپ کو بالکل ایسا نہیں سمجھتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اسی لیے تو مجھے حیرت ہو رہی ہے کیونکہ خوشیا کے گھر کی نگرانی سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب ڈاکو حسب وعدہ آج شام کو سوہنی کو چھوڑنے آئیں تو انہیں قابو کر لیا جائے یا ان کا تعاقب کر کے ان کے ٹھکانے کا پتا لگایا جائے۔ مجھے چونکہ یقین نہیں آ رہا اسی لیے پوچھ رہا ہوں کہ کیا آپ نے اس بات پر یقین کر لیا ہے؟''

اگرچہ حوالدار نے خاصی گھما پھرا کر بات کی تھی تاہم میں اس کا مقصد اور مطلب سمجھ گیا۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''فرزند علی! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ڈاکوؤں کے وعدے کا ایک فیصد بھی یقین نہیں لیکن واقعات کے اس پہلو کو میں سرے سے نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ ایک بات سامنے آئی ہے تو اسے اہمیت ضرور دینا چاہیے، چاہے کم ہی سہی چنانچہ......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر مزید کہا۔ ''میں ایک اور ننانوے فیصد کے حساب سے چل رہا ہوں۔ میرے نزدیک یعنی میری تفتیش کے نزدیک ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی اپنے وعدے کے مطابق سوہنی کو پہنچانے خوشیا کے گھر آئے گا...... اور ننانوے فیصد میں یہ سوچ کر دو کانسٹیبلوں کو خوشیا کے گھر کی نگرانی پر مامور کر رہا ہوں کہ ممکن ہے، اس دوران میں خوشیا یا اس کی بیوی سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو ہمارے لیے بند راہوں کو کھول دے۔'' میں نے ذرا وقفہ کر کے حوالدار

کے چہرے پر تاثرات کا جائزہ لیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آنکھیں بند کر کے خوشیا کی بات کا سو فیصد یقین نہیں کیا فرزند علی! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں پہلا سبق یہی دیا جاتا ہے کہ جو شے جیسی نظر آ رہی ہے اسے ویسا نہ سمجھا جائے۔ بلکہ اس پر شک کیا جائے کہ اس کے پیچھے کچھ اور چھپا ہوا ہے۔ بعض اوقات ہمیں اپنی ذات پر بھی شک کرنا پڑتا ہے۔''

''یہ شک تو بڑے کام کی چیز ہے ملک صاحب!'' حوالدار نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا اور کہا۔ ''ہاں...... اگر اس کا استعمال عقل مندی سے کیا جائے تو۔ ورنہ یہی شک تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ شک کو صرف پٹرول کے طور پر استعمال کرنا چاہیے، اس کو ماچس دکھاتے وقت مثبت سوچ کو ذہن میں بسائے رکھنا از حد ضروری ہے۔ یہ ٹھیک ہے، تفتیش کی گاڑی شک کے ایندھن سے آگے بڑھتی ہے لیکن منفی سوچ کے ساتھ اگر اس ایندھن کو استعمال کیا جائے تو انجن میں آگ بھی لگ سکتی ہے۔''

ہم اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے لگ بھگ دو بجے دوپہر تھانے پہنچ گئے۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا لیکن کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا سبب وہ خاطر مدارات تھا جو خوشیا کے گھر میں بخت بھری نے ہماری کی تھی۔

اسی شام کو کھوجی وزیر علی کانسٹیبل کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ تھانے پہنچتے ہی میں نے دو سادہ لباس کانسٹیبلوں کو خوشیا کے گھر کی نگرانی کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے انہیں خصوصی ہدایات بھی دی تھیں۔ وہ دونوں اہلکار میرے آزمائے ہوئے تھے۔

کھوجی کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! تمہارا چہرہ مجھے بتا رہا ہے کہ تم نے کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔''

''آپ اسے جزوی کامیابی کہہ سکتے ہیں۔'' وہ محتاط لہجے میں گویا ہوا۔ ''میں نے یہ سراغ لگا لیا ہے کہ ڈاکو کس طرف سے آئے تھے۔''

اس کا انکشاف چونکا دینے والا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کیا نتیجہ سامنے آیا ہے؟''

''جناب! ڈاکوؤں کا وہ جتھا جنگل کی طرف ہی سے آیا تھا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں اچھل پڑا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو وزیر علی؟''

''میں نے وہی کہا ہے جو میرا علم و ہنر مجھے بتا رہا ہے۔''

''لیکن جنگل تو مشرق کی جانب ہے جبکہ بستی مغربی سمت میں واقع ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں سرکار!'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''جنگل اور بستی انہی سمتوں میں واقع ہیں لیکن میں بھی غلط نہیں کہہ رہا۔ میں نے ڈاکوؤں کا کھرا اٹھانے میں کوئی کوتاہی نہیں

برتی۔"

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اپنی بات کی وضاحت کرو۔"

اس نے میرے حکم کے جواب میں بتایا۔ "جناب! بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکوؤں نے ا
خاصی ڈراما بازی سے کام لیا ہے۔ پتا نہیں، ان کی یہ احتیاط کسی وجہ سے تھی بہر حال" وہ تھوڑا
رک کر دوبارہ گویا ہوا۔ "چھ ڈاکوؤں کا وہ دستہ جنگل سے جنوب مغرب کی سمت سفر کرتے ہو
بستی تک پہنچا تھا۔ اس قوی سفر کے دوران میں وہ فرید پور کے نزدیک سے گزرے ہیں
ہمارے تھانے کے جنوب میں واقع ہے۔ اگر جنگل سے سیدھا سیدھا رسول نگر (بستی) کی جا
سفر کیا جائے تو راستہ میں ہمارا تھانا آئے گا اور یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک میل ہوگا
ڈاکوؤں نے جس گولائی میں سفر کیا ہے، اس صورت میں انہیں لگ بھگ تین میل کا فاصلہ طے
پڑا ہے۔ وہ جنگل سے رسول نگر پہنچے، پھر خوشیا کے گھر میں قیام کیا اس کے بعد تھانے پر یلغا
اور واپس جنگل کی طرف پلٹ گئے۔ کُھرا تو یہی کہانی سنا رہا ہے جناب! اگر آپ کا حکم ہو
میں صبح جنگل میں مزید کُھرا اٹھانے کے لیے آ جاؤں گا۔ رات کے وقت اندھیرے میں یہ
ممکن نہیں ہوگا۔"

کھوجی اپنی تجرباتی رپورٹ پیش کر چکا تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں اس کی فنکا
صلاحیتوں کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ کہہ رہا تھا تو پھر یقیناً ڈاکوؤں نے یہی روٹ اختیار کیا
لیکن الجھن کا باعث یہ بات تھی کہ انہوں نے یہ ناٹک کیوں رچایا؟ یہ کام وہ سیدھے سید
جنگل سے تھانے پہنچ کر بھی کر سکتے تھے۔ ایک لمبا راستہ طے کر کے وہ خوشیا کے گھر کیوں پہ
خوشیا کے گھر میں ان کا قیام میرے حلق سے نہیں اتر رہا تھا اور جب بھی اس کا خیال آتا
الجھن میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ میں تو یہ توقع کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا کُھرا، کھیتوں کی جانب جا
جس کے بعد بڑی نہر تھی۔ کھوجی کی رپورٹ تو میرے اندازے کے بالکل برعکس سامنے آئی تھی۔

میں نے سوہنی کے خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کھوجی وزیر علی سے سوال کیا۔ "تمہارا
مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن پھر بھی میں اپنی تسلی کے لیے تم سے ایک ایسا سوال کر رہا ہوں
تمہارے ہنر کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دینا۔"

وہ زیر لب مسکرایا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "مجھے آپ کے کسی مشکل سوال سے بہت
ہوگی جناب! اپنے فن اور ہنر کو جانچنے کے لیے ایسی مشکلات کا ہونا ضروری ہے ورنہ صلاح
زنگ لگ جاتا ہے۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جو
دوں گا۔"

"وزیر علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے تھانے سے جنگل
تھانے سے خوشیا کے گھر تک اور پھر خوشیا کے گھر سے دوبارہ جنگل تک ڈاکوؤں کا کُھرا نکالا

یہ بہت مشکل اور محنت طلب کام ہے اور مجھے یقین ہے، تم نے بڑی جاں فشانی سے یہ محنت کی ہے۔" میں ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کہنا یہ ہے کہ وہ مسلح ڈاکو چھ گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی تعداد کے بارے میں تم حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ خوشیا کے گھر میں تم نے چھ افراد (ڈاکوؤں) کا کُھرا پایا ہے۔ اس وقت میں تم سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آیا اس تلاش کے دوران میں کسی مرحلے پر تمہیں یہ احساس ہوا کہ گھوڑوں کی تعداد میں کمی بیشی واقع ہوئی ہے...... وہ چھ نہ رہے ہوں، سات یا آٹھ ہوں گے یا پھر گھٹ کر پانچ یا چار رہ گئے ہوں۔"

وہ چند لمحے گہری نظر سے مجھے تکتا رہا پھر پریقین لہجے میں بولا۔ "نہیں جناب! گھوڑوں کی تعداد میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ وہ اول آخر چھ ہی رہے ہیں۔ میں یہ بات پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔"

کھوجی کے اس دعوے نے مجھے بہت دور تک سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اس انکشاف کے بعد سوہنی والا معاملہ واقعی بہت ٹیڑھا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی طرح اس کہانی میں فٹ نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے اس حوالے سے وزیر علی سے سوال کیا۔

"تم نے ان راستوں میں جگہ جگہ سے جو کُھرا اٹھایا ہے اس میں سب مردوں کے قدموں ہی کے نشان تھے یا کہیں عورت کا کُھرا بھی دیکھنے میں آیا ہے؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "آپ یہ بات کس بنا پر پوچھ رہے ہیں۔ کیا ان ڈاکوؤں میں کوئی عورت بھی تھی؟"

"تمہارے جواب کے بعد میں تمہیں اصل بات بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس سوال کو اپنے لیے ایک اور امتحان سمجھ لو۔"

وہ فخر سے سینہ پھلا کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اچانک بے حد بڑھ گئی تھی۔ وزیر علی کی عمر ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ تاہم اس نے اپنی صحت کو کافی حد تک سنبھال رکھا تھا، خاص طور پر اس کے چہرے کی رعنائی ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک بہت واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ چمک تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ بھی تھی۔

"ملک صاحب!" اس نے گمبھیر آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "گھوڑوں کے سُموں کے نشانات کو تو ایک طرف رکھ دیں۔ ان کے علاوہ تمام راستوں میں جہاں جہاں بھی انسانی قدموں کا کُھرا ملا ہے اس میں عورت کے قدموں کا ایک بھی نشان نہیں پایا گیا۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا۔ "راستے سے میری مراد وہ مخصوص لائن ہے جہاں سے ڈاکوؤں کا گزر ہوا ورنہ آس پاس کی گزرگاہ پر تو مرد و زن اور بچوں، بوڑھوں ہر قسم کے لوگوں کا کُھرا یقیناً ہوگا۔ میں نے راستے کا ایک ایک چپا چیک نہیں کیا بلکہ ایک خاص سمت میں اپنے

فن کو آزمایا ہے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟''

خاموش ہو کر وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا میں واضح طور پر اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں کھرے اور سراغ کے فن سے بخوبی واقف ہوں۔ اگر نشانات کا سلسلہ چل نکلے پھر دائیں بائیں دیکھنا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح کوئی بھی کڑی ہاتھ سے چھوٹ سکتی ہے اور کھوجی گمراہ ہو کر کہیں کا کہیں نکل جائے گا۔''

''اب آپ بتائیں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کسی عورت کے کھرے کے بارے میں کیوں پوچھا تھا؟''

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اسے سوہنی والا واقعہ سنا دیا۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ واقعہ ڈاکوؤں والی کہانی سے کہیں لگا نہیں کھاتا۔ مجھے یقین ہے، سوہنی کو ڈاکوؤں نے یا تو اپنے گروہ سے الگ رکھا ہوگا یا پھر وہ سرے سے اغوا ہی نہیں ہوئی ہوگی۔''

کھوجی وزیر علی کی بات کے دوسرے حصے میں بہت زیادہ الجھن تھی۔ اگر سوہنی کو ڈاکو اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے تو پھر خوشیا کو یہ بیان دینے کی ضرورت کیا تھی۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ ڈاکوؤں نے سوہنی کو خود سے الگ رکھا ہوگا۔ اگرچہ اس امکان میں بھی قباحت کا سامان موجود تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جاتا کہ سوہنی چھ گھوڑوں والے گروہ سے الگ تھی تو پھر اس کے قدموں یا کسی ساتویں گھوڑے کے قدموں کا کھرا کیوں نہیں ملا تھا؟

یہ سوال بڑا سنسنی خیز اور غور طلب تھا اور تمام تر صورت حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا تو ذہن ایک امکانی نقطے پر آ کر ٹھہر جاتا تھا اور وہ نقطہ یہ تھا کہ عین ممکن ہے، سوہنی کو بستی سے باہر کہیں لے جایا ہی نہ گیا ہو بلکہ رسول نگر ہی کے کسی گھر میں چھپا دیا گیا ہو۔ اس امکان کو ڈاکوؤں کے وعدے سے بھی تقویت ملتی تھی۔ خوشیا کے مطابق، ڈاکو نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھی تو وہ آج کا سورج ڈوبنے سے پہلے سوہنی کو واپس اس کے گھر پہنچا دیں گے۔ یہ اسی صورت ممکن تھا کہ سوہنی رسول نگر ہی میں یا اس کے آس پاس کہیں موجود ہو۔

اس دن کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ میں نے رسول نگر پر مامور دونوں جوانوں کو سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ اندھیرا ہوتے ہی چوکنا ہو جائیں اور خوشیا کے گھر کے گرد و نواح میں چھوٹی سے چھوٹی نقل و حمل پر بھی گہری توجہ رکھیں۔ اگر انہیں کوئی غیر معمولی بات محسوس ہو تو پہلی فرصت میں مجھے اطلاع دیں۔ اگر ڈاکو اپنے وعدے کے پکے تھے تو پھر وہ سوہنی کو چھوڑنے ضرور آتے..... اور اس بات کے امکانات تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔

کھوجی وزیر علی اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا اور اس کے قائم کردہ اندازے

میرے حساب کے بہت قریب ثابت ہو رہے تھے لہٰذا اس سے سوال و جواب کا سلسلہ جاری رکھا اور کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے وزیر علی! خوشیا نے سوہنی کے حوالے سے غلط بیانی سے کام لیا ہوگا؟''

''اس قسم کی غلط بیانی کی بظاہر تو کوئی ضرورت مجھے نظر نہیں آ رہی۔'' وزیر علی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر اس نے جھوٹ بولا ہے تو اپنے لئے ایک بہت بڑی مصیبت کو دعوت دی ہے۔ جوان بیٹی کا معاملہ بہت نازک ہوتا ہے جناب۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو وزیر علی!'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کہا۔ ''پھر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ڈاکو واقعی سوہنی کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں لیکن انہوں نے فی الحال اسے بستی سے باہر نہ نکالا ہو۔ وہ اس وقت بھی رسول نگر ہی کے کسی گھر میں موجود ہو؟''

وہ کھرے لہجے میں بولا۔ ''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے جناب!'' ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''اگر ویسی ہی صورت حال ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ بستی میں ڈاکوؤں کا کوئی ساتھی موجود ہے جس کے پاس انہوں نے سوہنی کو ٹھہرایا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اگر یہی بات ہے تو بستی کی خانہ تلاشی لی جا سکتی ہے۔ اس بستی میں زیادہ سے زیادہ سو گھر ہوں گے۔ ہم بہت احتیاط سے یہ کام کر سکتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف سوہنی بازیاب ہو جائے گی بلکہ ڈاکوؤں کے کسی ہمدرد کا بھی سراغ مل جائے گا جو ہمیں ڈاکوؤں تک پہنچانے کا وسیلہ بن سکتا ہے۔''

''آپ کا کہنا ٹھیک ہے جناب! لیکن میں تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔'' کھوجی گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''سو گھروں کی خانہ تلاشی کوئی معمولی کام نہیں۔ پولیس کی یہ کارروائی چاہے کتنی بھی احتیاط سے کی جائے، اسے بستی والوں سے پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں۔ اس طرح ڈاکوؤں کا وہ متوقع ساتھی یا خیر خواہ ہوشیار ہو سکتا ہے اور ہماری بے خبری میں کوئی ایسی چال چل سکتا ہے کہ ہم سوہنی کا نشان کھو بیٹھیں۔''

میں کھوجی کے زاویے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے وزیر علی! اس کام کے لیے ہمیں مخبر سے کام لینا ہوگا۔ وہ چپ چاپ بستی میں کارروائی کرتا رہے۔ اس طرح وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ اس بستی میں کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جسے ڈاکوؤں یا جرائم پیشہ افراد سے ہمدردی ہو پھر اس شخص کے گھر کو چیک کیا جا سکتا ہے۔'' ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے مزید کہا۔ ''اس کے ساتھ ہی ہمیں بستی سے باہر جانے والے راستوں کی کڑی نگرانی بھی کروانا چاہیے تاکہ اگر سوہنی کو بستی سے کہیں اور منتقل کیا جائے تو فوراً پکڑ میں آ جائے۔ دو مستعد جوان تو پہلے ہی خوشیا کے گھر پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ میں دو تین افراد کو مزید

بڑھا دیتا ہوں۔"

"آپ کی تجویز قابل عمل اور موزوں ترین ہے۔" وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا
"مخبر اس سلسلے میں ہماری بھرپور مدد کر سکتا ہے۔ ویسے ایک بات ہے۔" وہ کچھ سوچنے وال
انداز میں چند لمحے رکا پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ سوہنی اس لہ
کے کسی گھر میں پائی جائے!"

میں نے اس خیال کی روشنی میں کہا۔ "یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خوشیا نے اپنی بیٹی کے سلسلے میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے؟" اس نے تائیدی انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے مزید کہا۔ "کیونکہ اگر سوہنی رسول نگر میں موجود نہیں تو پھر یا تو ڈاکو اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں یا پھر انہوں نے اس لڑکی کو چھ ہی نہیں کیا۔ تمہاری کھوج کے مطابق سوہنی ڈاکوؤں کے ساتھ کہیں نظر نہیں آتی اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے، خوشیا نے دانستہ غلط بیانی کی ہے...... اور جب کوئی شخص جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے تو وہ یا تو کسی جرم میں ملوث ہو چکا ہوتا ہے یا پھر کوئی جرم کرنے جا رہا ہوتا ہے۔"

"آپ کے تجزیے کے مطابق خوشیا کی ذات شکوک کی دبیز چادر میں لپٹی نظر آتی ہے۔" کھوجی نے کہا۔ "سب سے پہلے اسی شخص کو چیک کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ ساتھ سوہنی کے ماموں کو بھی چیک کروں گا جس کا نام عبدالقدیر ہے اور وہ شمالی گاؤں موضع (چن والی) میں رہتا ہے۔"

پھر میں نے وزیر علی کو بتایا کہ بخت بھری نے کس طرح پہلے بہانہ کیا تھا کہ اس کی بیٹی سوہنی اپنے ماموں سے ملنے چن والی گئی ہوئی ہے۔ کھوجی نے مخبر والے آئیڈیے پر زور دیا۔ میرے قبضے میں ان دنوں سکندر نامی ایک مخبر رہتا تھا۔ سکندر کی عمر پینتیس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک چلتا پرزہ قسم کا شخص تھا جسے مردوں کی پھاپھا کٹنی بھی کہا جاتا تھا...... سرکاری حلقوں میں، ورنہ عام لوگ تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے درمیان رہنے والا وہ سیدھا سادہ شخص پولیس کے لیے مخبری کرتا ہوگا۔ سکندر بلا کا نقال اور ایک بہترین اداکار بھی تھا۔ اس نے بعض اوقات ایسے کام بھی دکھائے تھے جو بظاہر ناممکن نظر آ رہے تھے۔ میں نے سکندر سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب میں نے کھوجی وزیر علی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس نے میری تائید کر دی۔ وہ بھی سکندر اور اس کے کارناموں سے بخوبی آگاہ تھا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب!" اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "آپ سکندر کو بلا کر فوراً کام پر لگا دیں۔ وہ بستی کے ایک ایک گھر کو سونگھ لے گا۔ انشاء اللہ، اس طرح بہتر نتائج سامنے آئیں گے اور ہو سکتا ہے، کوئی ایسا سراغ بھی مل جائے کہ ہم جلد از جلد ڈاکوؤں کے سردار سلطان تک پہنچ جائیں۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکوؤں نے سلطان کو میرے تھانے کی حوالات سے نکال کر مجھے ایک بہت بڑا چیلنج کیا ہے۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا عادی ہوں۔ سلطان کے حواریوں نے مجھے جو چرکا لگایا ہے، میں پہلی فرصت میں اس کا جواب دوں گا۔ انشاء اللہ، تم دیکھو گے وزیر علی! وہ سورما سلطان عنقریب اسی تھانے کی حوالات میں تمہیں دوبارہ نظر آئے گا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے ملک صاحب؟" کھوجی وزیر علی نے استفسار کیا۔

میں اس کے استفسار کا مطلب سمجھ گیا اور کہا۔ "تم کل صبح آٹھ بجے تک تھانے آ جاؤ پھر ہم جنگل کا رخ کریں گے۔ جہاں تک ڈاکوؤں کا کھرا ہماری رہنمائی کرے گا وہاں تک تو جائیں، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

وہ مجھے سلام کرنے کے بعد تھانے سے رخصت ہو گیا۔

کھوجی کے جاتے ہی میں نے ایک قابل اعتماد کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ضروری ہدایت کے بعد سکندر کو بلانے بھیج دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور موجودہ صورت حالات پر غور کرنے لگا۔ مجھے زیادہ امید تو نہیں تھی لیکن ذہن میں ایک خیال موجود تھا کہ ممکن ہے، خوشیا کے گھر کی نگرانی کرنے والے کانسٹیبلو میں سے کوئی اہم اطلاع کے ساتھ واپس آ جائے لیکن میری یہ موہوم سی امید بھی پوری نہ ہوئی گویا میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ڈاکوؤں نے اگر اپنا وعدہ پورا کیا ہوتا تو سوہنی اب تک اپنے گھر پہنچ چکی ہوتی۔

آٹھ بجے کے بعد میں کمرے سے اٹھ کر اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا جو تھانے ہی کے احاطے میں پچھلی طرف بنا ہوا تھا۔ نیند کا تو ابھی کوئی سوال ہی نہیں تھا، میں بستر پر لیٹ کر پیش آمدہ حالات کا جائزہ لینے لگا۔

وہ نو، سوا نو کا وقت تھا جب میرے کوارٹر کے داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بستر چھوڑا اور صحن عبور کر کے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک کانسٹیبل کھڑا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو اس نے بتایا کہ اے ایس آئی نوازش علی واپس آ گیا ہے اور اس کے ساتھ دس کانسٹیبلو آئے ہیں۔

"تم جاؤ، میں آ رہا ہوں۔" میں نے کانسٹیبل کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں مناسب تیاری کے بعد ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اے ایس آئی نے مجھے بتایا کہ ایس پی صاحب تک اس نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا اور وہ دس کانسٹیبل ایس پی صاحب نے میری معاونت کے لیے بھیجے تھے۔ گویا ایس پی صاحب کا یہ عمل تعاون کا بین ثبوت تھا۔ ایس پی صاحب کے طرز عمل سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی نوازش کو ہدایت کی کہ وہ مہمان کانسٹیبلو کے لیے منجی بسترے اور

کھانے پینے کا بندوبست کرے۔ ان سے کام تو کل صبح ہی لیا جا سکتا تھا۔

میں ابھی اپنے کمرے میں ہی بیٹھا ہوا تھا کہ مخبر سکندر وہاں پہنچ گیا۔ میں نے آئندہ آ گھنٹے تک اسے سمجھایا کہ میں نے کس مقصد کے لیے اسے تھانے بلایا تھا۔ وہ "چنگی طرح ملک صاحب!" کہتے ہوئے میرے کمرے سے رخصت ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی نوازش میرے پاس آ گیا۔ میں نے ایک فوری خیال کے اس سے کہا۔ "ٹہل قدمی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ٹہل قدمی...... اور اس وقت؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"کیوں، ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں جناب، ڈر والی کیا بات ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے لمبا سفر کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ میں نہ تو موسم سے خوف زدہ ہوں اور نہ ہی رات کی تاریکی ڈرا سکتی ہے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو پھر ٹھیک ہے، ہم گھنٹے بھر کے لیے تھانے سے باہر جا گے۔ تم تھکے ہوئے ہو تو بتا دو۔ میں کسی اور کو ساتھ لے جاتا ہوں؟"

"تھکن اپنی جگہ جناب!" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "آپ کا حکم ہے تو میں آپ ساتھ ضرور جاؤں گا۔"

"میں تمہیں اس لیے بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں کہ کل کی مصروفیات میں تمہار حصے جو کام آئے گا اس کا اس ٹہل قدمی سے گہرا تعلق ہے۔" میں نے کرسی چھوڑ دی۔

وہ مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے معتدل انداز میں پوچھا۔ "ملک صاح جانا کہاں ہے؟"

"خوشیا کے گھر!" میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

ہم دونوں جب تھانے سے باہر نکلے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ گاؤں دیہات کا ما اور فروری کا مہینا! ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔ سر شام اتر آنے والی خنکی اب اچھی خاصی میں بدل چکی تھی۔ اس موسم میں لوگ اندھیرا ہوتے ہی گھروں میں دبک جاتے ہیں، باہر ک نظر آتا۔ اس ٹھنڈی ٹھار خاموشی میں جب کہیں کسی شب بیدار کتے کے بھونکنے کی مدھم اور سی آواز ابھرتی تو رات کے سناٹے کو لمحاتی بے قراری میں مبتلا کر دیتی، اس کے بعد پھر وہی عالم!

بڑی واضح سردی ہونے کے باوجود بھی مجھے ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی، شاید یہ میری سوچ کا نتیجہ تھا۔ کہتے ہیں، خالی ذہن اور خالی معدہ شیطان کے گھر ہوتے ہیں۔ یہ کہاوت

تک درست ہے، اس کا اندازہ تو عملی تجربے سے گزرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، البتہ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ خالی ذہن اور خالی معدہ موسم سرما کی شدت کو بڑھانے کا کام ضرور کرتے ہیں یعنی موسم سرما میں سردی اور موسم گرما کی گرمی کا احساس بڑھ جائے گا لیکن اگر انسان کا ذہن اور معدہ بھرے ہوئے ہوں تو موسم کی سختی زائل ہو کر رہ جاتی ہے۔

میں نے رات میں بھرپور کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی مختلف النوعیت حالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا لہٰذا سردی میرے نزدیک نہیں پھٹک رہی تھی۔ اے ایس آئی کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صبح حوالدار فرزند علی میرے ساتھ تھا اور اس وقت اے ایس آئی نوازش علی۔ دونوں کے موڈ اور مزاج میں واضح فرق تھا۔ بہرحال، دونوں کام کے آدمی تھے۔

ہم خوشیا کے گھر پہنچ گئے۔ دستک کے جواب میں جلد ہی دروازہ کھل گیا اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں خوشیا کے کمرے میں اس کے سامنے ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میں نے خشک لہجے میں اس سے پوچھا۔

"خوشیا! گھر میں تمہاری بیٹی سوہنی نظر نہیں آ رہی۔ کیا ڈاکوؤں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا؟"

"جناب! میں تو پہلے ہی مرا ہوا ہوں، اوپر سے آپ الفاظ کے کوڑے برسا رہے ہیں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "ابھی تک تو سوہنی واپس نہیں آئی۔ پتا نہیں، ان نامرادوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

مجھے اس کی بے بسی پر ترس تو آیا لیکن میرا دل پوری طرح پسیج نہ سکا کیونکہ وہ بھی مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

"خوشیا! مجھے تو پہلے ہی امید نہیں تھی کہ تمہاری بیٹی واپس آ سکے گی۔ بہرحال، اب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ؟" اس نے چونک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اگر اب تک تم نے مجھے کوئی بات غلط بتائی ہے تو اس کا اعتراف کر لو، میں تمہیں معاف کر دوں گا۔"

"جناب! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔" وہ گھگھیایا۔

میں نے اس کی گھگھیاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "خاص طور پر مسلح ڈاکوؤں اور اپنی بیٹی سوہنی کے بارے میں تم نے جو بیان دیا ہے اس میں کوئی گڑبڑ تو موجود نہیں؟"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "نن...... نہیں جناب!"

میں اس کی لکنت کو واضح معنی نہ پہنا سکا۔ وہ ایک تھانے دار سے گفتگو کا خوف ہو سکتا تھا، حالات کی سنگینی کا اثر بھی ہو سکتا تھا اور دروغ گوئی کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ہراس بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا سالا عبدالقدیر (چن والی) میں کس جگہ رہتا ہے؟"

"آپ کو عبدالقدیر سے کیا کام ہے؟" وہ حیرت بھرے انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے لہجے کی سختی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "تم سوال نہیں کرو۔ میں جو کچھ پوچھ ہوں، اس کا جواب دو۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہو استفسار کیا۔ "خوشیا تمہاری بیٹی سوہنی کا ماموں عبدالقدیر چن والی میں کہاں رہتا ہے اور وہ کا کرتا ہے؟"

بخت بھری بھی تھوڑی دیر پہلے وہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ خوشیا کے بولنے سے پہلے اس نے م طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید آپ بھائی قدیر کے بارے میں اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ آپ شک ہے، کہیں ہم نے واقعی سوہنی کو چن والی تو نہیں بھیج دیا!"

بخت بھری نے میرے استفسار کا مطمع نظر اس لیے بھی جان لیا تھا کہ اسی کی زبانی دن مجھے پتا چلا تھا، سوہنی اپنے ماموں کے پاس چن والی گئی ہوئی ہے۔ ازاں بعد دونوں میاں بی نے اس کی تردید کی تھی اور سوہنی کو ڈاکوؤں کے ساتھ نتھی کر دیا تھا۔

میں نے بخت بھری کو گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ "میں کیا پوچھ رہا ہوں اور کیوں پوچھ ہوں اس فکر میں تمہیں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ صرف میرے سوال کا جواب دو۔ خوامخواہ اندازے قائم کر کے میرا اور اپنا وقت برباد نہ کرو۔"

ان دونوں نے جواب دینے سے قبل معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا اور بیک زبا ہو کر بولے۔ "ہم نے سوہنی اور ڈاکوؤں کے سلسلے میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"اگر بعد میں تم لوگوں کا کوئی جھوٹ میری پکڑ میں آیا تو میں تمہاری ضعیفی کی بھی پرواہ نہ کروں گا" میں نے پھنکار کر کہا۔ "تمہیں اندازہ نہیں، پولیس کی تفتیش کتنی کڑی اور پیچیدہ ہو ہے!"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر نگاہوں کا تبادلہ کیا پھر سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔

اس کے بعد، میرے استفسار پر خوشیا نے بتایا کہ عبدالقدیر چن والی میں زمیں داری ک ہے۔ ازیں علاوہ اس کے گھر کا محل وقوع بھی مجھے تفصیلاً بتا دیا۔ میں نے وہ ساری معلومات ذ نشین کر لیں اور وہاں سے اٹھنے سے پہلے بڑے واضح الفاظ میں کہا۔

"خوشیا! تم کل صبح تھانے آ کر اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ درج کروا دینا۔ اگر میں تھا میں نہ ملوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، رپورٹ تمہیں ہر حال میں لکھوانا ہو گی اور......" نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر کہا۔ "تم میری اجازت کے بغیر رسول نگر سے باہر ن بھی نہیں نکالو گے، کم از کم اس وقت تک جب تک ڈاکوؤں کی گرفتاری عمل میں نہیں آتی یا تمہاری بیٹی بازیاب نہیں ہو جاتی۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

خوشیا اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ بخت بھری نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! ایک تو ہم

ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اوپر سے ساری پابندیاں بھی ہمارے لیے۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں یہ پابندی تم لوگوں ہی کے بھلے کے لیے لگا رہا ہوں۔ ڈاکوؤں کی جانب سے آپ کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ میں تم دونوں کی حفاظت کے خیال سے اس قسم کی ہدایات دے رہا ہوں۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔ خوشیا نے پوچھا۔ "تھانے دار صاحب! آپ سوہنی کی تلاش کے سلسلے میں کیا کر رہے ہیں؟"

"بہت کچھ۔" میں نے گول مول جواب دینے پر اکتفا کیا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، تم صبح تھانے آ کر ڈاکوؤں کے خلاف، اس کے اغوا کی رپورٹ درج کروا دو۔ جب ڈاکو ہمارے ہتھے چڑھیں گے تو پھر ان کے قبضے سے سوہنی کو بھی چھڑا لیا جائے گا۔"

وہ ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلانے لگا۔

میں اے ایس آئی کے ساتھ خوشیا کے گھر سے باہر نکل آیا۔ اے ایس آئی نوازش کو میں نے اس طرف آتے ہوئے بتا دیا تھا کہ دو سادہ پوش کانسٹیبلوں کو میں نے خوشیا کی خفیہ نگرانی پر متعین کر رکھا ہے۔ وہ تھانے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"نگرانی کرنے والے کہیں نظر نہیں آ رہے!" بات ختم کرتے ہی اس نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔

میں نے اس طرف آتے ہوئے خوشیا کے گھر کے پیش و گرد کا تنقیدی جائزہ لیا تھا اور مجھے بھی وہ دونوں کانسٹیبلو کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم بھی انہیں نظر نہیں آئے ہوں گے۔ وہ دونوں میرے بارہا کے آزمائے ہوئے تھے اور مجھے یقین تھا، وہ پوری مستعدی کے ساتھ ڈیوٹی انجام دے رہے ہوں گے۔

میں نے اے ایس آئی کے سوال کے جواب میں کہا۔ "اگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تو یہ کامیاب نگرانی کی دلیل ہے۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے میرے ساتھ قدم اٹھاتا رہا پھر پوچھنے لگا۔ "ملک صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کس کی بات اور کون سی بات؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی رسان سے بولا۔ "آپ کی بات جناب! کیا آپ نے صرف یہ معلوم کرنے کے لیے ٹھنڈی ٹھار رات میں اتنا سفر کیا ہے کہ خوشیا کا سالا چن والی میں کہاں رہتا ہے؟"

اے ایس آئی کا تعجب خالی از علت نہیں تھا۔ بظاہر یہ ایسی معمولی بات تھی کہ میں کسی کانسٹیبل کو بھی خوشیا کے پاس بھیج سکتا تھا لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ میں اس بہانے خوشیا کی نگرانی کا "انتظام" خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا ہر دو صورت میں سوہنی کے ماں

باپ کے تاثرات کو نوٹ کرنا بھی اہم تھا۔ سوہنی واپس نہیں آئی تھی اور خوشیا اپنی بیوی بخت سمیت خاصا ملول اور غم زدہ دکھائی دیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کی حیرت دو چند کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے نزدیک جو بات حیثیت رکھتی ہے وہ میرے لیے بہت اہم ہے اور تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے اسی مقصد کی خاطر یہ تکلیف اٹھائی ہے۔"

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "اور سنو! تم کل صبح ہی چن والی ہو جاؤ گے اور شام سے پہلے واپس آ کر مجھے رپورٹ دو گے۔ تم نے یہ معلوم کرنا ہے کہ عبدالقدیر کے گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ کیا سمجھے؟"

اے ایس آئی نے کہا۔ "میں آپ کا مقصد اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ انشاء اللہ، میں شام یہ کام کر کے واپس آ جاؤں گا۔"

تھانے پہنچنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

آئندہ روز کھوجی وزیر علی، علی الصباح میرے پاس پہنچ گیا۔ ناشتے کے بعد ہم نے جنگل طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے پانچ مسلح کانسٹیبلز بھی ساتھ رکھ لیے۔ اس بات کے امکا تھے کہ کسی بھی مرحلے پر ڈاکوؤں سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ یہ وہی جنگل تھا جہاں سے چند روز میں نے سلطان ڈاکو کو گرفتار کیا تھا۔ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ اس مرتبہ بھی مجھے اسی مقام پر گا جہاں سے وہ پہلے میرے ہتھے چڑھا تھا۔ ٹھہرنے کی وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال، مجھے کھوجی کی راہنمائی میں آگے بڑھنا تھا۔

جنگل میں ایک میل تک تو ڈاکوؤں کا کُھرا بڑا واضح ملتا رہا اور ہم کامیابی سے آگے بڑھ رہے پھر وہ جگہ آ گئی جو پہلے کبھی سلطان کا خفیہ ٹھکانا رہی تھی۔ ہم نے کچھ دیر وہاں رکنے کا فیصلہ کیا۔ کھوجی اس مقام کا اچھی طرح جائزہ لینے لگا۔ میرے حکم پر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر تھا کہ آیا ڈاکوؤں نے وہاں کچھ وقت گزارا تھا یا آناً فاناً وہاں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اب واقعے کو چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کھوجی نے مجھے آ کر بتایا۔ "ملک صاحب! ڈاکوؤں نے اس جگہ پڑاؤ نہیں بلکہ میرا تجربہ تو یہ کہتا ہے، وہ یہاں دم بھر کو نہیں رکے۔"

میں نے تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکیڑے اور کہا۔ "وزیر علی! یہ جنگل تو میلوں تک ہوا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو بھی گیا کہ ڈاکوؤں نے یہ جنگل عبور کر لیا ہے تو پھر بھی یہ پتا نہیں سکے گا کہ وہ جنگل سے نکلنے کے بعد کس طرف گئے ہیں۔"

"ایک بات ذہن میں آ رہی ہے ملک صاحب!" کھوجی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "گیری ایک ایسا شعبہ ہے کہ ان لوگوں کا شہروں وغیرہ میں گزارا نہیں۔ میرا مطلب ہے

ٹھکانے کے طور پر یہ لوگ جنگل اور پہاڑی ہی منتخب کرتے ہیں۔ کسی بھی واردات کے بعد انہیں ایک محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ پناہ گاہ ایسی جگہوں پر میسر آ سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس علاقے میں پہاڑی سلسلہ تو ہے نہیں اور دور دور تک یہ جنگل بھی اکیلا ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو، وہ لوگ اسی جنگل میں کہیں روپوش ہیں؟"

"زیادہ امکانات اسی بات کے نظر آ رہے ہیں۔" کھوجی نے کہا۔

"ہم آگے بڑھیں گے۔" میں نے کہا۔ "نتیجہ جو بھی برآمد ہو۔"

ہمارے ساتھ جو پانچ مسلح کانسٹیبل تھے وہ ادھر ادھر بکھر کر جنگل کا جائزہ لے رہے تھے میں نے انہیں خصوصی ہدایت کی تھی کہ وہ زیادہ دور تک جانے کی کوشش نہ کریں۔ جنگل گھنا اور پُر پیچ تھا۔ اگر وہ دور نکل جاتے تو بچھڑنے کا امکان تھا۔

میں کھوجی سے باتوں میں مصروف تھا کہ ایک کانسٹیبل دوڑتا ہوا ہمارے نزدیک آیا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی تاثرات تھے۔ وہ ابھی دور ہی تھا کہ کھوجی نے کہا۔ "لگتا ہے، اس نے ادھر کوئی جن وغیرہ دیکھ لیا ہے۔ یہ خاصا گھبرایا ہوا لگ رہا ہے۔"

گھبراہٹ کے حوالے سے کھوجی کی بات بالکل درست تھی۔ کانسٹیبل واقعی خوف و ہراس میں نظر آتا تھا۔ وہ ہمارے پاس پہنچا تو استفسار کیا۔ "کیا ہو گیا عارفی! تم اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟"

عارفی کا اصل نام عارف محمود تھا۔ وہ جوان کانسٹیبل رسول نگر ہی کا رہنے والا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ "جناب! اس طرف دو آدمیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔"

"کس طرف؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

عارفی کی فراہم کردہ اطلاع اتنی سنسنی خیز تھی کہ میں فوری طور پر کچھ اور نہ پوچھ سکا۔ اس نے بتایا "اس طرف جناب" اس کے ساتھ ہی اس نے جنگل کے ایک حصے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ عارفی اسی سمت سے دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا تھا۔

ہم دونوں عارفی کی معیت میں متذکرہ حصے کی جانب بڑھ گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس مقام پر تھے جہاں دو لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ دونوں جوان تھے۔ انہیں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ عورت نہایت ہی خوبصورت اور کم عمر تھی۔ میں جھک کر لاشوں کا معائنہ کرنے لگا۔

جلد ہی ایک حیرت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس خوبصورت اور دلکش نقوش والی لڑکی کے دونوں کان جزوی طور پر کٹے ہوئے تھے۔ یہی حال اس کے ہاتھوں کا بھی تھا۔ دونوں ہاتھوں کی تین چار انگلیاں کٹی ہوئی تھیں۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھ لیا کہ لڑکی سے زیورات چھینتے وقت وہ بہیمانہ کارروائی کی گئی تھی۔ چھیننے والا یا والے بہت جلدی میں تھے اس

لیے انہوں نے کانوں اور انگلیوں میں موجود طلائی زیور کو اتروانے کی زحمت نہیں کی اور ا
کاٹ ڈالا۔ ازاں بعد ان دونوں بدنصیبوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس دوران میں باقی کانسٹیبل بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ لاشوں کا بغور جائزہ لینے پر
معلوم ہو گیا کہ کم از کم دو روز قبل ان کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا تھا۔ میں اس کارروائی
مصروف تھا کہ عارفی کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔

”یہ...... یہ تو...... زاہد اور سوہنی ہیں......؟“

ان الفاظ نے مجھے ایک جھٹکا پہنچایا۔ خاص طور پر سوہنی کے ذکر سے میں چونک اٹھا۔ م
نے عارفی سے کہا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لاش سوہنی ہی کی ہے؟“ اس کے ساتھ ہی میں
خوبصورت لڑکی کی لاش کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

”جی، مجھے سو فیصد یقین ہے۔“ وہ قطعیت سے بولا۔ ”میں رسول نگر کے بچے بچے
واقف ہوں۔ یہ وہی سوہنی ہے جسے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تھے...... خوشیا کی بیٹی سوہنی!“

”اور یہ زاہد کون ہے؟“ اس مرتبہ میں نے جوان کی لاش کی جانب انگلی اٹھائی۔

”یہ بھی رسول نگر کا رہنے والا ہے۔“ اس نے بتایا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر شک
نظر سے عارفی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تم انہیں اچھی طرح جانتے ہو تو پھر تم نے اطلاع د
وقت ان کے نام کیوں نہیں لیے۔ تم نے صرف اتنا کہا تھا...... اس طرف دو آدمیوں کی لاش
پڑی ہیں؟“

”وہ جناب!“ کانسٹیبل نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں لاشیں دیکھ کر گھبرا گیا تھا
میں فوراً آپ کو اس بارے میں بتانے کے لیے دوڑ پڑا۔ اگر میں ذرا توجہ سے لاشوں کو دیکھ
مجھے پتا چل جاتا، یہ زاہد اور سوہنی ہیں۔“

عارفی کا جواز خالی از علت نہیں تھا۔ گھبراہٹ اور خوفزدگی میں عموماً ایسا ہو جاتا ہے۔ میرا ذ
نہایت ہی تیز رفتاری سے سوہنی اور خوشیا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خوشیا کے مطابق گز
رات ڈاکو اس کی بیٹی سوہنی کو اپنے ساتھ لے گئے تھے جبکہ ان دونوں لاشوں کی حالت بتاتی تھ
از کم دو دن پہلے انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ خوشیا اور بخت بھری نے اتنا بھیانک جھو
کیوں بولا؟

یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا اور دیگر سینکڑوں سوالات کو جنم دے کر سوچ کی گہ
میں کہیں غروب ہو جاتا۔ میں نے فوری فیصلہ کر لیا کہ تھانے پہنچتے ہی میں خوشیا اور بخت بھر
خبر لوں گا۔ مجھے یہ معاملہ کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ سوہنی اور زاہد کا ایک ساتھ پایا جانا کوئی اور
کہانی سنا رہا تھا...... ان کے بیچ کسی گہرے ربط کی کہانی۔

کھوجی نے میرے کان کے نزدیک ایک سرگوشی کی۔ ”ملک صاحب! دونوں لاشیں بتا

ہیں کہ ان کی اموات کا واقعہ تازہ ترین نہیں، اس لیے انہیں ڈاکوؤں کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا
سکتا۔ اس تناظر میں تو خوشیا کا موقف بالکل ہی باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔“

”میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ بات ابھی وثوق سے نہیں
کہی جا سکتی کہ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے وہ کس کا ”کارنامہ“ ہے۔ بہرحال، ڈاکوؤں کو
سرے سے بری الذمہ بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ ڈاکو نہیں، کوئی اور سہی! یہ واردات تو کسی ڈاکو یا
راہزن ہی کا کام ہے۔“

کھوجی اثبات میں گردن ہلانے لگا۔ میں کانسٹیبل عارفی سے سوال و جواب میں مصروف ہو
گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ زاہد نامی وہ جوان رسول نگر کے ایک غریب گھر سے تعلق رکھتا تھا اور
نزدیکی شہر میں کوئی نوکری وغیرہ کرتا تھا۔ میں نے اپنے شک کی تصدیق کے لیے اس سے پوچھا
کہ آیا وہ زاہد اور سوہنی کے درمیان پھیلنے والے کسی معاملے سے واقف ہے؟ اس نے اپنی لاعلمی
کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسے ایسے کسی معاملے کی خبر نہیں۔ دیگر چاروں کانسٹیبلز سوہنی اور زاہد
کو نہیں جانتے تھے۔

دو اکڑی لاشوں کی ”دریافت“ ایسا معاملہ تھا کہ اسے نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا
تھا۔ میں نے کھوجی وزیر علی سے کہا۔

”تم تین کانسٹیبلز کو ساتھ رکھو اور ڈاکوؤں کا کھرا اٹھاتے جاؤ۔ میں لاشوں کو تھانے پہنچانے
کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”آپ کھرے کی طرف سے بے فکر ہو جائیں جناب!“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ”میں
اپنے کام کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں نے ہر قسم کے حالات میں کام کیا ہے بلکہ میں تو یہ
کہوں گا، آپ لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ یہ کانسٹیبل سارے کے سارے آپ واپس لے
جائیں۔ سرکاری وردیوں کی وجہ سے کام میں جو دقت پیش آ سکتی ہے، اس کے بھی امکانات نہیں
رہیں گے۔“

میں نے سوچا، کھوجی کی بات تو بہت ہی معقول اور منطقی تھی۔ ڈاکوؤں نے تھانے میں جو
کارروائی کی تھی اسے لگ بھگ تیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ جنگل
عبور کر کے کہیں آگے نکل گئے ہوں گے اور اگر انہوں نے جنگل ہی کے خفیہ گوشے میں پناہ لے
رکھی ہے تو کھوجی اس ٹھکانے تک با آسانی پہنچ جائے گا۔ پولیس کی موجودگی میں ڈاکو ہوشیار بھی
ہو سکتے ہیں۔ اگر کھوجی جنگل ہی میں ڈاکوؤں کے کسی خفیہ ٹھکانے کا پتا چلا لیتا تو پھر سلطان اینڈ
کمپنی کو چھاپنا قدرے آسان ہو جاتا۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے وزیر علی! میں تمہیں فری ہینڈ دے رہا ہوں۔ تم آزادی سے کام کرو
اور جیسے ہی تمہیں کوئی خوشخبری ملے، فوراً مجھے اطلاع دینا۔ میں تمہاری واپسی کا بے تابی سے انتظار

کروں گا۔"

"آپ میری طرف سے مطمئن رہیں ملک صاحب!" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "میں موسم کی سختیاں سہنے کا عادی ہو چکا ہوں، اس جنگل میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ انشاءاللہ بہت جلد میں آپ کو کوئی اہم اطلاع دوں گا۔"

اس کے بعد وہ ہم سے رخصت ہو کر آگے بڑھ گیا۔

کھوج کا کام بھی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے اور بعض اوقات تو حیرت انگیز اور ناقابل یقین واقعات دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں۔ ضلع جھنگ کے ایک تھانے میں تعیناتی کے دوران میرا ایک ماہر فن کھوجی سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک عجیب و غریب تجربہ مجھے سنایا۔ پہلے تو مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن جب حالات و واقعات اور چند افراد نے اس کی تصدیق کر دی تو مجھے تسلیم کرتے ہی بنی۔

کسی زمانے میں وہ کھوجی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں تھا۔ ایک لڑکی کی گمشدگی کے سلسلے میں اس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ بات طے تھی کہ مذکورہ لڑکی کسی کے ساتھ گئی تھی، کس کے ساتھ، یہ نا معلوم تھا اور اب اسی معلوم شخص کو ڈھونڈنا تھا۔ لڑکی کھاتے پیتے اور چوہدری گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جبکہ اسے اپنے ساتھ بھگانے والا ایک غریب کھیت مزدور تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور اسی "پسند" نے انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر اکسایا تھا۔ بہرحال، لڑکی والے ہر صورت میں ان کا سراغ لگانا چاہتے تھے چنانچہ چوہدری نے پولیس پر دباؤ ڈالا اور نتیجے میں کھوجی سے استفسار کیا گیا۔ کھوجی نے ایک حد تک ان کا کھرا نکالا پھر بے بس ہو گیا قصہ مختصر فرار ہونے والے مل نہ سکے۔

اس واقعے کے پندرہ سال بعد جب کھوجی سرگودھا میں تھا تو ایک اتفاق نے اسے اس شخص تک پہنچا دیا جس نے چوہدری کی لڑکی کو بھگایا تھا۔ سرگودھا کے ایک گاؤں میں طویل چھلانگ (LONG JUMP) کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ مذکورہ کھوجی موقع پر موجود تھا۔ مقابلے کا انتظام کھیتوں میں کیا گیا تھا جہاں سے فصل کاٹی جا چکی تھی اور ہل چلا کر کھیت کی مٹی کو ہموار اور قدرے نرم کر دیا گیا تھا۔ کبڈی کے مقابلوں کے لیے عموماً اسی طرح زمین کو تیار کیا جاتا ہے۔

لانگ جمپ کے اس مقابلے میں اس گاؤں اور دور دراز کے علاقوں سے ماہرین نے شرکت کی۔ کھوجی کودنے والوں کے قدموں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ نفسیات کا کارنامہ تھا۔ انسان زندگی کے جس بھی شعبے سے وابستہ ہو، وہ شعوری اور لاشعوری طور پر اسی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ کھوجی بھی اپنی عادت سے مجبور تھا۔

پھر وہ اچانک چونک اٹھا۔ اس مرتبہ جس ادھیڑ عمر شخص نے چھلانگ لگائی تھی اس کے قدموں کے نشانات کو دیکھ کر اس کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور وہ پندرہ سال پیچھے ماضی میں پہنچ گیا۔

کھوجی کے ذہن میں وہ کھرا روشن ہو گیا جس شخص نے چوہدری کی لڑکی کو گھر سے بھگایا تھا۔ اس سلسلے میں کھوجی کی نفسیات کے علاوہ اس کی عمدہ اور مضبوط یادداشت کا بھی غالب دخل تھا۔

بہرحال، جب وہ مقابلہ ختم ہوا تو کھوجی مذکورہ شخص کو ایک طرف لے گیا اور اسے ماضی کا ایک واقعہ یاد دلانے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا لیکن جب کھوجی نے اسے اپنے بارے میں تفصیلاً بتایا اور یہ بھی باور کرایا کہ چوہدری ابھی زندہ ہے جس کا مطلب ہے، پولیس ہنوز اس کی تلاش میں ہے تو وہ شخص منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے کھوجی سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ کو دیکھا ان دیکھا اور سنا ان سنا کر دے۔ اب تو ان کی اولاد بھی جوان ہو رہی ہے۔ اس شخص کی التجا میں کوئی ایسی بات موجود تھی کہ کھوجی کا دل پسیج گیا اس نے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ ان دونوں نے گھر سے بھاگ کر باقاعدہ شادی کی تھی اور اس وقت ان کی اولاد جوان ہو رہی تھی۔ اس موقع پر انہیں کسی آزمائشی مرحلے میں ڈالنا واقعی ان کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ ان کا جرم اتنا سنگین نہیں تھا جس کی سزا اولاد کو بھگتنا پڑتی۔

میں زاہد اور سونی کی لاشوں کے ساتھ جب تھانے پہنچا تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ فوری طور پر میں نے اپنے بندوں کو زاہد اور سونی کے لواحقین کی طرف دوڑایا۔ ان دونوں کا تعلق چونکہ ایک ہی بستی سے تھا اور کانسٹیبل عارفی بھی وہیں کا رہنے والا تھا، اس لیے میں نے اسے بھی ساتھ بھیج دیا۔

آدھے گھنٹے بعد زاہد کی ماں روتی دھوتی تھانے پہنچی۔ اسے بیٹے کے انجام کی خبر ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ بلقیس بی بی کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ وہ ایک عام سی دیہاتن تھی۔ اس وقت بہت غم زدہ نظر آ رہی تھی۔

"تھانے دار صاحب!" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ "میرے بیٹے کو کس ظالم نے مارا ہے؟"

میں ایک ماں کے جذبات کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا، وہ ماں جس کا جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا ہو۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"بلقیس بی بی! مجھے تمہارے بیٹے زاہد کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں اسے زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو میں اس کے قاتل یا قاتلوں تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "زاہد کا باپ کہاں ہے۔ تمہارے ساتھ وہ کیوں نہیں آیا؟"

"رب نواز اگر زندہ ہوتا تو وہی تھانے آتا، تھانے دار صاحب! بلقیس بی بی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "پانچ سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ زاہد کے سوا اس وقت دنیا میں میرا اور کوئی بھی نہیں تھا اور...... اب تو وہ بھی نہیں رہا۔ ہائے اللہ یہ کیسا انصاف ہے۔ ایک بوڑھی سے اس کا آخری سہارا بھی چھین لیا۔" پھر وہ دوبارہ مجھ سے پوچھنے لگی۔ "آپ ہی بتائیں، کس نامراد نے میرے زاہد کی جان لی ہے۔ وہ تو بہت ہی اچھا لڑکا تھا، کبھی کسی سے اس کا جھگڑا فساد نہیں ہوا۔"

یہ جان کر مجھے واقعی افسوس ہوا کہ زاہد اپنی بیوہ ماں کا واحد سہارا تھا۔ میں نے بلقیس بی بی کی حتیٰ الامکان دل جوئی کی اور کہا۔ ''ابھی تک یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان دونوں کو کس نے قتل کیا ہے لیکن ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ دونوں خطرناک عزائم لے کر گھر سے نکلے ہوں گے۔''

بلقیس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''کون دونوں۔ آپ زاہد کے ساتھ اور کس کا ذکر کر رہے ہیں؟''

میں سمجھ گیا، سوہنی کے بارے میں اسے ابھی کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں خوشیا کی بیٹی سوہنی کی بات کر رہا ہوں۔ تمہارے بیٹے زاہد کے ساتھ سوہنی کی لاش بھی ملی ہے۔ مگر... کے منہ میں پھینکنے سے قبل سوہنی کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے۔'' پھر میں نے اسے ... کو پیش آنے والے حالات کی متوقع تفصیل بتا دی۔

''اوہ!'' وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تو یہ کام بھی ہو گیا!''

''کون سا کام بلقیس بی بی؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

وہ ایک دم برسوں کی بیمار نظر آنے لگی۔ چند لمحے خاموش بیٹھی کمرے کی چھت کو گھورتی رہی پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا کہ اس کا بیٹا زاہد خوشیا کی بیٹی سوہنی کو پسند کرتا تھا لیکن یہ بات خوشیا کو سخت ناپسند تھی۔ بلقیس نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے دل سے سوہنی کو نکال دے۔ زاہد نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سوہنی کو بھول جائے گا اور اب...... یہ واقعہ پیش آ گیا تھا۔

''تھانے دار صاحب! میرا بیٹا سوہنی کی وجہ سے مارا گیا ہے۔'' بلقیس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''اور میرا خیال ہے، اس کارروائی میں اسی بدمعاش کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔''

''کون بدمعاش؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہی خوشیا...... اور کون!'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے سنا ہے، وہ کسی زمانے میں بہت بڑا بدمعاش رہا ہے۔ ضعیفی اور کمزوری نے اس کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے ورنہ وہ دس سال پہلے کسی کو اپنے سامنے کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ خوشیا میرے بیٹے کو سخت ناپسند کرتا تھا!''

خوشیا کے حوالے سے میرے لیے یہ ایک انکشاف ہی تھا کہ ماضی میں وہ بدمعاش بھی رہا ہے ورنہ اس کی موجودہ حالت سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ جوانی بھی عجیب شے ہے۔ اس دور میں انسان کا ایک اپنا مزاج اور رنگ ڈھنگ ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جب بڑھاپے کا آسیب بدن میں اترتا ہے تو ساری تن فن غائب ہو جاتی ہے اور انسان ... جیسی کیفیت میں پہنچ کر بے بس و لاچار ہو جاتا ہے۔

بلقیس بی بی کا انکشاف اپنی جگہ اہم سہی لیکن میں اس کی بات سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سوہنی کے ہاتھوں اور کانوں کی حالت دیکھی تھی۔ کوئی باپ گھر سے بھاگی ہوئی بیٹی کو اپنے ہاتھوں اتنے دردناک انجام سے دوچار نہیں کرتا۔ وہ یقیناً کسی راہزن یا ڈاکو لٹیرے کا کام تھا۔ زیورات حاصل کرنے کے لیے سوہنی کو بہیمانہ سلوک سے گزارا گیا ہوگا اور مزاحمت کرنے پر ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ سب امکانی باتیں تھیں۔ اصل حقیقت تو صرف دو پارٹیوں کو معلوم تھی۔ نمبر ون، زاہد اور سوہنی ...... وہ دونوں اب کسی بیان کے قابل نہیں رہے تھے۔ نمبر ٹو، قاتل...... وہ شخص یا اشخاص میری پہنچ سے فی الحال دور تھے۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھی بلقیس بی بی سے کہا۔ ''تمہارا خیال درست نہیں۔ خوشیا ان دونوں کی موت کا ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں ابھی ان کی لاشیں دکھاتا ہوں۔ یہ کارروائی کسی اور شخص کی ہے۔''

''کون ہے وہ جس نے میرے بیٹے کی جان لے لی۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''میں تو اس کے کسی دشمن کو نہیں جانتی، سوائے خوشیا کے!''

آ جا کر اس کی تان خوشیا پر ٹوٹتی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اگر خوشیا کو نہ دیکھا ہوتا تو بلقیس کی باتوں کا شاید مجھے یقین آ جاتا۔ پینسٹھ برس کا ایک نحیف و نزار بوڑھا اس قسم کی کارروائی نہیں کر سکتا اور وہ بھی اپنی سگی اکلوتی بیٹی کے ساتھ...... ایک میل جنگل کے اندر جا کر۔ ویسے خوشیا میرے نزدیک بالکل پاک صاف نہیں تھا۔ اس کی دروغ گوئی مجھ پر کھل چکی تھی۔ سوہنی اور زاہد کی لاشوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں دو تین دن پہلے قتل کیا گیا تھا جب کہ خوشیا نے مجھے بتایا تھا، گزشتہ رات سوہنی کو ڈاکو زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس کا یہ کھلا جھوٹ بلاوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ خیر، تھوڑی دیر بعد وہ بھی تھانے پہنچنے والا تھا۔ اب میں اس سے کسی رو رعایت کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس مرتبہ اسے سچ بولنا ہی پڑتا۔

میں نے بلقیس سے کہا۔ ''میرے خیال میں ان دونوں کی موت میں کسی ڈاکو یا لٹیرے کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں، وہ اس گھنے جنگل میں لینے کیا گئے تھے!''

بلقیس واویلا کرتے ہوئے ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ میں نے چند لمحات کے بعد سوال کیا، بلقیس بی بی! میں نے سنا ہے، تمہارا بیٹا زاہد شہر میں کام کرتا ہے۔ کیا وہ ان دنوں بستی آیا ہوا تھا؟''

''ان دنوں نہیں، بلکہ پچھلے دنوں وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔'' بلقیس نے بتایا۔ ''وہ پندرہ دن میں ایک مرتبہ بستی کا چکر لگاتا ہے۔ ابھی تین روز پہلے ہی تو واپس گیا تھا۔''

تین روز کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ لاشیں بھی یہی کہانی سنا رہی تھیں کہ وہ تین دن پرانی ہیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس مرتبہ بستی سے شہر کی طرف جاتے ہوئے زاہد، سوہنی کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا لیکن ان دونوں کا جنگل کی طرف جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ شہر جنگل سے بالکل مختلف سمت میں واقع تھا۔

میں نے بلقیس بی بی سے پوچھا۔ ''جب سے تمہارا بیٹا شہر گیا ہے، یعنی پچھلے تین دن س نے بستی میں سوہنی کو دیکھا ہے؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں خوشیا اور اس کے گھر والوں کی ٹوہ میں نہیں رہ میرے لیے یہی اطمینان کی بات تھی کہ زاہد میرے منع کرنے پر اپنی ضد سے باز آ گیا تھا۔''

''لیکن ان دونوں کی لاشوں کا ایک ہی مقام سے دریافت ہونا یہ کہانی سنا رہا ہے کہ تمہارا ضد سے باز نہیں آیا تھا۔'' میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے، زاہد اس بدبخت سوہنی کے ساتھ جنگل م کیا کر رہا تھا۔ میں تو یہی سمجھی تھی کہ اس نے میری بات مان کر سوہنی کو دل سے نکال دیا ہوگا۔'' ذرا دیر کو رکی پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''ویسے تھانے دار صاحب! میں پچھلے تین دن سے سوہنی کو گاؤں میں نہیں دیکھا ہے۔''

''تم نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ کہاں غائب ہے؟''

''میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی ہوں۔'' وہ سادے سے لہجے میں بولی۔ ''جس پنڈ نہیں جا اس کا راستہ کیا پوچھنا!''

میں نے پوچھا۔ ''شہر میں زاہد کیا کام کرتا تھا؟''

''وہ کپڑے کی ایک فیکٹری میں تانا ماسٹر تھا۔'' اس نے بتایا۔

ٹیکسٹائل انڈسٹری میں تانا مشین کی بہت اہمیت ہے۔ مختلف قسم کے کپڑوں کی بنائی کے ل دھاگے کو پہلے ایک خاص شکل میں لایا جاتا ہے۔ آہنی رولر پر لپٹے ہوئے اس دھاگے کو ''تانا کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے ''تانا'' بھی کہتے ہیں۔ تانا مشین چلانے والا شخص ''تانا ماس کہلاتا ہے۔ کسی بھی قسم کی بنائی کے لیے ''تانے'' اور ''پیٹے'' کی بہت اہمیت ہے۔

میں اب تک ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ سوہنی کو زاہد اپنے ساتھ جنگل کی طرف لے گیا تھا۔ ان دونوں کے بیچ پائے جانے والے تعلق کا شاخسانہ تھا۔ جنگل میں وہ افسوس ناک واقعہ ان ک ساتھ کس طرح پیش آیا اس کے بارے میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ قات میرے ہتھے چڑھ جاتا تو اس راز سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔

میں مزید تھوڑی دیر تک بلقیس بی بی سے مختلف قسم کی پوچھ گچھ کرتا رہا پھر ایک کانسٹیبل میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی۔ ''ملک صاحب! خوشیا اور بخت بھری پہنچ گئے ہیں۔''

میں نے بلقیس بی بی سے کہا۔ ''تم تھوڑی دیر کے لیے باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ میں ا سے نمٹ لوں پھر تم سے دوبارہ بات کروں گا۔''

''جناب! میرے بیٹے کی لاش......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''زاہد کی لاش تمہارے حوالے کر دی جائے گی لیکن ایک روز کے بعد۔ ابھی

دونوں لاشیں سرکاری تحویل میں رہیں گی۔ پوسٹ مارٹم کے لیے انہیں اسپتال بھیجنا ہوگا۔''

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''آپ زاہد کی لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کروائیں گے؟ اس چیر پھاڑ کی کیا ضرورت ہے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ وہ واپس تو نہیں آ سکتا؟''

میں اس کے دکھ سمجھ رہا تھا لیکن اپنے فرض سے مجبور تھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''صرف تمہارے بیٹے ہی کا نہیں بلکہ دونوں لاشوں کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔ ممکن ہے، اس کے نتیجے میں قاتل اور اس دہرے قتل پر کچھ روشنی پڑ سکے۔ قانون کے تقاضے پورے کرنے ہی میں بھلائی ہے۔''

وہ خاموشی سے اٹھی، جگر پاش نظروں سے مجھے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ میں نے کانسٹیبل کو بلقیس پر نظر رکھنے کی ہدایت کی اور خوشیا اینڈ کمپنی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ دونوں تھکے ماندے میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں چند لمحے غضب ناک نظر سے انہیں تکتا رہا پھر ان کی ضعیفی کا خیال کرتے ہوئے میں نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کی پیش کش کر دی۔ خوشیا خاصا نڈھال اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ بخار اور عمر کی کمزوری تو چل ہی رہی تھی۔ بیٹی کی موت کی خبر نے اسے مزید ابتر کر دیا تھا۔

میں نے بڑے سخت اور واشگاف الفاظ میں ان دونوں کو صورت حال سے آگاہ کیا اور خوشیا کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

''اب تم کون سا نیا جھوٹ بولنے کی تیاری کر رہے ہو؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے مشورہ طلب نگاہ سے اپنی بیوی کو دیکھا، وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔

''دیکھو خوشیا! میں نے تمہاری دروغ گوئی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ تم نے کل مجھے بتایا تھا کہ تمہاری بیٹی سوہنی کو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے تھے لیکن اب سوہنی کی لاش کی دریافت سے ایک نئی کہانی سامنے آئی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے، سوہنی کم از کم تین روز قبل گھر سے گئی تھی۔ مزید تصدیق پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ہو جائے گی۔ تمہارے سامنے کوئی جائے فرار نہیں رہی۔ اب سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیا تم اب بھی غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے ڈھٹائی سے اپنے بیان پر ڈٹے رہو گے؟''

میرے انداز اور سخت الفاظ نے ان دونوں پر گہرا اثر کیا۔ خوشیا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''جناب تھانے دار صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ سوہنی تین دن پہلے گھر سے غائب ہوئی تھی۔ میں نے واقعی آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ سوچا تھا، ڈاکوؤں والی کہانی میں سوہنی کو فٹ کر دوں گا تو بات بن جائے گی۔''

''کیوں؟'' میں نے کڑک کر کہا۔ ''تم کون سی بگڑی بات بنانا چاہتے تھے۔ سوہنی کو ڈاکوؤں

سے نتھی کرنے میں تمہارا کیا فائدہ تھا۔ تمہیں تو چاہیے تھا، اسے تلاش کرتے اور پہلی فرصت میں تھانے آکر اس کی گمشدگی کی رپور درج کرواتے۔ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا...... کیوں؟"

خوشیا کے بجائے بخت بھری نے جواب دیا۔ "سوہنی کی گمشدگی نے تو ہماری مت ہی مار دی تھی۔ بدنامی کا خوف الگ تھا۔ ہم نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ جب تک وہ واپس نہیں آ جاتی پوچھنے والوں سے یہی کہیں گے کہ وہ اپنے ماموں کے پاس "چن والی" گئی ہوئی ہے۔ میں نے کل آپ سے یہی کہا تھا بعد میں خوشیا نے بیان بدلا تو مجھے بھی مجبوراً اس کی تائید کرنا پڑی ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ سوہنی تین دن پہلے ہی گھر سے غائب ہوگئی تھی۔"

خوشیا نے کہا۔ "اب ایک نئی بات سامنے آ رہی ہے کہ وہ زاہد کے ساتھ......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر متوحش نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "خوشیا! جو بات سامنے آ رہی ہے وہ ایک کھلی حقیقت ہے، تمہیں اسے تسلیم کرنا ہوگا اور میں نے یہ بھی سنا ہے۔" میں نے دانستہ تھوڑا وقفہ کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "تم گئے وقتوں میں بڑے اونچے درجے کے بدمعاش بھی رہے ہو، جسم میں جان تو باقی نہیں رہی مگر اب بھی غنڈا گردی سے باز نہیں آتے؟"

"یہ بات آپ سے کس نے کہی ہے؟" اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "اسی نے جس کے بیٹے کو پچھلے دنوں تم ڈراتے دھمکاتے رہے ہو۔"

"آپ کا اشارہ یقیناً بلقیس بی بی کی طرف ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے آپ کے کمرے سے نکلتے دیکھا ہے۔ شاید اس نے یہ بات اپنے بیٹے ہی کے حوالے سے کی ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا بلقیس نے غلط کہا ہے؟"

وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "بلقیس تو ایک پاگل عورت ہے۔ اس کا بیٹا میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو میری اس کوشش کو دھمکی سمجھ لیا گیا۔ کیا میں نے غلط کیا تھا۔ ایک بیٹی کے باپ کو اور کیا کرنا چاہیے۔ اس عمل سے میں بدمعاش کیسے ہوگیا؟"

اس کے لہجے میں خفگی جھلکنے لگی۔ میں نے کہا۔ "خوشیا! سوہنی اور زاہد کی لاشیں جس طرح ایک مقام سے ملی ہیں اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی سنجیدہ معاملہ چل رہا تھا۔ تم اس سلسلے میں صرف زاہد ہی کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے۔ تمہاری بیٹی بھی پوری طرح اس کے ساتھ ملوث تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اس کے ساتھ جاتی ہی کیوں...... اور وہ بھی ایک جنگل میں؟"

"میری بیٹی ناسمجھ اور بھولی تھی۔" بخت بھری نے کہا۔ "اس شیطان نے سوہنی کو ورغلایا ہے ورنہ وہ اس حد تک نہیں جا سکتی تھی۔"

شیطان سے اس کی مراد زاہد تھی۔ میں نے اسے گھور کر دیکھا اور کہا۔ "بخت بھری! تم فضول بات کر رہی ہو۔ اس معاملے میں کوئی ناسمجھ اور اندھا نہیں ہوتا کہ جو انگلی پکڑ کر جدھر لے جائے، وہ چلتا چلا جائے۔ اس قسم کے واقعات میں دونوں فریق برابر کے حصے دار ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے، دونوں ایک جیسے قصوروار ہوتے ہیں۔"

وہ دونوں شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ والدین کی بھی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو عموماً بے قصور ہی سمجھتے ہیں اور سارا الزام دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت کم والدین ایسے ہوتے ہیں جو اس قسم کے معاملات میں غیر جانب داری اور انصاف کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہیں۔

میں نے ان دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری بات غور سے سنو۔ تمہاری بیٹی کی موت کا مجھے بھی بے حد دکھ ہے اور تمہارے غم میں، میں برابر کا شریک ہوں اس لیے تمہاری اب تک کی دروغ گوئی کو معاف کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے ان کے چہروں پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ بخت بھری کے چہرے پر کوئی تغیر نظر نہ آیا البتہ خوشیا کی آنکھوں میں خوشی کی پرچھائیں دکھائی دیں۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ "اگر ابھی تک تم لوگوں کا کوئی جھوٹ مجھ سے چھپا ہوا ہے تو پہلی فرصت میں بتا دو ورنہ بعد میں، میں کسی رعایت سے کام نہیں لوں گا۔ اس بڑھاپے میں اپنی ہڈیوں کا سُرمہ بنوانے کی کوشش نہ کرو۔"

بخت بھری نے منت آمیز انداز میں کہا۔ "بس جناب! اس کے سوا ہم نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔"

میں نے خوشیا کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ اس نے اپنی بیوی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بخت بھری بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

میں نے ان دونوں سے چند اور سوال کیا پھر انہیں رخصت کر دیا۔ تاہم یہ شرط لگا دی کہ جب تک میں ان کی طرف سے مطمئن نہیں ہو جاتا، وہ اپنے گھر میں نظر بند رہیں گے میں نے ان پر واضح کر دیا کہ دو سادہ پوش مسلسل ان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اگر انہیں کسی شے کی ضرورت ہو تو وہ انہی سے منگوائیں۔ نگرانی پر مامور سادہ لباس پولیس والوں کو چھپا کر رکھنا اب ضروری نہیں رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے زاہد کی ماں بلقیس بی بی کو بھی جانے کی اجازت دے دی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آ سکتی تھی۔ فی الحال اس سلسلے میں مجھے کچھ نہیں کرنا تھا۔ میں نے لاشوں کو ضلع کے سرکاری اسپتال بھجوا دیا اور ان دونوں کے متوقع قاتل یا قاتلوں کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا۔ گھوم پھر کر ذہن ڈاکوؤں کی طرف ہی جاتا تھا۔ میں اسی تانے بانے

میں الجھا رہا اور شام ہوگئی۔

رات آٹھ بجے کے قریب ایک نہایت ہی اہم اطلاع مجھ تک پہنچی اور میں پھڑک اٹھا۔ سنسنی خیز اطلاع نے کیس کا پاسا پلٹ دیا۔ وہ خبر میرے مخبر سکندر نے تھانے آ کر مجھ تک پہنچائی تھی۔ سکندر کو میں نے خوشیا کے بارے میں چھان بین کا فریضہ سونپا تھا۔ میں نے فوراً سکندر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”ملک صاحب! میری تحقیق کے مطابق خوشیا جوانی سے ادھیڑ عمری تک جرائم پیشہ افراد سے منسلک رہا ہے۔ سنا ہے، جوانی میں ڈاکوؤں سے اس کے خاصے گہرے مراسم رہے ہیں۔“

یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے بلقیس کی کہی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ خوشیا کسی زمانے میں بدمعاش رہا تھا پھر آپو آپ میرا دھیان ڈاکوؤں کے اس جتھے کی طرف گیا جس نے تھانے پر حملہ آور ہو کر اپنے سردار کو حوالات سے نکال لیا تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خوفناک خیال چمکا...... کہیں خوشیا حملہ آور ڈاکوؤں سے ملا ہوا تو نہیں؟

میں نے پہلی فرصت میں خوشیا کو اپنے سامنے طلب کر لیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں موجود تھا۔ میں مخبر کی تحقیق کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس مرتبہ میں نے شروع سے خاصا سخت رویہ اپنایا اور خالص تھانے دارانہ لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا، اس عمر میں تم میرے ہاتھوں اپنی گت نہ بنوانا لیکن لگتا ہے، تمہیں اپنی زندگی اور عزت کی کوئی پرواہ نہیں؟“

”مم...... میں نے ایسا کیا کیا ہے تھانے دار صاحب؟“ وہ پہلی مرتبہ مجھے خوف میں مبتلا نظر آیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ اس نے کیا کیا ہے! پہلے تو وہ انکار میں گردن ہلاتا رہا لیکن جب میں نے اس کی ضعیفی کو پس پشت ڈال کر دو چار کرارے ہاتھ جمائے تو وہ راہ راست پر آ گیا۔ جب بچت کی کوئی امید اور فرار کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو وہ زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

رسول نگر میں رہتے ہوئے وہ سلطان کے گروہ کو اہم معلومات فراہم کرتا رہا تھا۔ کسی زمانے میں وہ بھی ڈاکوؤں کے ایک گروہ سے وابستہ رہا تھا لیکن اب اس قسم کی جوانوں والی سرگرمیاں اس نے ترک کر دی تھیں اور سیدھی سادھی زندگی گزار رہا تھا سلطان نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وقوعہ کے روز رات میں ڈاکوؤں کے گروہ نے اس کے گھر میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ بخت بھری اپنے شوہر کی پچھلی زندگی سے بڑی حد تک واقف تھی لیکن اس کے تازہ ترین کارناموں کی اسے خبر نہیں تھی۔

خوشیا نے اس سارے معاملے میں جو کردار ادا کیا، وہ بہت ہی گھناؤنا اور قابل مذمت تھا لیکن سوہنی کی المناک موت اور اس کی ضعیفی کا خیال مجھے نرمی پر مجبور کرنے لگا۔ میں نے دو اور دو چار کی طرح اس سے بات کی کہ وہ اگر مجھے سلطان کے خفیہ ٹھکانے کے بارے میں بتا دے تو میں اس کے ساتھ ممکنہ حد تک رعایت برتوں گا۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ ویسے بھی اس نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ وہ اس عمر میں اپنی مٹی پلید نہیں کروانا چاہتا تھا لہٰذا اس نے مجھے سلطان کے تین ٹھکانوں کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ ان میں سے ایک ٹھکانا لائل پور (موجود فیصل آباد) میں اور دو شیخوپورہ میں تھے۔

میں نے یہ حالات ایس پی صاحب کو بتائے اور ان کی اجازت سے چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دے کر سلطان کو پکڑنے کی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ بالآخر چھ روز بعد وہ شیخوپورہ والے ایک خفیہ ٹھکانے سے میری گرفت میں آ گیا۔ اس معرکے کی تفصیل اتنی دلچسپ اور طولانی ہے کہ ایک الگ کہانی کا تقاضا کرتی ہے۔ انشاء اللہ پھر کبھی انہی صفحات میں، میں یہ انوکھی داستان آپ کی نذر کروں گا۔

چلتے چلتے یہ بھی بتاتا چلوں کہ آئندہ چند روز میں، میں نے زاہد اور سوہنی کے قتل کا عقدہ بھی حل کر لیا۔ وہ قتل اور راہزنی کی ایک واردات تھی۔ پتا نہیں، ان بدبختوں کو کیا سوجھی جو انہوں نے جنگل کا رخ کیا۔ بہرحال، ان کا انجام بڑا حسرت ناک ہوا تھا۔

سلطان دوبارہ میرے قبضے میں آیا تو میرے دل کو قرار آ گیا۔ میں نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف اتنا مضبوط کیس بنایا کہ وہ عمر بھر جیل سے باہر نہیں آ سکتے تھے۔ حسب وعدہ میں نے خوشیا کے ساتھ خاصی نرمی برتی۔ وہ ایک طرح سے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ میں اس کے تعاون ہی سے ڈاکوؤں کے گروہ کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

ویسے بھی سوہنی کی دردناک موت کی صورت میں اس بڈھا بوڑھی کو جو روحانی سزا مل چکی تھی۔ اب اس عمر میں، میں انہیں اور کس عذاب میں مبتلا کرتا۔

ہمارے زمانے میں پولیس سے تعاون کرنے والے ہمیشہ فائدے میں رہتے تھے۔ میں نے سنا ہے، آج کل لوگ اکثر پولیس ڈیپارٹمنٹ سے شاکی رہتے ہیں۔ پتا نہیں، اس میں ڈیپارٹمنٹ کا قصور ہے یا عوام ہی کی سوچ ایسا منفی رخ اختیار کر چکی ہے؟ ویسے مثل مشہور ہے کہ تالی ہمیشہ دو ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اللہ ہم سب کو سوجھ بوجھ کی توفیق عطا فرمائے...... آمین!

روح نمائی

ایک روز میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر اپنے کوارٹر کے داخلی دروازے کو دیکھا اور بستر سے نکل آیا۔ وہ سردیوں کا موسم تھا اس لیے رات بہت جلدی ہو جاتی تھی۔ آٹھ نو بجے یوں محسوس ہوتا جیسا رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہو۔

جب تک میں سرکاری کوارٹر کا صحن عبور کر کے دروازے تک پہنچا، ایک مرتبہ پھر دستک ہو چکی تھی۔ میں یہی سوچتے ہوئے دروازے تک آیا تھا کہ شاید تھانے میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے اور میری ضرورت نے کسی کانسٹیبل کو یہاں آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا تھا اس لیے میں زیادہ تشویش میں مبتلا نہ ہوا اور آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی گرا دی۔

دروازہ کھلنے پر جس صورت سے میری نگاہ کا سامنا ہوا، وہ کوئی کانسٹیبل نہیں تھا۔ اپنے سامنے کھڑے ایک عام سے دراز قامت شخص کو دیکھ کر میری پیشانی پر بل پڑ گئے اور میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں بھئی، کون ہو تم اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

اس کا چہرہ بے تاثر رہا۔ تاہم اس نے میرے سوال کا جواب ضرور دیا۔ "میں ایک فریادی ہوں تھانے دار صاحب! اور آپ کے پاس اپنی ایک فریاد لے کر آیا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے لب خاموش ہوں۔ اس کی حرکات و سکنات میں بھی میکانگی پائی جاتی تھی۔ اس کا انداز مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے تنقیدی نظر سے سرتا پا اس کا جائزہ لیا۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت کا مالک تھا۔ شکل و صورت واجبی سی۔ قد لمبا ہونے کے باعث کمر میں ہلکا سا جھکاؤ آ گیا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس کے قریب لگایا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مجھے موت کی سی ٹھنڈک اور سرد مہری نظر آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی بہت ہی خشک مزاج اور غیر جذباتی شخص تھا۔ جس دوران میں میں اس کا جائزہ لے رہا تھا، وہ خاموش یک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ "میں فریادیوں کی فریادیں سننے کے لیے صبح سے شام تک تھانے میں موجود ہوتا ہوں۔ تم کل تھانے آ کر مجھے اپنا مسئلہ بتانا۔ میں ہر ممکن تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"میں آپ سے ملنے کے لیے تھانے نہیں آ سکوں گا۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "اگر آپ

ابھی میرا مسئلہ سن لیں تو آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔"

میرے جی میں نہ جانے کیا آئی میں نے اسے اپنے کوارٹر کے اندر بلا لیا۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے یہ احساس ہو کہ اس وقت اچھی سردی ہو رہی تھی اور یوں کھلے میں کھڑے ہو کر طویل گفتگو میرے اور اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔

وہ میرے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں بچھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نشست و برخاست میں بھی مجھے مصنوعی پن کی جھلک دکھائی دی۔ بہرحال، میں نے اس سے پوچھا۔ "اب بتاؤ، تمہیں ایسا کون سا مسئلہ درپیش ہے جس نے اس ٹھنڈی ٹھار رات میں تمہیں گھر سے نکل کر یہاں میرے کوارٹر پر پہنچا دیا ہے؟"

وہ چند لمحے مجھے سرد نگاہ سے تکتا رہا پھر بولا۔ "میرا مسئلہ انتہائی نازک اور نجی ہے۔ میں اسی لیے آپ سے تنہائی میں ملنے آیا ہوں۔"

"کہو، کیا مسئلہ ہے تمہارا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ "مگر اس سے پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے اور تم کیا کرتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔ "تھانے دار صاحب! میرا نام ریحان علی ہے اور میں قصبے کے مین بازار میں چینی کے برتنوں کی ایک دکان چلاتا ہوں۔ میرا گھر بھی ادھر بستی میں ہے۔ تھانے اور مین بازار کے درمیان۔"

"ٹھیک ہے، اب تم مجھے اپنا نجی مسئلہ بتاؤ!"

وہ بولا۔ "میں اپنی بیوی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔"

"کیا ہوا ہے تمہاری بیوی کو۔" میں نے پوچھا۔ "کیا وہ بیمار ہے؟"

"ہاں، آپ اسے بیماری کہہ سکتے ہیں۔" وہ انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "میری بیوی کو حسن کی بیماری لگ گئی ہے جناب!"

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جناب! میری بیوی شاہدہ بلا کی حسین اور پرکشش ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "خوبصورتی کی اسی بیماری نے میرا جینا عذاب کر دیا ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں کس قدر پریشان ہوں۔"

میں ابھی تک اس کا مطمح نظر سمجھ نہیں پایا تھا۔ "ریحان! شاہدہ کی خوبصورتی کس طرح تمہارے لیے پریشانیاں پیدا کر رہی ہے اور میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "تھانے دار صاحب! شاہدہ کی خوبصورت اور دلکشی اسے بے وفائی پر اکسا رہی ہے۔ بلکہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی ہے۔ میں اس سلسلے میں کسی شک و شبے کا شکار نہیں۔ مجھے پکا یقین ہے کہ وہ نجیب کے بہت دور تک تعلقات پیدا کر چکی

ہے۔اس سلسلے میں، میں آپ کو کچھ ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔‘‘

اب بات کی تہ مجھے دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ریہ
سے سوال کیا۔ ’’یہ نجیب کون ہے؟‘‘

’’نجیب اللہ آستین کا سانپ ہے۔‘‘ ریحان نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ’’ریلوے کا ملا
اور میرا دوست ہے۔ میرے گھر میں اس کا بے دریغ آنا جانا ہے۔ اس نے دوستی کی پاسدا
نہیں کی اور میری بیوی سے پینگیں بڑھا رہا ہے۔‘‘ وہ ایک لمحے کو بالکل ساکت ہو گیا پھر زہر
لہجے میں بولا۔ ’’میں مانتا ہوں کہ ان کے درمیان استوار ہونے والے تعلقات میں زیادہ قص
شاہدہ کا ہے۔ وہ شاہدہ کی مرضی اور حوصلہ افزائی کے بغیر ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا لیک
نجیب کو اس قسم کی گھٹیا حرکت نہیں کرنا چاہیے تھی۔ میں اسے قابل اعتماد دوست سمجھتا تھا، اس
اندھا بھروسا کرتا تھا تو اسے اپنے گھر میں آنے جانے کی میں نے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔‘‘

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں اس کا مسئلہ پوری طرح سمجھ گیا تھا اس لیے ا
کی موجودہ کیفیت کے پیش نظر میں نے کہا۔ ’’ریحان! جو کچھ تم بتا رہے ہو، اگر سب کچھ ویسا
ہے تو میں سمجھتا ہوں ان دونوں کے ساتھ ساتھ تم بھی برابر کے قصوروار ہو۔ یہ کھیل تماشا تمہار
نظر کے سامنے ہوتا رہا...... بلکہ ہوتا رہا ہے اور تم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو۔‘‘ ایک لمحے کو م
نے توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ’’کسی دوست پر بھروسا کرنا اچھی بات ہے
سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لینا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسے ہی ان دونو
معاملہ تمہارے علم میں آیا تھا، تمہیں کسی قسم کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے فرداً فرداً ان سے با
کرنا چاہیے تھی نا یہ کہ تم مزے سے بیٹھے ان کا تماشا دیکھ رہے ہو۔‘‘

’’میں مزے سے نہیں بیٹھا رہا جناب!‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ’’پھر تم نے اب تک کیا کیا ہے؟‘‘

’’میں نے سب سے پہلے شاہدہ سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’پھر اس نے تم سے کیا کہا؟‘‘

’’وہ صاف مکر گئی۔‘‘

’’اس کے بعد تم نے نجیب سے پوچھا ہو گا؟‘‘

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’نہیں جناب! میں نے نجیب سے ابھی کوئی بات نہ
کی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ میں نے استفسار کیا۔

وہ سادگی سے بولا۔ ’’کوئی فائدہ نہیں۔ جب شاہدہ نے اپنا جرم قبول نہیں کیا تو اس کا
کب تسلیم کرے گا۔ وہ دونوں ملی بھگت سے ’’معاملہ‘‘ چلا رہے ہیں۔‘‘

مجھے ریحان کی باتیں سن کر غصہ تو بہت آیا۔ تاہم میں نے اسے کھری کھری سنانے کے بجائے کہا۔ ’’تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ اس سلسلے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟‘‘

’’آپ نجیب کو سمجھائیں۔‘‘ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

’’کیا سمجھاؤں؟‘‘

’’یہی کہ...... یہی کہ وہ اس قسم کی گھٹیا حرکت سے باز آ جائے۔‘‘

فی الوقت اس کے اطمینان کے لیے میں نے کہہ دیا ’’ٹھیک ہے، میں اس بدبخت کو سمجھاؤں گا۔‘‘

وہ خاموش اور پتھرائی ہوئی نظروں سے مجھے تکتا رہا پھر بولا۔ ’’آپ اس کام کا وعدہ کرتے ہیں نا!‘‘

’’ہاں۔‘‘ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ’’میں اپنے طور پر تمہارا یہ کام کرنے کی کوشش کروں گا۔‘‘ پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا۔ ’’ریحان! تم کل کسی وقت نجیب کو میرے پاس تھانے بھیجنا۔ میں اس سے بات کروں۔ ضرورت پڑی تو تھوڑی پھینٹی شینٹی بھی لگا دوں گا۔‘‘

’’یہ تو آپ بہت اچھا کریں گے۔‘‘ وہ جلدی سے بولا۔ تاہم اس کے انداز میں اضطرار یا جوش نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنے مخصوص رویے کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن ایک مسئلہ ہے تھانے دار صاحب!‘‘

’’وہ کیا بھئی؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

’’نجیب کسی بھی طرح تھانے آنے کے لیے تیار نہیں ہو گا۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’پھر میں اسے کیسے سمجھاؤں گا؟‘‘

’’میں آپ کو اس کے پتے ٹھکانے کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔‘‘ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ’’آپ خود اس سے رابطہ کر لیں۔‘‘

ریحان کی ساری باتیں الجھن میں ڈالنے والی تھیں۔ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ’’ٹھیک ہے، میں فرصت نکال کر کسی بہانے نجیب کو تھانے بلوا لوں گا پھر تمہارے مسئلے کے بارے میں اس سے تفصیلی بات کروں گا۔‘‘

اس کے بعد ریحان نے مجھے بتایا کہ نجیب قریبی ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کلرک تھا اور ریلوے ہی کے دیے ہوئے ایک کوارٹر میں اس کی رہائش تھی۔ وہ ریلوے کے کوارٹرز اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ نجیب کے کوارٹر کا نمبر بھی اس نے مجھے لکھوا دیا۔ کہنے کو وہ کوارٹر تھے مگر وہ تین تین، چار چار کمروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے بنگلا نما گھر تھے۔ طرز تعمیر انتہائی پرانا اور انگریزوں کے وقت کا تھا۔ چونکہ ان کی دیکھ بھال اچھی طرح نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے اس کے در و دیوار سے بوسیدگی اور شکستگی ٹپکتی تھی۔

ریحان میرے کوارٹر سے رخصت ہوا تو میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس قصبے میں تعینات ہوئے مجھے لگ بھگ دو ماہ ہوئے تھے۔ مذکورہ قصبہ ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں واقع تھا اور اس قصبے میں ایک برانچ لائن ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ اسی اسٹیشن پر نجیب اللہ ٹکٹ گھر میں ٹکٹ فروخت کرنے پر مامور تھا۔

ریحان کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اپنے اندر خاصی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس کا رویہ عام انسانوں سے بہت مختلف تھا اور شروع سے آخر تک کم و بیش اس نے ایک ہی جیسا انداز اپنائے رکھا تھا۔ میں اس کے اس رویے یا انداز کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

میں نے بستر میں گھسنے کے بعد ریحان کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور سو گیا۔

❁❁❁

دوسرا دن بہت مصروفیت میں گزرا۔ اسی رات جب میں تھانے سے فارغ ہو کر اپنے کوارٹر میں پہنچا تو اچانک بجلی کے کوندے کے مانند ریحان میرے ذہن میں چمکا۔ اس کا دراز سراپا، سنجیدہ اور ٹھہری ہوئی آنکھیں، لب و لہجے میں سختی اور ایک خاص قسم کی سرد مہری۔ ریحان جتنی دیر میرے کوارٹر میں رہا تھا، میں اپنے اندر ایک بے نام سی بے چینی محسوس کرتا رہا تھا۔ ہزار کوشش کے بعد بھی میں اپنی اس وقت کی کیفیت اور احساسات کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہا۔ تاہم میں نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ روز میں سب سے پہلے نجیب کو تھانے بلا کر اس سے باز پرس کرنے والا کام کروں گا۔

پھر میں نے ایسا کیا بھی۔ دوسرے روز میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو اے ایس آئی محمد رفیق میرے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر تک ہمارے درمیان چوہدری فرزند علی مرڈر کیس پر بات چیت ہوتی رہی پھر میں نے اس سے کہا۔

"رفیق! یہاں کے ریلوے اسٹیشن پر جو ٹکٹ کلرک ہے اسے تھانے بلوانا ہے۔"

"کیوں جناب! خیریت تو ہے۔" رفیق نے پوچھا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ہاں خیریت ہے، ایک معاملے میں اس سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں بلوا دیتا ہوں۔" اے ایس آئی نے کہا پھر اس کا نام پوچھنے لگا۔

میں نے اسے ریحان علی سے ملنے والی اطلاع کے مطابق نجیب علی کا کام اور اس کے کوارٹر کا پتا بتا دیا۔

اے ایس آئی "ٹھیک ہے سر" کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد نجیب اللہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اے ایس آئی محمد رفیق بھی کمرے میں موجود تھا۔ میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے نجیب کو دیکھتا رہا۔ وہ میرے

اس انداز سے اپنے اندر بے کیفی محسوس کرنے لگا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تھانے دار صاحب! آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟"

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "میں ایک نہایت ہی نازک معاملے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور تمہیں چند مفید نصیحتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

بات کرنے کے دوران میں، میں مسلسل اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا!"

"یہ ضروری نہیں کہ صرف مجرموں ہی کو تھانے بلایا جائے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "یہاں پر معزز افراد اور شریف شہری بھی آتے ہیں۔ سب کے معاملات اور ان کی آمد کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر تم نے میرے سوالات کے ٹھیک ٹھیک جواب دیے اور خود کو بے قصور ثابت کر دیا تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تم جس طرح صحیح سلامت یہاں آئے ہو اسی طرح واپس بھی چلے جاؤ گے لیکن اگر تم نے کسی قسم کی غلط بیانی کا سہارا لیا یا مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو پھر میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دنیا عبرت پکڑے گی۔"

وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر کمزور سی آواز میں بولا۔ "سر جی! یہ تو بتائیں کہ مجھے کس سلسلے میں خود کو بے قصور ثابت کرنا ہوگا۔ ابھی تک تو آپ کی باتوں سے کچھ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔"

میں نے سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ "تمہیں شاہدہ کے سلسلے میں خود کو بے قصور ثابت کرنا ہوگا۔"

"شاہدہ!" وہ اچھل پڑا۔ "کیوں...... کیا ہوا ہے شاہدہ کو؟"

میں نے کہا۔ "اگر ابھی تک شاہدہ کو کچھ نہیں ہوا تو سمجھو تمہارے جھوٹ بولنے کے بعد بہت کچھ ہو جائے گا۔"

"جناب! آپ کیوں ڈرانے وال باتیں کر رہے ہیں؟"

"تم ایسے کام ہی کیوں کرتے ہو کہ تم کو ڈرانے والی باتیں سننا پڑیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ زچ ہو کر بولا۔ "سر جی! میرا تو دماغ دکھنے لگا ہے۔ آپ پتا نہیں، کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ میں شاہدہ کو کوئی نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

"اس لیے کہ تم اس سے عشق کرتے ہو!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ تمہاری محبوبہ ہے۔ کیوں، یہی بات ہے نا؟"

وہ پرجوش انداز میں بولا۔ "بالکل یہی بات ہے جناب۔ میں نے شاہدہ کو ٹوٹ کر چاہا ہے

اور زندگی بھر اسے چاہتا رہوں گا۔‘‘

اس کے بیان پر مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ’’تمہیں شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے اور وہ بھی ایک تھانے دار کے سامنے۔ تم تو بہت دلیر قسم کے مجرم ہو!‘‘

’’مجرم؟‘‘ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ’’میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا...... اور آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ مجھے شرم کیوں نہیں آتی۔ تو جناب، میں نے ایسا کیا کہا ہے جس پر مجھے نادم ہونا پڑے۔‘‘

وہ چور تھا مگر سینہ زوری پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے غصیلے انداز میں کہا۔ ’’کیا اپنے دوست کی بیوی سے عشق لڑانا بڑے فخر کا کام ہے جو تمہیں ذرا سی بھی شرمندگی نہیں محسوس ہو رہی؟‘‘

’’دوست کی بیوی؟‘‘ اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

’’ہاں، دوست کی بیوی۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارے دوست ریحان علی نے میرے پاس شکایت درج کروائی ہے کہ تم اس کی بیوی شاہدہ کو ورغلانے میں لگے ہوئے ہو۔‘‘

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے احتجاجی لہجے میں بولا۔ ’’جناب! اس قسم کی باتیں سن کر تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، آپ کون سی کہانی سنا رہے ہیں؟‘‘

’’میں اسی کھیل کی روداد سنا رہا ہوں جو تم اور شاہدہ مل کر کھیل رہے ہو۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ’’کیا سچ سننے کا حوصلہ نہیں ہے تم میں جو پاگل ہونے کا اندیشہ ہے؟‘‘

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات جھلک رہے تھے جیسے اس کے سامنے کوئی تھانے دار نہ بیٹھا ہو بلکہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ہو جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹ گئی ہوں۔ وہ کسی بھی طور پر میرے کہے ہوئے الفاظ کو ہضم کرنے پر تیار نظر نہیں آتا تھا۔

’’خاموش کیوں ہو۔‘‘ میں نے اسے جھڑکا۔ ’’تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟‘‘

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ’’تھانے دار صاحب! آپ جس قسم کی باتیں کر رہے ہیں، انہیں سن کر کوئی بھی نارمل انسان پلک جھپکتے میں پاگل ہو سکتا ہے۔ میں نے تو بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا ہے۔‘‘

اب میں تھوڑا سا کھٹکا۔ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ’’کیوں بھئی! میں نے ایسی کون سی انوکھی باتیں کہہ دیں؟‘‘

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ’’تھانے دار صاحب! شاہدہ، ریحان علی کی بیوی نہیں بلکہ وہ میری بیوی ہے۔ اپنی بیوی سے محبت، عشق اور پیار کرنے میں شرمندگی والی کون سی بات ہے؟‘‘

’’یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟‘‘ اب میرے اچھلنے کی باری تھی۔

’’میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں جناب!‘‘ وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔ ’’ابھی ایک ماہ پہلے تو ہماری شادی ہوئی ہے۔‘‘

مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ’’اگر تم نے ایک ماہ پہلے شاہدہ سے شادی کی ہے تو پھر ریحان نے تمہارے خلاف شکایت کیوں کی؟ وہ تو شاہدہ کا شوہر ہونے کا دعوے دار ہے!‘‘

نجیب نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔ ’’آپ سے ریحان کی ملاقات کب ہوئی تھی؟‘‘

میں نے بتایا۔ ’’پرسوں رات کو۔‘‘

’’ناممکن۔ یہ نہیں ہو سکتا جناب!‘‘ وہ دونوں ہاتھوں کو بڑی تیزی سے انکاری انداز میں ہلانے لگا۔ ’’میں نہیں مان سکتا۔ مان ہی نہیں سکتا جناب!‘‘

’’کیوں! اس میں ایسی ناممکن والی کون سی بات ہے؟‘‘

وہ جواب دینے سے پہلے مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے میں نے ریحان کا ذکر کر کے اس سے کوئی مذاق کیا ہو۔ جواباً میں بھی اسے کچھ اسی قسم کی نگاہ سے تک رہا تھا۔ شاہدہ کا اس کی بیوی ہونا ابھی تک مجھے بھی ہضم نہیں ہوا تھا۔

وہ تھوڑی دیر بعد گمبھیر آواز میں بولا۔ ’’جناب آپ ایک ذمے دار پولیس افسر ہیں۔ ہمارے درمیان نہ تو بے تکلفی ہے اور نہ ہی ایسے معاملات کہ آپ مجھے تھانے بلا کر مذاق کا نشانہ بنائیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ کی اس تفتیش اور پوچھ گچھ کا مطلب کیا ہے؟‘‘

’’میں نے تم سے کون سا مذاق کیا ہے؟‘‘

’’اس سے بڑا اور کیا مذاق ہو گا کہ پرسوں رات ریحان آپ کے پاس میرے خلاف رپورٹ درج کروانے آیا تھا۔‘‘ وہ خفگی آمیز سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

’’میرے پاس آنے کے لیے ریحان کے راستے میں ایسی کون سی رکاوٹ ہے جو تم اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہو؟‘‘ اس کے رویے سے اب مجھے الجھن ہونے لگی تھی۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’جناب! مجھے معلوم ہے، آپ اس تھانے میں نئے آئے ہیں اسی لیے آپ بات کو سمجھ نہیں پا رہے۔ آپ کو شاید ریحان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں!‘‘

’’کیا معلومات نہیں ہیں؟‘‘ میں چڑ کر بولا۔

اس نے دھماکا کر دیا۔ ’’تھانے دار صاحب! ریحان کا انتقال ہوئے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔‘‘

یہ واقعی ایک دھماکا تھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اگر میں نے پرسوں رات خود اپنی آنکھوں سے ریحان کو نہ دیکھا ہوتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ نجیب کی بات میں صداقت ہو گی۔ جو شخص چھ

ماہ پہلے فوت ہو چکا ہو، وہ مجھ سے ملاقات کرنے میرے کوارٹر پر نہیں آسکتا۔ قطعی نہیں!

اے ایس آئی محمد رفیق بھی اس صورتِ حالات سے خاصا الجھ چکا تھا۔ وہ کافی عرصے سے اس تھانے میں تھا اور قصبے کے تقریباً سب افراد کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! اگر یہ اسی ریحان علی کا ذکر ہے جس کی مین بازار میں چینی کے برتنوں کی دکان تھی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ چھ ماہ قبل اس دنیا سے اٹھ چکا ہے۔''

اے ایس آئی نے نجیب اللہ کی تصدیق کر دی تو میری الجھن میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک خیال یہ بھی ذہن میں آیا کہ ممکن ہے، جو شخص ریحان کی حیثیت میں مجھ سے ملا تھا وہ سرے سے ریحان ہی نہ ہو، کوئی دوسرا ہو اور ریحان بن کر مل رہا ہو۔ میں نے اس خدشے کا امکان ظاہر کیا تو نجیب اللہ فوراً بول اٹھا۔

''آپ اس شخص کی وضع قطع اور حلیے وغیرہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ اگر وہ ریحان نہ ہوا تو فوراً پتا چل جائے گا۔''

میں نے نجیب کی فرمائش پوری کر دی۔

وہ دونوں بیک وقت اچھل پڑے اور ایک زبان ہو کر بولے۔ ''یہ تو پکا پکا ریحان علی ہے۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ انکشاف ایسا تھا کہ روح کپکپا اٹھے۔ میں نے پرسوں رات ایک ایسے شخص سے ملاقات کی تھی جس کے انتقال کو چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال جم کر رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ...... اگر وہ شخص ریحان علی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟''

میں نے بے یقینی سے نجیب کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''یہ شاہدہ کا کیا چکر ہے۔ تم کہتے ہو ایک ماہ پہلے تمہاری اس سے شادی ہوئی ہے۔ اس شخص (ریحان) نے مجھ سے شکایت کی تھی کہ تم اس کی خوبصورت بیوی کو اپنے چنگل میں پھانس چکے ہو۔ دوستی کی آڑ میں تم نے اس کی پیٹھ میں گویا ایک خنجر گھونپ دیا ہے؟''

نجیب نے تحمل آمیز انداز میں کہا۔ ''جناب! سچی بات یہ ہے کہ شاہدہ پہلے ریحان کی بیوی تھی۔ ریحان کے انتقال کے بعد وہ بیوہ ہو گئی۔ میں نے ایک ماہ قبل اس سے شادی کر لی۔''

یہ ایک اور انکشاف تھا۔ میں نے گھور کر نجیب کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا تم اس بات سے انکاری ہو کر کہ ریحان سے تمہاری گہری دوستی تھی؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اس حقیقت سے کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔ میں باقاعدگی سے اس کے گھر جاتا تھا۔ اس کی موت سے مجھے شدید صدمہ پہنچا۔''

''تم لوگوں کی دوستی کتنے عرصے سے تھی۔''

''لگ بھگ ایک سال سے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تمہاری دوستی کے چھ ماہ بعد ریحان کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''بس جی یہ تو اللہ کے کام ہیں۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''موت اور زندگی تو اسی کے ہاتھ میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے اپنے دوست کی وفات کے پانچ ماہ بعد ہی اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔ یہی بات ہے نا۔''

''میں کیا کرتا جی۔'' وہ پوری سنجیدگی سے بولا۔ ''دوست کی بیوہ اگر انتہائی خوبصورت اور دلکش ہو تو ایمان ڈگمگاتے ہوئے لمحہ نہیں لگتا۔ اگر میں شاہدہ سے شادی نہ کرتا تو یقیناً گناہ کے راستے پر چل نکلتا۔ میں نے تو خود پر اور شاہدہ پر ایک احسان کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہدہ پر تو تم اپنے دوست کی زندگی میں بھی بہت احسان کرتے رہے ہو!''

میرا انداز طنزیہ تھا۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''اگر آپ ابتک اسی خیال پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ ریحان کی زندگی میں میرے اور شاہدہ کے درمیان کوئی اس قسم کا تعلق استوار ہو چکا تھا جو شاہدہ کو بے وفا اور مجھے یار مار ثابت کرے تو میں آپ سے قسمیہ کہنے کو تیار ہوں، ہرگز ہرگز ایسی کوئی بات نہیں تھی۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''البتہ، میں یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ شاہدہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس کے حسن اور معصومیت میں بڑی کشش پائی جاتی ہے۔''

''یہی کشش تمہیں کھینچ کر ریحان کے گھر لے جاتی تھی؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں وہاں صرف ریحان سے ملنے جاتا تھا، یہ الگ بات ہے کہ اس گھر میں شاہدہ کا بھی دیدار ہو جاتا تھا۔''

وہ میری ہی کہی ہوئی بات کو الفاظ بدل کر دہرا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے دوست ریحان کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی؟''

''بس جی، قضا آئی تھی۔ وہ مر گیا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''سب کی قضا ہی آتی ہے۔ کوئی بن بلائے اس سفر پر نہیں جاتا۔ میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی موت طبعی ہوئی تھی یا غیر طبعی؟''

''طبعی۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''کیا ہوا تھا اس کو؟''

اس نے بتایا۔ ''بس جی، بھلا چنگا رات کو سویا تھا۔ آدھی رات کو اسے الٹیاں ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ مر گیا۔ شاید اسے بدہضمی ہو گئی تھی یا ممکن ہے، وہ ہیضے سے مر گیا ہو۔ اسے کھانے پینے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت زیادہ مقدار میں کھانا کھانے کا عادی تھا۔ ایسے لوگوں کو

اکثر بدہضمی کی شکایت تو رہتی ہے۔''

یہ تفصیل بتاتے ہوئے وہ مجھے دیکھنے کے بجائے دائیں بائیں تکتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بے چین نظر آنے لگا تھا۔ میں نجیب کی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ریحان بہت زیادہ مقدار میں کھانا کھاتا ہوگا۔ اس کی صحت اس کی عادت کی نفی کرتی تھی۔ میں نے فی الوقت نجیب کو زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ تاہم میں نے بڑے واشگاف الفاظ میں اس پر واضح کر دیا۔

''نجیب اللہ! تم اس قصبے سے باہر جانے سے قبل تھانے میں اطلاع دو گے اور واپسی پر بھی تمہیں اسی عمل سے گزرنا ہوگا۔ اگر پھر تمہاری ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلوا لوں گا۔''

وہ برہمی سے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، میں زیرِ حراست ہوں؟''

''اگر تم زیرِ حراست ہوتے تو میں تمہیں تھانے کی حوالات میں ڈالتا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یوں آزادی اور خودمختاری سے قصبے میں گھومنے کی اجازت نہ دیتا۔''

وہ میرے تیور بھانپ گیا، شرافت سے بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب، میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

نجیب اللہ میرے کمرے سے رخصت ہوا تو اے ایس آئی فوراً بول اٹھا۔ ''ملک صاحب! یہ کیا چکر ہے؟''

میں نے کہا۔ ''چکر پر پھر بات کریں گے، پہلے تم اس بندے کی نگرانی کا بندوبست کرو لیکن اسے شک نہیں ہونا چاہیے۔''

''اچھا جی، ابھی لیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پانچ منٹ بعد اس نے آ کر بتایا۔ ''ملک صاحب! میں نے کانسٹیبل آفتاب کو نجیب کی نگرانی پر مامور کر دیا ہے۔ وہ سادہ لباس میں اس پر نگاہ رکھے گا۔''

آفتاب احمد ایک ہوشیار اور سمجھدار قسم کا پولیس اہلکار تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

اے ایس آئی نے سنسنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''اب بتائیں ملک صاحب! یہ کیسا چکر چل نکلا ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ ''پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا واقعی ریحان علی کو فوت ہوئے کم و بیش چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے؟''

''یہ تو ایک حقیقت ہے ملک صاحب!'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''یہ آپ کے یہاں آنے سے پہلے کا واقعہ ہے۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رہ رہ کر میرے تصور پر اس شخص کا سرد اور بے تاثر چہرہ ابھر رہا تھا۔ اے ایس آئی اور نجیب اللہ اس بات کی تصدیق کر چکے تھے کہ میں نے جو حلیہ بیان کیا،

وہ ریحان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ عملی طور پر تو یہ ممکن نہیں تھا کہ چھ ماہ قبل موت کے منہ میں جانے والا ایک شخص بہ نفسِ نفیس مجھ سے ملنے رات کی تاریکی میں میرے کوارٹر تک چلا آیا ہو۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اے ایس آئی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''ملک صاحب! کیا واقعی پرسوں رات مرحوم ریحان علی آپ کے پاس نجیب کے خلاف کوئی رپورٹ درج کرانے آیا تھا؟''

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ''اس رات تو میں رات گئے تک تھانے میں موجود تھا۔ ریحان کس وقت آپ کے پاس آیا تھا۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ''پھر دیکھنے، نہ دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کوئی زندہ شخص تھوڑی ہے......''

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''محمد رفیق! میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ریحان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ تمہیں وہ اس لیے دکھائی نہیں دیا کہ وہ تھانے میں نہیں بلکہ میرے کوارٹر پر آیا تھا۔ میں نے نہ تو کوئی خواب دیکھا ہے اور نہ ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔ وہ واقعی آیا تھا۔''

''کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر ممکن ہوتا تو پھر میں الجھتا ہی کیوں۔''

وہ پراسرار انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! کہیں یہ...... کوئی روح...... وغیرہ کا قصہ تو نہیں؟''

''تمہارا مطلب ہے ریحان علی کی روح!''

''جی ہاں، جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہو سکتا ہے، مرحوم ریحان کی روح آپ کی توجہ کسی خاص رخ پر ڈالنا چاہ رہی ہو!''

یہ بات میری عقل میں نہیں آ سکتی تھی۔ میں روحوں وغیرہ پر اس طرح یقین نہیں کر سکتا تھا تاہم جو حالات میرے پیش نظر تھے وہ بھی فی الوقت میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ میں اسی سوچ میں گم تھا کہ اے ایس آئی نے مجھے مخاطب کیا۔

''ملک صاحب! آپ نے بتایا کہ ریحان (ریحان کی روح) آپ کے پاس اپنے دوست کی شکایت لے کر آیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نجیب اس کی بیوی شاہدہ کو ورغلا رہا تھا اور ان کے درمیان بہت دور تک تعلقات بھی قائم ہو چکے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نجیب نے ڈھکے چھپے الفاظ میں شاہدہ کو پسند کرنے کی بات تو کی ہے۔ ممکن ہے، نجیب محتاط ہو اور حقیقت وہی ہو جو ریحان نے آپ کو بتائی تھی۔ گویا نجیب نے شاہدہ کو حاصل کرنے کے لیے ریحان کو راستے سے ہٹا دیا ہو۔ اس قسم کے واقعات تو سننے میں آتے رہتے ہیں۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نجیب نے کسی طرح ریحان کو قتل کر دیا ہوگا؟''

"میں تو انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔"

"تمہاری سوچ میں وزن ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "ریحان کی موت یقیناً پر غیر طبعی واقع ہوئی ہے۔ نجیب کی جانب شکایتی اشارہ یہ بتاتا ہے کہ یا تو نجیب اس کی موت ذمے دار ہے یا کسی نہ کسی طور پر وہ اس معاملے میں ملوث ہے۔ اب یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ کہ پرسوں رات جو سرد مہر شخص مجھ سے ملنے کوارٹر تک آیا تھا وہ کم از کم ریحان نہیں ہو سکتا۔"

"اگر ہم نجیب پر کچھ محنت کریں تو بات بن سکتی ہے۔" اے ایس آئی نے کہا۔ "وہ اس بار کا سب سے اہم مہرہ ہے۔ وہ اس وقت ایک ایسی عورت کا شوہر ہے جو ماضی میں ممکنہ مقتول بیوی رہ چکی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم نجیب کا معاملہ سنبھال لو۔ اس کی کڑی نگرانی کراؤ اور اس کے بارے تفصیلی معلومات حاصل کرو۔ میں دیگر امور سنبھالتا ہوں۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

پھر ہمارے درمیان اسی سلسلے میں کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

❁❁❁

ریحان علی کی مبینہ روح دوبارہ نظر نہیں آئی۔

روحوں کے بارے میں جس قسم کی کہانیاں اور قصے سننے میں آتے ہیں ان میں سے بہت ناقابل یقین باتیں ہوتی ہیں۔ بعض واقعات کو اس طرح بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے کہ ا میں دروغ گوئی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اگر کسی شخص کی مو غیر طبعی طور پر واقع ہو یعنی وہ کسی حادثے کا شکار ہو جائے یا اسے قتل کر دیا جائے تو بعض کیس میں روح اس کے جسم سے نکل کر آزاد ہو جاتی ہے پھر وہ اپنے قاتل یا اس حادثے کے ذ دار کو کیفر کردار تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں یہاں پر روح کے موضوع پر بحث نہیں کر چاہتا۔ اس لیے تمام نظریات اور خیالات سے پہلو تہی کرتے ہوئے میں اصل واقعے کی طر آتا ہوں۔ اس قسم کی علمی اور روحانی گفتگو کے لیے ماہرین کی کمی نہیں۔

میرے کوارٹر پر آنے والے ریحان یا وہ جو بھی رہا ہو کے بقول نجیب نامی دوست اس بیوی شاہدہ کو اپنے چنگل میں پھانس چکا تھا اور وہ اپنی بیوی کو نجیب کے چکر سے نکالنے کے مجھ سے مدد کا طلبگار تھا۔ نجیب سے ہونے والی اس ملاقات سے میں بخوبی سمجھ گیا کہ اس ریحان کی زندگی میں شاہدہ سے ضرور کوئی تعلق رہا ہو گا۔ اب وہ شاہدہ کا شوہر تھا۔ ریحان موت کے سلسلے میں، میں اے ایس آئی کا ہم خیال تھا کہ اس موت میں نجیب بلاواسطہ بالواسطہ ملوث تھا۔ اگر ایسی کوئی بات نہ ہوتی تو پھر میرے کوارٹر میں ہونے والی وہ "ملاقات" کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

اسی روز دوپہر کے بعد میں قصبے کے مین بازار کی طرف نکل گیا۔ پوچھتے پوچھتے میں ا

دکان پر جا پہنچا جو کبھی ریحان کی ہوا کرتی تھی۔ میں نے اس دکان میں ایک سرخ و سفید دراز قامت شخص کو بیٹھے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ملک حنیف تھا۔ وہ دراز قد ہونے کے ساتھ ساتھ بھاری بھر کم بھی تھا۔

میں نے سلام دعا کے بعد اس سے سوال کیا۔ "ملک حنیف! تم یہ دکان کب سے چلا رہے ہو؟"

وہ مجھے وردی میں دیکھ کر اور یہ جان کر کہ میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں، بچھا بچھا جا رہا تھا۔ مجھے عزت و احترام سے دکان کے اندر بٹھانے کے بعد اس نے میری خاطر تواضع کے بندوبست کے لیے ایک ملازم لڑکے کو بھی دوڑا دیا تھا۔ میں نے بہت انکار کیا لیکن اس کی ضد اور خلوص کے سامنے مجھے خاموش ہونا پڑا۔

ملک حنیف نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "ملک صاحب! میں پچھلے دو ماہ سے اس دکان کو چلا رہا ہوں۔" پھر اس نے پوچھا۔ "کیوں، خیریت تو ہے!"

"ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "ممکن ہے، آگے چل کر یہ خیریت برقرار نہ رہ سکے۔"

وہ تشویش ناک نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ابھی تک میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "غالباً پہلے اس دکان کا مالک ریحان علی ہوا کرتا تھا؟"

"جی ہاں، ریحان بہت اچھا انسان تھا۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "انتہائی معقول اور شریف آدمی۔"

میں نے استفسار کیا۔ "کیا تم نے یہ دکان ریحان سے خرید لی تھی؟"

"میں نے یہ دکان ریحان سے نہیں بلکہ اس کی بیوی شاہدہ سے خریدی ہے۔" ملک حنیف نے بتایا۔ "دراصل یہ دکان تو کرایے کی ہے۔ میں نے اس میں موجود سامان وغیرہ اس سے خریدا تھا، پورے پانچ ہزار روپے میں۔"

"پانچ ہزار روپے تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

اور یہ واقعی اس زمانے میں خاصی موٹی رقم تصور کی جاتی تھی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "رقم اگرچہ بڑی ہے مگر اس دکان کے اندر بھرے ہوئے برتن بھی بہت قیمتی ہیں پھر یہ بالکل مین بازار میں ہے اور خوب چلتی بھی ہے۔"

میں حنیف کے پاس لگ بھگ آدھا گھنٹا رکا تھا اور اس دوران میں مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ دکان واقعی اچھی خاصی چلتی تھی۔ میں حنیف سے شاہدہ، ریحان اور نجیب وغیرہ کی باتیں کرتا رہا۔ وہ نجیب کو ریحان کے دوست کی حیثیت سے اچھی طرح جانتا تھا۔ شاہدہ اور نجیب کے

ذکر پر وہ کبیدہ خاطر ہو گیا اور ناپسندیدہ انداز میں بولا۔

''میرے خیال میں شاہدہ نے نجیب سے شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔''

اس نے میرے مطلب کی بات کر دی تھی لہٰذا میں نے اسے کریدنا ضروری سمجھا۔

''تمہارا یہ خیال کس وجہ سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! یہ جو بندہ نجیب ہے نا، یہ مجھے بڑا ہی لالچی اور دھوکے باز نظر آتا ہے۔ شاہدہ سے جب تک اس دکان کے سودے کی بات چلتی رہی، وہ اس کے ساتھ چپکا رہا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ اس نے شاہدہ سے پانچ روپے ہتھیا لیے ہوں گے۔ ان کی شادی کے بعد تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے نجیب نے لالچ اور پلاننگ کے تحت شاہدہ سے شادی کی ہے۔''

میں نے ملک حنیف کے خیالات کی نہ تو تردید کی اور نہ ہی تصدیق۔ مجھے سوچ میں دیکھ کر اس نے سوال کیا۔ ''ملک صاحب! آپ یہ ساری تفتیش کس سلسلے میں کر رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''سلسلہ تو بہت دراز ہے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں ریحان کی موت کے اسباب کے بارے میں چھان بین کر رہا ہوں۔''

''موت کے اسباب! میں کچھ سمجھا نہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، موت کے اسباب۔ مجھے پتا چلا ہے کہ نجیب کا ریحان کے گھر میں آنا جانا بھی تھا۔ وہ ہر وقت وہیں گھسا رہتا تھا!''

''ظاہر ہے جی، وہ دونوں دوست تھے۔'' ملک حنیف نے کہا۔ ''اسی دوستی کی آڑ میں نجیب ریحان کے گھر جاتا ہوگا۔''

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''دوستی کی آڑ میں یا شاہدہ کی تاڑ میں؟''

''میں آپ کی بات کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ پُرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس قسم کی کچھ باتیں میرے سننے میں بھی آئی ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے شاہدہ اور نجیب کے درمیان، ریحان کی زندگی ہی میں کوئی چکر وغیرہ چل رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس چکر کو نجیب پسندیدگی محض کا نام دیتا ہے۔''

''ریحان کی موت کے بعد نجیب جتنی تیزی سے شاہدہ کے قریب آیا ہے اور خیر، اب تو اس نے شاہدہ سے شادی بھی کر لی ہے اس کو پسندیدگی محض نہیں کہا جا سکتا۔ میرے نزدیک تو یہ شاہدہ کی بے وقوفی اور نجیب کی مکاری پر مبنی کوئی خطرناک کھیل ہے جس کا نتیجہ بہت ہی بھیانک برآمد ہوگا۔''

میں نے ملک حنیف سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے، ریحان کی موت کس طرح ہوئی تھی؟''

''میں نے سنا ہے، اسے ہیضہ وغیرہ ہو گیا تھا۔'' حنیف نے جواب دیا۔ ''رات بھر وہ الٹیاں کرتا رہا پھر فوت ہو گیا۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہارے خیالات کو سچ مان لیا جائے کہ نجیب ایک لالچی اور دھوکے باز شخص ہے اور اس نے کسی خاص مقصد کے تحت شاہدہ سے شادی کی ہے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس شادی سے اسے کون سے فائدہ پہنچا ہے۔''

حنیف نے کہا۔ ''پہلا فائدہ تو اس دکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ہے۔ پانچ ہزار روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے، یہ رقم سیدھی نجیب کی جیب میں گئی ہوگی۔ ازیں علاوہ نجیب کو شاہدہ جیسی حسین عورت مل گئی۔ اس کی تو پانچوں گھی میں ہیں۔ ہر طرف سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا۔ ''میں نے نجیب کی پہلی بیوی کو بھی دیکھا ہے۔ سلمیٰ، شاہدہ کا پاسنگ بھی نہیں تھی۔''

''نجیب کی پہلی بیوی!'' میں نے چونک کر حنیف کو دیکھا۔ ''کیا یہ نجیب کی دوسری شادی ہے..... اور تم نے سلمیٰ کے لیے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! شاہدہ واقعی نجیب کی دوسری بیوی ہے۔ اس کی پہلی بیوی کا نام سلمیٰ تھا اور وہ واجبی سی صورت شکل کی مالک ایک غریب عورت تھی۔ ان دونوں کے درمیان صبح و شام لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ ماضی کا صیغہ استعمال کرنے کا مطلب ہے، سلمیٰ اب نجیب کے پاس نہیں بلکہ وہ اس قصبے میں ہی نہیں۔''

''کیا سلمیٰ کا انتقال ہو چکا ہے؟'' میں نے ایک قوی امکان کے بارے میں پوچھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''سلمیٰ اس وقت زندہ ہے یا واقعی اس کا انتقال ہو چکا ہے، یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہاں کے لوگوں کو بس یہی معلوم ہے کہ ایک سال پہلے سلمیٰ اپنے شوہر نجیب کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ نکل گئی تھی۔''

حنیف نے بڑی چونکا دینے والی بات کی تھی۔ سلمیٰ کے بھاگنے کا عرصہ وہی تھا جب سے نجیب نے ریحان کے ساتھ دوستی گانٹھی تھی اور ان کے گھر اس کی آمدورفت شروع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا، بیوی کے چھوڑ کر جاتے ہی وہ شاہدہ کے چکر میں پڑ گیا تھا اور بالآخر اسے حاصل بھی کر لیا۔

میں نے حنیف سے پوچھا۔ ''کیا نجیب نے اپنی بیوی سلمیٰ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی؟''

''یقیناً کی ہوگی جناب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''ریحان والے گھر میں اب کون رہتا ہے؟''

''اس کی ایک رشتے کی چاچی منظوراں وہاں رہ رہی ہے۔'' حنیف نے بتایا۔ ''وہ شروع ہی

سے ریحان کے ساتھ تھی۔‘‘

میں نے کہا۔’’اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ مکان ریحان کی ملکیت نہیں تھا ورنہ اس کی وفات کے بعد اس مکان کی مالک شاہدہ ہو جاتی اور پھر وہ کسی بھی چاچی واچی کو وہاں ٹکنے نہیں دیتی یا تو وہ نجیب کے ساتھ وہاں رہ رہی ہوتی یا پھر مکان کو بیچ کر رقم نجیب کے حوالے کر چکی ہوتی۔ جیسا کہ بقول تمہارے، شاہدہ نے تم سے حاصل ہونے والے پانچ ہزار روپے نجیب کو دے دیے تھے۔‘‘

’’بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جناب!‘‘ وہ تائیدی انداز میں بولا۔’’اگر وہ مکان ریحان کی ملکیت ہوتا، مگر ایسا کچھ نہیں۔‘‘

میں نے کہا۔’’تو اس کا مطلب ہے، وہ مکان ریحان کی چاچی منظوراں کا ہے جو اس وقت وہاں رہ رہی ہے۔‘‘

’’نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔‘‘

’’پھر کیسی بات ہے؟‘‘

ملک حنیف نے گہری سنجیدگی سے مجھے بتایا۔’’دراصل وہ مکان ایک متنازع پراپرٹی ہے اور یہ بات مجھے اس طرح معلوم ہوگئی کہ میں دکان کے ساتھ ساتھ اس مکان کو بھی خریدنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس کے کاغذات کی جانچ پڑتال کرائی تھی میں نے۔‘‘

’’کاغذات میں کس قسم کا تنازع ہے؟‘‘

حنیف نے بتایا۔’’وہ مکان کسی زمانے میں ریحان کے دادا کی ملکیت تھا۔ اس نے مرنے سے قبل مکان کو اپنی اولادوں کے نام مشترکہ طور پر منتقل کر دیا۔ یہ تیرہ اولادیں تین مختلف بیویوں میں سے تھیں جن میں ایک ریحان کا باپ بھی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مذکورہ مکان ریحان کے باپ اور اس کی چاچی کے تصرف میں آگیا۔ منظوراں بیوہ عورت تھی اس لیے اپنے دیور یعنی ریحان کے باپ کے ساتھ ہی رہنے لگی جو ریحان کے باپ کے انتقال کے بعد ریحان کے ساتھ رہنے لگی یعنی اس مکان میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس دوران میں کسی نے بھی سنجیدہ طور پر اس مکان کے کاغذات کی تصحیح اور درستی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب اگر میں مکان کو خریدتا تو مجھے اس کے لیے بہت سے پاپڑ بیلنے کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے اس جھنجھٹ میں پڑنے کی کوشش نہیں کی البتہ.....‘‘ اس نے دکان ے شوکیسوں میں سجے چینی کے برتنوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔’’میں اس دکان کے مال کو تو خرید ہی چکا ہوں۔ اب اس دکان کو بھی بہت جلد خرید لوں گا۔‘‘

اس کی بات پوری توجہ سے سننے کے بعد میں نے کہا۔’’تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ اگر اس مکان کو بیچنا اتنا ہی آسان ہوتا تو شاہدہ اس کام میں تاخیر کا مظاہرہ نہ کرتی۔‘‘

’’وہ کوشش میں تو لگی ہوئی ہے۔‘‘ حنیف نے کہا۔’’مجھے خبریں ملتی رہتی ہیں۔ وہ اس مہم میں مصروف ہے کہ وہ مکان کسی طرح ریحان کی بیوہ کی حیثیت سے اسے مل جائے پھر بعد میں وہ اسے فروخت کر سکے۔‘‘

’’لیکن اب وہ ریحان کی بیوہ تو نہیں رہی۔‘‘ میں نے کہا۔’’وہ نجیب کی بیوی بن چکی ہے۔ اس شادی کے بعد تو ریحان کی جائداد پر اپنا حق ثابت کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔‘‘

وہ سادگی سے بولا۔’’ملک صاحب! مشکل آسان تو بعد کی بات ہے۔ ابھی تو وہ اس کوشش میں لگی ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی اس کوشش کے پیچھے بھی نجیب ہی کا دماغ کام کر رہا ہے۔‘‘

’’تم نجیب کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بدکے ہوئے نہیں ہو؟‘‘

’’بات بدکنے کی نہیں جناب!‘‘ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔’’مجھے اس کی شکل سے نحوست ٹپکتی دکھائی دیتی ہے۔ جو شخص اپنے دوست کی عزت کی حفاظت کرنے کے بجائے اس پر ڈاکا ڈالے، اسی تھالی میں چھید کر ڈالے جس میں وہ روز کھانا کھاتا ہو، ایسے شخص کو کوئی کیونکر پسند کر سکتا ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ریحان کی زندگی میں ہی نجیب نے شاہدہ سے غیر اخلاقی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ اپنے دوست کی بیوی کو میلی نظر سے دیکھنا شرافت کی دھجیاں بکھیرنے کے مترادف ہے۔ نجیب نے خود کو آستین کا سانپ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔‘‘

ملک حنیف کی ان پُرجذبات باتوں کو سن کر ریحان کا چہرہ میری نگاہ میں گھوم گیا۔ ٹھنڈک خارج کرتی ہوئی سرد مہر آنکھیں، باتیں کرتے ہوئے ساکت لب اور مشینی انداز میں حرکت کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ یہ کسی زندہ اور نارمل انسان کا ’’اسٹائل‘‘ نہیں ہو سکتا تھا اور انسان بھی وہ جو چھ ماہ قبل فوت ہو چکا ہو۔ مجھے بھی اب کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ شاید میں نے اس رات واقعی ریحان کی روح سے ملاقات کی تھی۔ اس بات کی تصدیق کرنے والے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی کہ ریحان کو مرے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ ریحان کی روح خصوصی طور پر مجھ سے ملنے آئی تھی یہ ماننا بھی ضروری ہو جاتا تھا کہ اگر اس نے نجیب کی شکایت کی تھی تو وہ یہی چاہتی تھی کہ میں اس شخص نجیب پر ’’کام‘‘ کروں۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ ریحان کی موت میں نجیب کا بھرپور ہاتھ ہو ورنہ روح کی بے چینی اور مجھ سے ربطہ کیا معنی رکھتا تھا۔

ملک حنیف بھی اسی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ گویا یہ آوازِ خلق تھی جس کو نقارہ خدا جاننا ضروری تھا کہ..... نجیب نے اپنے دوست، کو راہ سے ہٹا دیا ہوگا۔ موجودہ صورت حالات اور واقعات نوے فیصد اسی جانب اشارہ کرتے تھے۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک لائحہ عمل تیار کر لیا۔

میں دس منٹ بعد ملک حنیف کی دکان سے باہر آ گیا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں اس سے مرحوم یا مقتول ریحان کے گھر کا ایڈریس اچھی طرح سمجھ لیا۔ اس کا مکان اسی بستی میں تھا اور دکان سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ میں نے ریحان کی چاچی منظوراں سے ملنے کا فیصلہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں مذکورہ مکان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ایک کالی بھجنگ عورت تھی۔ ا سامنے ایک وردی پوش والے کو دیکھ کر اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گ اس کے بھدے موٹے ہونٹوں سے صرف یہ الفاظ خارج ہوئے۔

''ہائے ربا...... پلیس (پولیس)''

پھر اس سے قبل کہ وہ دھڑام سے دروازہ بند کر دیتی، میں نے دروازے کے دونوں پٹ کے درمیان اپنا بوٹ پھنسا دیا۔ اس کی اضطراری کوشش ناکام ہو گئی۔ وہ وحشت بھ آنکھوں اور بھدے موٹے موٹے نقوش والے چہرے کو میری جانب رکھتے ہوئے کپکپانے لگی میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں تمہیں گرفتار کرنے نہیں آ بس چند باتیں پوچھنا ہیں۔ اس کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا۔''

''کک...... کیسی باتیں؟'' وہ ہکلائی۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''وہ باتیں یہاں دروازے پر کھڑے کھڑے نہیں کی جا سکتیں۔ تمہارے گھر کے اندر بیٹھنے کی جگہ نہیں؟''

وہ شک زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے استفسار کیا۔ ''منظوراں تمہارا نام ہی ہے نا؟''

مجھے منظوراں کا جو حلیہ حنیف نے بتایا تھا، وہ عورت اس پر سولہ آنے پوری اتری تھی۔ تا میں نے پھر بھی اپنی تسلی اور اس کے اطمینان کی خاطر نام کی تصدیق کر لی۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''جی، میں ہی منظوراں ہوں۔''

دو منٹ بعد میں منظوراں کے گھر کی بیٹھک میں بیٹھا منظوراں سے باتیں کر رہا منظوراں کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی۔ وہ بھدے نقوش والی ایک موٹی عورت تھی۔ کلوٹی، کم رو اور بے وقوف۔ پستہ قامتی نے اس کے دکھن میں ''آٹھ چاند'' لگا دیے تھے۔ وہ قدرے نارمل ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا تو اس چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

اس نے قدرے جرأت مندی سے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے کس قسم سوال کرنے آئے ہیں۔''

میں نے بیٹھک میں آتے ہی اسے بتایا کہ میں اس کے علاقے کا تھانہ انچارج ملک حیات ہوں۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ''منظوراں بی بی! میں دراصل تمہارے بھتیجے ریحان کی موت کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہوں۔''

''کس قسم کی تحقیقات جناب؟''

''مجھے شک ہے کہ ریحان کی موت میں کسی کا ہاتھ ہے۔''

میں نے اسے ریحان کی روح سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ یہ خوامخواہ خوف زدہ ہو جاتی اور میں جو کچھ اس سے پوچھنا چاہتا تھا اس میں مجھے ناکامیابی ہوتی۔

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے!''

''یہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں تکتے ہوئے کہا۔

پتا نہیں، یہ میری نگاہ کا اثر تھا یا اس کی خوف زدگی کہ وہ ہراساں لہجے میں بولی۔ ''کہیں آپ مجھ پر تو شک نہیں کر رہے؟''

''جب تک اصل بندہ میرے ہاتھ نہیں آ جاتا، میں ہر اس شخص کو شک کی نظر سے دیکھوں گا جو کسی بھی طرح ریحان سے وابستہ رہا ہو۔ منظوراں بی بی! تمہاری اس گھر سے اور ریحان سے تو بہت پرانی وابستگی ہے۔''

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ ریحان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میرا کیا، کسی کا بھی ہاتھ نہیں۔ اس کی موت آئی تھی، وہ مر گیا۔ خوامخواہ اس کی موت کے ذمے دار کسی اور کو ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔''

میں نے واضح طور پر منظوراں پر اپنا شک ظاہر نہیں کیا تھا۔ یہ تو ایک تکنیک تھی جس پر عمل کر کے سامنے والے سے مفید باتیں اگلوائی جا سکتی تھیں۔ میں نے منظوراں کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں کہا۔ ''تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ ریحان اپنی موت مرا تھا؟''

''سب اپنی موت ہی مرتے ہیں جناب۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''بیماری تو بہانہ بن جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کون سی بیماری ریحان کی موت کا بہانہ بنی تھی؟''

''اسے ہیضہ ہو گیا تھا۔'' منظوراں نے بتایا۔ ''اچانک آدھی رات کو اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس نے خون کی الٹیاں کیں اور صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مر گیا۔''

میں اچھل پڑا۔ منظوراں نے انتہائی سادگی سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ مجھے اپنے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ ابھی تک صرف ریحان کی الٹیوں کا ذکر ہوتا رہا تھا۔ خون کی الٹیوں والی بات پہلی مرتبہ سامنے آئی تھی۔

''کیا کہا تم نے؟'' میں نے مضطراری انداز میں پوچھا۔ ''ریحان کو خون کی الٹیاں ہوئی تھیں؟''

وہ گھبرا گئی۔ تاہم اس نے اپنے کہے ہوئے الفاظ سے انحراف نہیں کیا اور تصدیقی انداز میں بولی۔ ''جی، تھانے دار صاحب! ریحان نے جو الٹیاں کی تھیں ان میں خون کی اچھی خاصی مقدار شامل تھی۔''

منظوراں کے انکشاف نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انسان کے منہ سے خون صرف دو تین صورتوں ہی میں آتا ہے یا تو وہ معدے کے السر میں مبتلا ہو، یا پھر ٹی بی کے آخری اسٹیج پر ہو یا پھر اسے زہر دیا گیا ہو۔ منظوراں نے خون والی الٹیوں کی بات کر کے مجھے ذہنی طور پر بہت زیادہ مصروف کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''منظوراں! تم تو کافی عرصے سے اس گھر میں ریحان کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ذرا سوچ کر بتاؤ، وہ پیٹ کی کسی تکلیف میں مبتلا تو نہیں تھا؟''

''کس قسم کی تکلیف جناب؟''

''وہ اپنے پیٹ میں درد اور سینے میں جلن بتاتا ہو؟''

''نہیں جناب! اس نے تو کبھی ایسی شکایت نہیں کی تھی۔''

السر کا امکان رد ہو گیا تو میں نے دوسرے زاویے سے سوال کیا۔ ''کیا اسے کھانسی رہتی تھی۔''

منظوراں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''سینے میں کوئی تکلیف بتاتا ہو؟''

''کبھی نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

گویا ٹی بی وغیرہ کا شک بھی جاتا رہا۔ اب آ جا کر صرف ایک ہی طرف دھیان جاتا تھا کہ اسے کوئی سریع الاثر زہر دیا گیا ہو۔ میں نے اِتمامِ حجت کے طور پر منظوراں سے پوچھا۔

''کیا ریحان نے اپنی موت سے پہلے بھی کبھی خون کی قے کی تھی؟''

''مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں۔'' سوچتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے، وہ واقعہ پہلی مرتبہ پیش آیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا ریحان بہت زیادہ کھانا کھانے کا عادی تھا؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں جناب۔'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بس وہ بھی اتنا ہی کھاتا تھا جتنا عام طور پر باقی لوگ کھاتے ہیں۔''

منظوراں کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ نجیب نے مجھے بتایا تھا کہ ریحان کھانے پینے کا بہت شوقین تھا اور کئی افراد کا کھانا وہ اکیلا ہی چٹ کر جاتا تھا لیکن منظوراں کا بیان اس سے قطعی مختلف تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ نجیب نے ریحان کی خوراک کے بارے میں دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منظوراں غلط بیانی سے کام لے رہی ہو۔

کوئی بھی انسان اس وقت جھوٹ بولتا ہے جب وہ کوئی جرم کرنے جا رہا ہو یا پھر اپنے کیے ہوئے جرم پر پردہ ڈالنا مقصود ہو۔ جو کرنے کا ارادہ ہو وہ تو بتاتا نہ ہو اور جو کچھ وہ بتا رہا ہو وہ اسے کرنا نہ ہو تو پھر دروغ گوئی بہت کام آتی ہے۔

میں نے منظوراں اور نجیب کو خیالات کی ترازو میں تولا تو نجیب کے دروغ گوئی کے روشن امکانات میری نظر کے سامنے آ گئے۔ ایک تو ریحان کی صحت خوش خوراکی والی نہیں تھی، دوسری اس قسم کا جھوٹ بولنے میں منظوراں کا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا تھا جبکہ دوسری جانب نجیب کی ذات شکوک و شبہات کی دبیز تہ میں لپٹی نظر آتی تھی۔ وہ ریحان کی بیوی سے پینگیں بڑھا رہا تھا اور ریحان کی موت کے بعد وہ اس کی بیوی سے شادی بھی کر بیٹھا تھا۔ ان حالات و واقعات میں ذہن ایک ہی طرف جاتا تھا کہ اگر ریحان کی موت زہر خورانی کے سبب واقع ہوئی تھی تو یہ ''کارنامہ'' نجیب کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا، چاہے اس نے یہ کام تن تنہا خود کیا ہو یا اس سازش میں شاہدہ بھی اس کی شریک کار رہی ہو۔

شاہدہ کو نجیب کی شریک حیات بننے کے لیے اس کی شریک کار بننے میں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔''

اس حقیقت تک پہنچنا کہ ریحان کی موت زہر خورانی کے سبب ہوئی تھی یا نہیں، چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں اپنے اعلیٰ افسران سے اجازت حاصل کر کے ریحان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروا سکتا تھا۔

میرے سامنے بیٹھی ہوئی منظوراں سخت پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھ ماہ بعد ریحان کی موت کا مسئلہ کیوں سامنے آ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''منظوراں! مجھ سے وعدہ کرو کہ اس وقت ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے، تم اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کو چھوتے ہوئے بولی۔ ''میری توبہ جو میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی کہوں۔ آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔''

میں نے گھمبیر آواز میں کہا۔ ''زبان بندی میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا!''

وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے اس بات کا پورا شک ہے کہ ریحان کو زہر دے کر ہلاک کیا گیا ہے۔ اس کی طبعی موت واقع نہیں ہوئی۔ میں انشاء اللہ بہت جلد قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت تک تم بالکل خاموش رہو گی اور اس سلسلے میں، اور اگر کبھی تمہاری شاہدہ یا نجیب سے ملاقات ہو تو تم انہیں میرے یہاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی!''

"میں اچھی طرح سمجھ گئی جناب!" وہ یقین دلانے والے انداز میں بولی پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ برا نہ منائیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ہاں، پوچھو۔" میں نے اجازت دینے والے انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں ریحان کو زہر کس نے دیا ہوگا؟"

"جو اس کے زیادہ قریب ہوگا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اور جس پر وہ اندھا اعتماد کرتا ہوگا۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "ایسے تو صرف دو ہی افراد ہیں۔"

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے بتایا۔ "شاہدہ اور نجیب اللہ۔ شاہدہ بیوی ہونے کے حوالے سے ریحان کے بہت قریب تھی اور وہ اپنے دوست نجیب اللہ پر بہت بھروسا کرتا تھا۔"

میں نے گول مول انداز میں کہا۔ "میں بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد حقائق سامنے آجائیں گے۔"

پھر ہمارے درمیان شاہدہ اور نجیب کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ منظوراں نے بڑے واضح الفاظ میں اس بات کی تصدیق کی کہ نجیب دوستی کی آڑ میں شاہدہ سے تعلقات بڑھا رہا تھا۔ ریحان کو ان کی سرگرمیوں کا پتا چل چکا تھا اور شاید کچھ ثبوت بھی اس کے ہتھے لگ گئے۔ مگر کسی تحقیق، تفتیش یا ہنگامہ آرائی سے پہلے ہی وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔

میں نے اس مکان کی فروخت کا قصہ چھیڑا۔ منظوراں نے جو کچھ بتایا اس سے ملک حنیف کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ اس مکان کی ملکیت کا معاملہ خاصا پیچیدہ اور الجھا ہوا تھا پھر اسے نجیب کی پہلی بیوی سلمیٰ سے متعلق کریدنے لگا۔

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "یہ ساری خرابی سلمیٰ ہی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔"

"سلمیٰ کی وجہ سے کیوں؟"

"وہ نجیب کو چھوڑ کر اپنے یار کے ساتھ نہ بھاگ جاتی تو نجیب اس گھر کا راستہ نہ دیکھتا۔"

منظوراں نے بتایا۔ "سلمیٰ کے غائب ہونے کے بعد ہی نجیب اور ریحان کی دوستی میں اضافہ ہوا تھا ورنہ پہلے ان کی دوستی گھر سے باہر تک محدود تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کلی طور پر نجیب ہی کو تو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔ "جو کھیل اس گھر میں کھیلا جارہا تھا اس میں شاہدہ بھی برابر کی قصوروار تھی بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ جب ان کے تعلقات ریحان کے علم میں آگئے تو اسے چاہیے تھا وہ نجیب کا داخلہ گھر میں بند کردیتا لیکن وہ بھی خاموش تماشائی بنا رہا تھا۔ پتا نہیں، اس میں اس کی کون سی مصلحت تھی۔ میں تو ریحان کو بھی قصوروار سمجھتی ہوں۔"

"تم نے ریحان یا شاہدہ کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"میں نے ریحان کو صورتحال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی حرکتوں پر نظر رکھے اور اپنے دوست کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرے۔"

"پھر اس نے ایسی کوئی کوشش کی تھی؟"

"اس نے شاہدہ سے اس بارے میں پوچھا تھا۔" منظوراں نے بتایا۔ "لیکن وہ عیار سرے سے مکر ہی گئی بلکہ اس نے تو الٹا ریحان پر چڑھائی کردی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ریحان نے اس کے کردار پر شک ظاہر کرکے اس کی بےعزتی کی ہے۔ وہ تو نجیب کو اپنا بھائی سمجھتی ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا شاہدہ نے واقعی ایسا کہا تھا؟"

"میں جھوٹ کیوں بولوں گی جناب!" وہ سادگی سے بولی۔ "شاہدہ نے یہی الفاظ ادا کیے تھے اور اب دیکھو اس بے غیرت کی نسل کو۔ جس کو بھائی کہتی تھی اب اس کی بیوی بنی بیٹھی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "ریحان کے استفسار پر اگر شاہدہ نے نجیب کو بھائی بتایا تھا تو یقینی طور پر نجیب نے شاہدہ کو بہن کہا ہوگا!"

مزید دو چار باتوں کے بعد میں منظوراں کے گھر سے اٹھ کر آیا۔ وہ گھر جو کسی کا نہیں تھا اور سب کا تھا۔ پانچ مرلے پر مشتمل اس مکان میں دو کمرے اور ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی۔ درمیان میں اچھا خاصا صحن تھا جس میں نیم، شہتوت اور امرود کے پیڑ لگے تھے۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر اسے راز داری برتنے کی تاکید کردی۔

کچھ اسی قسم کی ہدایات میں ملک حنیف کو بھی دے دیا تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ یہ دونوں افراد اس وقت تک اپنی زبانیں نہیں کھولیں گے جب تک میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔

❁❁❁

آئندہ دو روز تک اس معاملے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ میری بھی دیگر مصروفیات اس قدر بڑھی ہوئی تھیں کہ مجھے سر کھجانے کی فرصت نہ مل سکی۔

تیسرے روز اے ایس آئی محمد رفیق نے مجھے نجیب کے بارے میں رپورٹ دی۔ ہم نے جس کانسٹیبل کو نجیب کی نگرانی پر مامور کیا تھا وہ اے ایس آئی کو جواب دہ تھا۔ میں چونکہ گذشتہ دو روز تک بہت مصروف رہا تھا اس لیے اے ایس آئی نے تیسرے روز مجھ سے بات کی۔

"ملک صاحب! یہ بندہ تو بہت محتاط لگتا ہے۔"

"کیوں بھئی، اس نے ایسا کیا کردیا؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

وہ بولا۔ "نجیب لگے بندھے معمولات کے مطابق زندگی گزار رہا ہے حالانکہ آپ سے ملاقات کے بعد اسے پریشان ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ نے ریحان سے ملاقات والی جو بات کہی

تھی وہ ایسی نہیں تھی کہ نجیب پر اس کا کوئی اثر ہی نہ ہوتا لیکن اس اللہ کے بندے کے معمولا پہلے کی طرح جاری ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔''

''کیا معمولات ہیں اس کے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ روزانہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہے۔'' اے ایس آئی نے بتایا۔''اور رات آٹھ ب ڈیوٹی ختم کر کے واپس گھر چلا جاتا ہے مگر اس دوران میں وہ دو تین مرتبہ ڈنڈی بھی مارتا ہے۔''

''کس قسم کی ڈنڈی رفیق؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''اس کی ڈیوٹی تو صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک ہے میں ظاہر ہے وہ کچھ اوور ٹائم بھی کرتا ہوگا لیکن دن میں وہ تین مرتبہ گھنٹے، آدھے گھنٹے کے ڈیوٹی سے غائب ہو کر گھر چلا جاتا ہے۔''

پھر اے ایس آئی نے بتایا کہ نجیب روزانہ دن میں دس بجے، دو بجے اور شام پانچ بجے ڈ چھوڑ کر کچھ وقت اپنے گھر میں گزارتا تھا۔ میں ریلوے ملازمین کی اس عادت سے بخوبی آگاہ خاص طور پر وہ ملازمین جس کے گھر ریلوے اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہ ہوں۔ وہ اس قسم حرکتیں کرتے رہتے تھے اور لنچ وغیرہ تو لازماً اپنے گھر پر ہی کرتے تھے۔ میرے قصبے کا ریلوے اسٹیشن زیادہ مصروف نہیں تھا۔ وہ ایک برانچ لائن تھی اس لیے وہاں سے زیادہ گاڑ بھی نہیں گزرتی تھیں۔ چنانچہ خالی وقت دیکھ کر ٹکٹ کلرک نجیب اللہ اپنی خوب رو بیوی کے پا چلا جاتا ہوگا۔ اس میں حیرت یا پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔''یہ تو اس کے روزمرہ کے معمولات ہو گئے۔ اس علاوہ اس کے بارے میں کوئی خاص بات پتا چلی؟''

اس نے بتایا۔''نجیب اللہ کا تعلق چک جھمرا سے ہے اور شاہدہ اس کی پہلی بیوی نہیں۔ ا کی بیوی سلمٰی ایک سال پہلے اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلمٰی اس کی تایا زاد تھی اور چک جھمرا کی رہنے والی تھی۔''

اگرچہ اے ایس آئی نے سلمٰی کا ذکر کر کے کوئی انکشاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ تا باتیں مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں اس لیے میں نے زیادہ حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ میں اس سے پوچھا۔

''کیا نجیب یا بھگوڑی سلمٰی کے خاندانی پس منظر کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہ میرا مطلب ہے، چک جھمرا کا حال احوال؟''

وہ بولا۔''جناب! اتنی تفصیل میں جانے کے لیے چک جھمرا کا ایک مختصر سا دورہ کرنا پ گا۔''

''تم کل ہی چک جھمرا روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔''گڑے مر

اکھاڑنے کے لیے پھاوڑوں اور بیلچوں کی ضرورت تو پڑتی ہی ہے نا!''

وہ حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔''جناب! آپ کون سے گڑے مردوں کا ذکر کر رہے ہیں؟''

''میں نے یہ بات محاورتاً کہی ہے۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔''دراصل میری بات کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص کو ہم نے ٹارگٹ بنایا ہے اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل اور قابل اعتماد معلومات ہونا چاہئیں۔ ہم نجیب کو اگر شکار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کا پس منظر معلوم ہونا چاہیے۔ اب تم نے بتایا ہے کہ اس کی پہلی بیوی سلمٰی اس کی تایا زاد بھی تھی تو ان کے ماضی کے بارے میں جاننا اور بھی ضروری ہو گیا ہے خاص طور پر اس صورت میں کہ سلمٰی اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔''

اے ایس آئی تائیدی انداز میں سر ہلانے لگا۔

میں نے پوچھا۔''تمہاری اس نگرانی کے دوران میں نجیب نے قصبے سے باہر جانے کی کوشش تو نہیں کی؟''

''بالکل نہیں جناب!'' وہ پورے وثوق سے بولا۔''آفتاب نے اس کی بڑی کڑی نگرانی کی ہے۔'' آفتاب اس کانسٹیبل کا نام تھا جسے ہم نے نجیب کی نگرانی کا ذمہ سونپ رکھا تھا۔

میں نے اے ایس آئی محمد رفیق سے پوچھا۔''اور رات کی کیا خبریں ہیں؟''

اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے وضاحت کی''میرا مطلب ہے، رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک نجیب اپنے گھر میں ہی رہتا ہے یا اس دوران میں بھی وہ کچھ دیر کے لیے گھر سے نکلتا ہے؟''

''یہ جاننے کے لیے تو رات بھر اس کے گھر کی نگرانی کروانا ہوگی۔''

''یہ نگرانی آج ہی سے شروع کروا دو۔'' میں نے کہا۔''مجھے رات میں نجیب کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی پتا چلنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں اس کام کے لیے کانسٹیبل طارق کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ وہ ویسے بھی رات کو دیر تک جاگنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔''

''ہاں، اس کام کے لیے کسی ایسے ہی شخص کی ضرورت ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے اے ایس آئی کو اب تک اپنی کامیابیوں کے بارے میں بھی بتایا۔ جب اسے ریحان کی خون والی الٹیوں کے بارے میں پتا چلا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا پھر گمبھیر لہجے میں اس نے کہا۔

''ملک صاحب! یہ دونوں بہت خطرناک ہیں۔ اگر ریحان کی موت واقعی زہر خورانی سے

واقع ہوئی ہے تو پھر شاہدہ یا نجیب میں سے کوئی ایک اس کا قاتل ہے۔"

"یا یہ بھی ہوسکتا ہے، وہ دونوں اس کے قاتل ہوں۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے مل جل کر ریحان کو اپنے راستے سے ہٹایا ہو۔ ایک ماہ پہلے ہونے والی ان دونوں کی شادی بھی اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ "ملک صاحب! ان خطرناک افراد کو ایک لمحے کے لیے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے۔"

"اسی لیے تو میں نے تمہیں ان کی ڈبل نگرانی کا حکم دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں کل اوپر بات کرنے والا ہوں۔ میں ریحان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کروانے پر زور دوں گا پھر سارا کچا چٹھا سامنے آجائے گا۔"

"ویسے ریحان کی لاش میں تو اب صرف ہڈیاں ہی بچی ہوں گی۔"

"اور یہی ہڈیاں چیخ چیخ کر یہ اعلان کریں گی کہ "حامل ہذا" کی موت کس طرح واقع ہوئی تھی۔ طبعی یا غیر طبعی...... اور اگر غیر طبعی تو اس موت کا سبب کیا ہے؟ زہر خورانی......؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز انداز میں محمد رفیق کی آنکھوں میں دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ پوسٹ مارٹم کس ظالم شے کا نام ہے!"

وہ بڑی ادا سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

❁❁❁

آئندہ روز اے ایس آئی محمد رفیق چک جھمرا نہ جا سکا۔ اس کی چھوٹی بچی کی طبیعت کافی دن سے خراب چلی آرہی تھی۔ صبح جب اس کی حالت زیادہ ہی بگڑ گئی تو اسے سول اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ میں نے از خود رفیق کو چک جھمرا جانے سے روک دیا کیونکہ اسپتال میں اپنی بیٹی کے پاس موجود رہنا اس کے لیے زیادہ ضروری تھا۔

میں تھانے کے ضروری امور نمٹا کر اپنے علاقے کے ایس پی صاحب سے ملنے چلا گیا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ متعلقہ ڈی ایس پی صاحب بھی ایس پی کے دفتر میں اس وقت موجود تھے۔

روح کا ذکر سن کر ایس پی صاحب سنجیدہ ہوگئے اور انہوں نے مجھے تمام واقعات بالتفصیل سنانے کو کہا۔ میں نے الف سے یے تک پوری کہانی اپنے افسران کے گوش گزار کردی۔

ایس پی کافی دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے پھر انہوں نے کہا۔ "بھئی صفدر حیات! یہ روح ووح کا چکر تو اپنی سمجھ سے باہر ہے البتہ......" انہوں نے ذرا توقف کر کے میری آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ "تم نے ریحان علی کی موت کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں خاصی جان نظر آتی ہے، خاص طور پر ریحان کی بیوی اور دوست کے درمیان پائے جانے والے تعلقات کی روشنی میں اور تم نے بتایا ہے کہ شاہدہ نے ایک ماہ پہلے نجیب سے شادی بھی کر لی ہے؟"

"جی سر، بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "کئی افراد اس بات کے گواہ ہیں کہ نجیب اپنے دوست کی زندگی میں اس کی بیوی سے عشق لڑاتا رہا تھا۔"

"اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟" ڈی ایس پی نے ایس پی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جان کی اماں پاؤں تو کچھ عرض کروں" ان کا تکیہ کلام تھا۔ ایس پی صاحب نے خوشدلی سے کہا۔

"جی شاہ جی! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

ڈی ایس پی شبیر شاہ نے کہا۔ "سر! آپ تو روحوں وغیرہ کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے لیکن میں ان پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔ اس قسم کے روحوں سے متعلق بہت سے واقعات خود میرے ساتھ بھی پیش آچکے ہیں۔ میں نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے روحوں کی کرشمہ سازی دیکھی ہے۔" پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔ "صفدر حیات نے ریحان کی روح سے ملاقات کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ میرا خیال ہے، ریحان علی طبعی موت نہیں مرا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کوئی نہ کوئی مذموم کارروائی کی گئی ہے ورنہ اس کی روح صفدر حیات سے رابطہ نہ رکھتی۔ اگر روح نے نجیب کی شکایت کی ہے تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ وہ شخص کسی بھی طور پر ریحان کی موت میں ملوث ہے۔"

اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب نے اپنے ساتھ پیش آنے والے روحوں سے متعلق واقعات کی تفصیل بھی سنا ڈالی۔

ایس پی صاحب نے کہا۔ "اس چکر میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ریحان کی روح نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔ ریحان کا خون کی الٹیاں کرتے ہوئے مرنا اور شاہدہ کا شوہر کی زندگی میں اس کے دوست سے عشق لڑانا ہی کافی ہے۔ اس بنا پر میں تمہیں ریحان کی لاش بالفاظ دیگر اس کی ہڈیوں کا پوسٹ مارٹم کرانے کی اجازت دیتا ہوں۔ اس کام کے لیے جس قسم کی قانونی تیاری ضروری ہو، وہ تم کرلو۔"

اس کے بعد کچھ دیر ہمارے درمیان دوسرے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں پھر میں نے واپسی کی اجازت طلب کرلی جو خوش دلی کے ساتھ دے دی گئی۔

میں ایس پی صاحب کے کمرے سے باہر آیا تو ڈی ایس پی صاحب بھی میرے ساتھ ہی آگئے پھر ہمارے درمیان لگ بھگ آدھے گھنٹے تک موجودہ معاملے پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے روحوں کے معاملات ان کا خصوصی موضوع ہوں۔ وہ گہری دلچسپی سے ایک ایک بات کرید کر مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں پرجوش انداز میں ان سے ہاتھ ملا کر واپس

تھانے آ گیا۔

اپنے افسرانِ بالا سے مشورہ کر کے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریحان کی قبر کو آئندہ روز صبح کھولا جائے اور علاقے کے لوگوں کو اس بارے میں قطعاً کچھ معلوم نہ ہونے پائے۔ ورنہ وہاں ہجوم لگ جاتا اور اڑتی اڑتی یہ خبر نجیب تک پہنچتی تو وہ ہوشیار ہو سکتا تھا۔ ویسے میں یہ کام گورکن کو اعتماد میں لے کر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اگلی صبح میں اپنے ارادے پر عمل نہیں کر سکا۔ گزشتہ رات آخری پہر اچانک بارش شروع ہو گئی۔ صبح تک قبرستان میں اچھی خاصی کیچڑ ہو گئی اور بارش بھی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ بارش میں قبر کو کھولنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور یہ کام آئندہ دن پر رکھ دیا اور خود فی الوقت چک جھمرا کے لیے روانہ ہو گیا۔

چک جھمرا میں میری پوری توجہ نجیب کے خاندان کی طرف مرکوز ہو گئی۔ اے ایس آئی زا... خان کو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اے ایس آئی محمد رفیق کی تحقیق سے مجھے یہ بات معلوم ہو چکی کہ نجیب کی پہلی بیوی سلمیٰ اس کی تایازاد تھی۔ ہم سیدھے نجیب کے تایا کے پاس پہنچ گئے۔

امانت علی چک جھمرا کے ایک نزدیکی گاؤں کا چھوٹا زمیندار تھا۔ اس نے ہمیں عزت سے اپنے گھر میں بٹھایا، ہماری تواضع کے لیے احکام صادر کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ خیریت سے تو آئے ہیں نا؟"

میں نے کہا۔ "امانت علی! میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"کس قسم کی ضروری باتیں؟" وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

"ان باتوں کا تعلق تمہارے سابق داماد نجیب اللہ سے ہے۔" میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔ چہرے کے عضلات کے بگاڑ نے بتا دیا کہ وہ نجیب کے لیے اپنے دل میں نفرت کا سمندر رکھتا تھا۔ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

"ملک صاحب! یہ بدبخت ہمارے لیے مر چکا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تمہارے دلی جذبات ہیں اور میں تمہیں ایسا سوچنے سے روک نہیں سکتا حقیقت یہی ہے کہ وہ زندہ ہے۔"

"وہ زندہ ہو یا مردہ، مجھے اس سے کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔" امانت علی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "جب سے اس نے میری بیٹی پر گھناؤنا الزام لگایا ہے، مجھے اس کی شکل سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب میں اس کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا۔"

وہ ایک باپ تھا۔ سلمیٰ کے حوالے سے یہی مشہور تھا کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور یہ بات مشہور کرانے میں بھی یقیناً نجیب ہی کا ہاتھ رہا ہو گا۔ میں نے امانت علی کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے محتاط الفاظ کا سہارا لیا اور کہا۔

"تمہیں یہ بات کس طرح پتا چلی کہ تمہاری بیٹی سلمیٰ، نجیب کے گھر سے غائب ہے؟"

میں نے "فرار" کو "غائب" کا لبادہ پہنا دیا تھا۔

وہ بولا۔ "یہ لگ بھگ ایک سال پہلے کی بات ہے اور ہم تک یہ اطلاع خود اسی شیطان نے پہنچائی تھی۔"

"نجیب کے لیے تم جس قسم کے الفاظ استعمال کر رہے ہو اس سے پتا چلتا ہے کہ تم اس سے شدید نفرت کرتے ہو؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ غصے سے بولا۔ "ایسے خبیث انسان سے صرف اور صرف نفرت ہی کی جا سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ نجیب تمہارا بھتیجا لگتا ہے؟"

"آپ کو بالکل ٹھیک پتا چلا ہے۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ "وہ میرے چھوٹے بھائی شرافت علی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شرافت علی صرف نام ہی کا نہیں بلکہ کردار کا بھی شرافت علی تھا۔ اب وہ زندہ ہے اور نہ اس کی بیوی۔ اللہ دونوں مرحومین کو جنت نصیب کرے اور اس مردود نجیب کے لیے یہ دنیا ہی جہنم بن جائے۔" بات کرتے کرتے وہ جوش میں آ گیا۔ "میں نے شرافت علی کے منہ کو دیکھ کر سلمیٰ کو نجیب سے بیاہ دیا لیکن اس احسان فراموش نے مجھے بہت گہرا دلی صدمہ پہنچایا۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ سلمیٰ اس قسم کا کوئی قدم اٹھائے گی۔ وہ بہت ہی غیرت والی لڑکی تھی۔ پتا نہیں، نجیب نے اس کے ساتھ کیا کیا؟"

آخری جملہ امانت علی نے بڑے حسرت ناک انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "امانت علی! میں تمہاری دلی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں اس لیے اگر تمہیں میرا کوئی لفظ سخت محسوس ہو تو نظر انداز کر دینا۔ میں اپنے فرض سے مجبور ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ نجیب کے بارے میں کس قسم کی تفتیش کر رہے ہیں؟"

"میں اس کا خاندانی پس منظر، کردار اور اعمال کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہا ہوں۔ ایک خاص معاملے میں مجھے ان چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"اور یہ خاص معاملہ کون سا ہے؟" اس نے سوال کیا۔ "کیا اس کا تعلق میری بیٹی سلمیٰ سے تو نہیں۔"

"فی الحال تو نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن ممکن ہے، آگے چل کر کوئی تعلق نکل آئے۔"

وہ دونوں ہاتھوں کو انکاری انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! خدا کے واسطے میری بیٹی کے معاملے کو نہ اچھالیں۔ جو نقصان اٹھانا تھا، وہ ہم اٹھا چکے۔ مزید بے عزتی اور چرچا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ جہاں بھی ہے، اللہ اسے خوش رکھے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے سلمیٰ کے حوالے سے نجیب کے بیان پر یقین نہیں کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

سلمٰی اس قسم کا قدم اٹھا ہی نہیں سکتی۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

اولاد کا معاملہ بڑا ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ والدین کی غالب اکثریت انہیں ٹھیک
راست سمجھتی ہے اور ان سے ایسی ویسی کسی بات کی توقع نہیں کرتی اسی لیے جب اس قسم کا
واقعہ سامنے آتا ہے تو ان کے لیے ناقابل یقین ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا۔ ''امانت علی! میں تم سے یہ بحث کرنے نہیں آیا کہ سلمٰی کیا کر سکتی ہے یا
نہیں کر سکتی۔ تم مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ جب تمہیں نجیب کی بات کا یقین نہیں آیا تو تم نے ا
طور پر بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے کیا اقدام کیے؟''

''میں نے اسے اپنے تمام رشتہ داروں کے پاس تلاش کیا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''اس تلاش کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟''

''وہ مجھے کہیں بھی نہیں ملی۔''

''کیا تم نے اس کی گمشدگی کی کوئی رپورٹ وغیرہ بھی درج کرائی تھی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''وہ بات دراصل یہ ہے ملک صاحب، کہ سلمٰی کے غائب ہونے پر نجیب کے الزام
میری مت ہی ماری تھی پھر کسی نے ہمیں سمجھایا کہ تھانے وغیرہ میں جانے کا کوئی فائدہ
ابھی تک تو معاملہ چار آدمیوں میں ہے۔ جب پولیس کچہری ہو گی تو پوری دنیا کو پتا چل
گا، امانت علی کی بیٹی اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں یہ وقت آنے سے پہلے ہی
کے منہ میں چلا جاتا۔ ملک صاحب! میں عزت دار آدمی ہوں۔ اپنی اس قدر بے عزتی برا
کیسے کر سکتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''جناب! پھر یہ بھی تھا کہ سلمٰی
کے گھر سے غائب ہوئی تھی۔ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی اسی علاقے میں درج کرائی
تھی۔ میں یہاں چک جھمرا کے دور دراز گاؤں میں بیٹھا کیا کر سکتا ہوں۔''

''انسان چاہے تو کہیں بھی بیٹھ کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس اس کا عز
اور ارادہ مضبوط ہونا چاہیے۔ خیر......'' میں نے رک کر چند لمحے خاموشی اختیار کی پھر ٹھہ
ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نجیب پر کام تو کر ہی رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بھی اسے ٹٹول کر
لوں گا۔''

وہ حیرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نجیب پر کس قسم کا کام کر رہے ہیں؟''

میں نے اسے اصل معاملات سے بے خبر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا تعلق اس کی بیوی
ہے۔''

''نجیب کی بیوی؟'' وہ اچھل پڑا۔

اس کے ردعمل نے مجھے بتا دیا کہ وہ نجیب کی دوسری شادی سے لاعلم تھا۔ میں نے ایک ایک
لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں اس کی دوسری اور حالیہ بیوی کی بات کر رہا ہوں۔''

''تو کیا اس نے شادی بھی کر لی؟'' اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے بتایا۔ ''ابھی ایک ماہ پہلے اس نے شادی کی ہے۔''

''کس سے، کون ہے وہ؟''

''اس عورت کا نام شاہدہ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور وہ اسی قصبے کی رہنے والی ہے جہاں
کے ریلوے اسٹیشن پر نجیب ڈیوٹی کرتا ہے۔''

وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''اچھا، یہ تو نئی خبر ہے۔ مجھے اس بارے میں پہلے کچھ بھی پتا
نہیں تھا۔''

امانت علی نے پوچھا۔ ''شاہدہ کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں؟''

''بس ابھی اتنا ہی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مزید معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔
شاہدہ کے بارے میں بھی اور نجیب سے متعلق بھی۔''

وہ بولا۔ ''آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ آپ کی تفتیش و تحقیق کا تعلق براہ راست
نجیب کی بیوی شاہدہ سے ہے، پھر آپ نجیب کے بارے میں کیوں چھان بین کرتے پھر رہے
ہیں اور اس جستجو میں یہاں میرے پاس بھی چلے آئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں جس گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں لگا ہوں اس میں شاہدہ اور نجیب کے
کردار ملوث ہیں۔ جب مجھے پتا چلا کہ نجیب کی یہ دوسری شادی ہے اور ایک سال پہلے اس کی
بیوی سلمٰی اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو میں سلمٰی اور نجیب کے پس منظر سے آگاہ
ہونے کے لیے چک جھمرا آیا ہوں لیکن آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ اس کے سراسر برخلاف ہے
جو نجیب نے مشہور کر رکھا ہے۔ خیر، دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔''

امانت علی نے کہا۔ ''ملک صاحب! میں نے آپ کو وہی کچھ بتا دیا ہے جو حقیقت ہے۔
میری سلمٰی اس قسم کی حرکت ہی نہیں کر سکتی۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے خلوص دل سے کہا۔

اس نے کہا۔ ''ملک صاحب! کیا آپ مجھے اس گتھی کے بارے میں کچھ بتائیں گے جس کو
آپ سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

''ابھی نہیں۔'' میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ''ویسے بھی اس معاملے کا تم سے براہ راست
کوئی تعلق نہیں۔''

وہ سمجھ دار تھا اس لیے اس نے ضد نہیں کی۔ میں تھوڑی دیر بعد اس کے گھر سے نکل آیا۔
امانت علی سے ملاقات کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک مہذب اور شریف النفس انسان تھا۔

ہر شریف انسان کی طرح وہ بھی تھوڑا سا بزدل تھا اور عزت بے عزتی کے چکر میں وہ بیٹی کی گمشدگی پر خاموش ہو کر بیٹھ گیا تھا ورنہ اس کی جگہ کوئی جوشیلا یا پھڈے باز شخص ہوتا تو بہت اودھم مچاتا۔ سلمٰی کی تلاش کے لیے تو وہ پولیس کی مدد لیتا ہی، اس کے ساتھ ساتھ وہ نجیب کی زندگی بھی اجیرن کر دیتا۔

امانت علی سے ملاقات کے بعد یہ تو معلوم ہو گیا کہ دنیا میں اس کا اور کوئی نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے کہیں آنے جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ اب میں با آسانی اسے ٹارگٹ بنا کر ریحان والے معاملے کو حتمی شکل دے سکتا تھا۔

جب ہم واپس تھانے پہنچے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

❁❁❁

آئندہ روز میں نے ریحان کی قبر کھلوا کر اس کی لاش کی باقیات کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ دوسرے دن ایک سنسنی خیز رپورٹ مجھے پڑھنے کو مل گئی۔ ریحان کی مبینہ روح کا اشارہ اور میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ پوسٹ مارٹم میں واضح الفاظ میں یہ بتایا گیا تھا کہ ریحان کی موت زہر خورانی کے سبب واقع ہوئی تھی۔ اسے کھانے پینے کی کسی شے میں ایک سریع الاثر زہر دیا گیا تھا۔

اے ایس آئی محمد رفیق نے موجودہ صورت حال سے آگاہ ہوتے ہی مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! ہمیں فوری طور پر ان دونوں کو گرفتار کر لینا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''نجیب اللہ کے گھر چلنے کی تیاری کرو۔''

اے ایس آئی نے کہا۔ ''ملک صاحب! کیوں نہ ہم رات ہونے کا انتظار کر لیں۔ اس وقت وہ دونوں گھر ہی ملیں گے!''

''دونوں کو الگ الگ جگہ سے بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کسی انتظار کی ضرورت نہیں۔ ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پہنچو اور نجیب اللہ کو گرفتار کر کے تھانے لے آؤ۔ میں شاہدہ کی گرفتاری کے لیے ان کے گھر جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' اے ایس آئی نے کہا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

اس وقت دوپہر ہو چکی تھی۔ اے ایس آئی زمان نے مجھے بتایا کہ نجیب اللہ دوپہر دو بجے ایک چکر گھر کا لگاتا تھا۔ اس سے پہلے وہ دس بجے گھر آتا تھا۔ یہ اس کے درمیان کا وقت تھا اس وقت ایک بجنے والا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ رفیق کو ریلوے اسٹیشن پر ہی مل جائے گا۔

فوری تیاری کے بعد میں اور اے ایس آئی اپنے اپنے مشن پر روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے

ساتھ ایک ہوشیار اور چابک دست قسم کے کانسٹیبل کو بھی لے لیا۔ اس کانسٹیبل کا نام افتخار حسین تھا۔ ریلوے کے وہ رہائشی کوارٹرز اسٹیشن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ان کا طرز تعمیر خاصا پرانا تھا۔ ہمیں جس کوارٹر کے دروازے پر دستک دینا تھی اس کا نمبر ایک سو تراسی، بی تھا۔ یہ تین کمروں پر مشتمل ایک بنگلا نما کوارٹر تھا۔

ابھی ہم ان کوارٹرز کے قریب نہیں پہنچے تھے کہ مجھے کانسٹیبل آفتاب کی جھلک دکھائی دے گئی۔ وہ کوارٹر کی نگرانی پر مامور تھا۔ دن میں اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ رات کو اس کی جگہ کانسٹیبل طارق سنبھال لیتا تھا۔

آفتاب نے ہمیں اپنی جانب آتے دیکھا تو ہمارے پاس چلا آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا خبریں ہیں بھئی؟''

وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ''سر جی! آج تو دونوں گھر پر ہی ہیں۔''

''گھر پر ہیں، کیا مطلب؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''کیا پہلے وہ دونوں گھر سے باہر ہوتے ہیں۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں جی، میرا یہ مقصد نہیں تھا اس کی بیوی تو گھر پر رہتی ہے مگر نجیب تو روزانہ ڈیوٹی پر جاتا تھا۔''

''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نجیب ڈیوٹی پر نہیں گیا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس وقت وہ دونوں اندر کوارٹر میں موجود ہیں!''

''جی، جی۔ بالکل یہی بات ہے۔'' وہ جلدی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کوارٹر کے سامنے پہنچ کر تھوڑی دیر تک تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ کوارٹر کی عمارت خاصی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ کئی سالوں سے اس پر رنگ و روغن نہیں کیا گیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ بڑی شان والی عمارت رہی ہو گی مگر اب بوسیدگی کا نمونہ بن کر رہ گئی تھی۔

کوارٹر کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی اس لیے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا کہ دروازے کے پیچھے ایک کشادہ صحن موجود ہے۔ کوارٹر کی اصلی عمارت اس کے بعد آتی تھی۔ میں نے چوبی دروازے پر دستک دے دی۔

پہلی دستک رائیگاں گئی تو کانسٹیبل افتخار حسین نے بڑے دھواں دھار انداز میں دروازے کو پیٹ ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد کوارٹر کے اندر سے کچھ آوازیں آئیں۔ وہ کسی کے قدموں کی آوازیں تھیں۔ کوئی اندرونی کمرے سے چل رہا تھا۔ میں نے باؤنڈری وال سے جھانک کر اندر دیکھا، اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھل گیا اور کھلے ہوئے دروازے میں، میں نے ایک حسین و جمیل چہرے کو دیکھا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ یقینی طور پر شاہدہ تھی۔ میں اس کی دلکشی اور حسن کے قصے سن چکا تھا۔

دروازے پر نمودار ہونے والا وہ چہرہ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی پریشان ہو گیا۔ میں نے وضاحت سے اس کا رنگ بدلتے دیکھے۔ مجھے افسوس ہوا جیسے وہاں کوئی گڑبڑ ہو۔ میں نے آواز بلند کہا۔

"بی بی! دروازہ کھولو۔ میں نجیب سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے وہ اندر کی جانب دوڑ لگا دے گی مگر اس نے میرے احساس کی تصدیق نہیں کی اور یک ٹک وہیں کھڑی میری جانب دیکھتی رہی۔ اس کے دیکھنے میں حیرت سے زیادہ خوف شامل تھا۔ اس کا سبب فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں اس یونیفارم میں تھا اور پولیس والوں کو دیکھ کر لوگ گھبرا ہی جاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ہوں۔ دروازہ کھولو یا پھر نجیب کو باہر بھیجو۔ میں اس سے چند باتیں کر کے واپس چلا جاؤں گا۔"

وہ چند لمحے تذبذب کی کیفیت میں رہی۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی طرف سے جواب آیا۔

"میں اس وقت گھر میں اکیلی ہوں اس لیے دروازہ نہیں کھول سکتی۔ آپ کو نجیب سے کیا کام ہے؟"

"کام جس سے ہے اسی کو بتایا جا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "تو پھر آپ ریلوے اسٹیشن پر چلے جائیں۔ نجیب آپ کو وہاں مل جائے گا۔ آپ لوگوں کو گھر میں آنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ نجیب نے مجھے سختی سے منع کر رکھا ہے۔"

میں نے تصدیق طلب نظر سے کانسٹیبل آفتاب کی طرف دیکھا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ آج نجیب گھر سے نہیں نکلا اور شاہدہ کا کہنا تھا کہ وہ ہمیں اسٹیشن پر مل جائے گا۔ کانسٹیبل نے میری نگاہ کا مطلب سمجھ لیا، جلدی سے بولا۔

"سر جی! یہ جھوٹ بولتی ہے۔ نجیب ابھی تک گھر سے نہیں نکلا۔" کانسٹیبل نے آواز خاصی دھیمی رکھی تھی۔

میں نے شاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم ابھی ریلوے اسٹیشن ہی سے آ رہے ہیں۔ نجیب تو وہاں ہمیں نہیں ملا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ آج ڈیوٹی پر نہیں آیا۔"

"پتا نہیں، پھر وہ کہاں چلا گیا۔" شاہدہ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے تو مجھے بھی بتا کر گیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن جا رہا ہے!"

میں نے شاہدہ کو خاصا بے قرار محسوس کیا۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے اشارہ دے رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے کہا۔ "وہ صبح کتنے بجے گھر سے گیا ہے؟"

"وہ روزانہ آٹھ بجے گھر سے نکلتا ہے۔"

"میں روزانہ کی نہیں آج کی بات کر رہا ہوں؟"

"آج بھی وہ اتنے بجے ہی اسٹیشن گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ڈیوٹی کے دوران میں بھی گھر کے چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کا پہلا چکر دس بجے، دوسرا چکر دو بجے اور تیسرا چکر پانچ بجے لگتا ہے۔ اس وقت ایک بج رہا ہے۔ کیا اس نے صبح دس بجے والا چکر لگایا تھا؟"

میری بیان کردہ اس تفصیل نے اسے الجھا دیا۔ وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آ...... پ...... کو اتنی باتیں پتا ہیں!"

"مجھے اس سے بھی زیادہ باتیں معلوم ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب تم شرافت سے میرے سوال کا جواب دو ورنہ میں سختی پر مجبور ہو جاؤں گا۔"

اس نے بتایا۔ "آج نجیب نے دس بجے والا پھیرا نہیں لگایا۔"

"تمہیں اس سے تشویش نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔ "کبھی کبھار وہ زیادہ کام کی وجہ سے ایسا نہیں کر پاتا۔"

میں نے کہا۔ "زیادہ اور کم کام کا مسئلہ نہیں۔ وہ تو آج ڈیوٹی پر گیا ہی نہیں۔"

وہ اضطراری انداز میں بولی۔ "اب تو مجھے بھی فکر ہونے لگی ہے۔ پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے؟"

اس کی فکرمندی میں مجھے بناوٹ نظر آئی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "وہ کہیں نہیں گیا۔ ادھر ہی گھر کے اندر موجود ہے۔ تم اسے باہر بھیج رہی ہو یا ہم اندر آ جائیں؟"

"دیکھیں، میں نے آپ کو بتایا ہے کہ نجیب گھر میں نہیں۔" وہ کمزور لہجے میں بولی۔ "اور میں اس وقت گھر میں بالکل اکیلی ہوں۔ آپ نے اگر نجیب سے کوئی بات کرنی ہے تو رات کو آ جائیں یا پھر وہ بات مجھے بتا دیں۔"

اسی وقت اے ایس آئی محمد رفیق بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے چلتے ہوئے وہاں تک آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی سنسنی خیز خبر لے کر آیا تھا۔ شاہدہ کو اندرونی دروازے میں کھڑے اس نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ اشارہ سے مجھے ایک طرف لے گیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"ملک صاحب! ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" میں نے شاہدہ کی جانب دیکھتے ہوئے اے ایس آئی سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ "نجیب تو آج ڈیوٹی پر گیا ہی نہیں۔"

"یہ بات مجھے معلوم ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "کانسٹیبل آفتاب نے آج اسے کوارٹر سے نکلتے نہیں دیکھا۔"

اے ایس آئی نے کہا۔ ''جناب! ادھر اسٹیشن ماسٹر سے میری بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ نجیب آج سے ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے۔''

''چھٹی پر؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ سرکاری محکموں میں پہلے چھٹی منظور کروانا پڑتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی خاص منصوبے پر کام کر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شاہدہ تو بتا رہی ہے کہ وہ آج صبح حسب معمول ڈیوٹی پر گیا ہے۔''

''ممکن ہے، اس نے اپنی بیوی کو چھٹی کے بارے میں کچھ نہ بتایا ہو۔''

''اس کا تو یہی مطلب ہے کہ وہ اندر موجود ہے۔'' اے ایس آئی بولا۔ ''اور شاہدہ جھوٹ بولا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو کوارٹر کے اندر داخل ہونا نہایت ہی ضروری ہو گیا ہے۔''

ہمارے درمیان یہ باتیں چند سیکنڈ میں ہو گئی تھیں۔ اس دوران میں شاہدہ دروازے میں موجود رہی۔ تاہم اس کے اضطراب اور الجھن میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''شاہدہ بی بی! میں نے ابھی تک شراف کی زبان میں تم سے بات کی ہے۔ اگر تم نے ایک منٹ کے اندر نجیب کو باہر نہ نکالا تو مجبوراً مجھے تھانے دارانہ رویے کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔''

''مم...... میں نے آپ کو بتایا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر گیا ہے۔'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، تم شرافت کی زبان نہیں سمجھو گی۔''

پھر میں نے کانسٹیبلز کو مخصوص اشارہ کیا۔ آفتاب اور افتخار پلک جھپکتے میں کوارٹر کی باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر پہنچ گئے۔ اگلے ہی لمحے لکڑی کا دروازہ کھل چکا تھا۔ میں نے کوارٹر کے صحن میں داخل ہوتے ہوئے شاہدہ کو گھر کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے دیکھا تو اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

وہ کوارٹر کے عقبی دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے قابو کر کے ہتھکڑی پہنا دی۔ اس دوران میں اے ایس آئی محمد رفیق اور دونوں کانسٹیبلز پورے کوارٹر کی تلاشی لینے میں مصروف ہو چکے تھے۔ تین منٹ کے اندر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کوارٹر میں شاہدہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نجیب پورے کوارٹر میں کہیں بھی نہیں پایا گیا۔

میں نے گھوم پھر کر تنقیدی نگاہ سے کوارٹر کا جائزہ لیا۔ میں باہر سے اس کوارٹر کو دیکھ چکا تھا اندر سے یہ اتنا بوسیدہ اور خستہ حال نہیں تھا جیسا باہر سے نظر آتا تھا۔ کوارٹر کا صحن اچھا خاصا کشادہ تھا۔ داخلی چوبی دروازے کے پاس کچے صحن میں ایک نیم کا درخت لگا تھا۔ اس کوارٹر میں

کل تین کمرے تھے۔ صحن کے بعد ایک کمرا تھا جس کے دروازے میں شاہدہ نمودار ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک کشادہ اور ہوادار کمرا تھا پھر بائیں جانب ایک لمبوترا کمرا تھا جسے ان لوگوں نے اسٹور روم بنا رکھا تھا۔ اسی اسٹور روم سے ایک دروازہ عقبی جانب کھلتا تھا۔ کوارٹر کے عقب میں بھی ایک چھوٹا سا لان تھا جس کے گرد خاردار جھاڑیوں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ کوارٹر کے کمرے اونچی چھتوں والے تھے۔ میں نے بھی نجیب کو کوارٹر میں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ وہ واقعی وہاں موجود نہیں تھا۔

ہم شاہدہ کو اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔

❁❁❁

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے شاہدہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس وقت اے ایس آئی محمد رفیق بھی میرے کمرے میں ہی بیٹھا تھا۔ میں نے ہتھکڑی لگی شاہدہ کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ تھوڑی ہچکچاہٹ کے بعد بیٹھ گئی۔ میں خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔

اس کا قد پانچ فٹ کے قریب ہو گا۔ عمر کا اندازہ میں نے تئیس اور چوبیس کے درمیان لگایا۔ اس کی خوبصورت اور پرکشش آنکھوں میں چالاکی کی چمک تھی۔ میں نے جب غور سے اس کے حسن کا نظارہ کیا تو اس کے بارے میں سنی ہوئی اب تک تمام باتیں مجھے حقیقت نظر آنے لگیں۔ وہ واقعی بہت حسین اور جاذب نظر عورت تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں اور انداز میں ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ وہ سامنے والے سے اپنی بات منوانے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی خصوصاً صنف مخالف سے۔ شاہدہ کا شمار ان عورتوں میں کیا جا سکتا تھا جو مردوں کو اپنے اشاروں پر نچانے کا ہنر جانتی ہیں۔

مجھے اپنی جانب بغور دیکھتے پا کر وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ نے مجھے گرفتار کیوں کیا ہے اور اس طرح گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میرے تھانے میں ملزموں کو سوال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تم صرف میرے سوالوں کا جواب دو گی۔''

''آپ مجھے ملزم کیوں کہہ رہے ہیں۔ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگی۔ ''میں نے کیا کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم نے اتنا کچھ کیا ہے کہ اس پر تم سے تفصیلی بات ہو گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ ہمیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر تم نے فرار ہونے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''پولیس کو دیکھ کر ہر شریف آدمی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔'' اس نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ زبردستی میرے گھر میں گھس رہے تھے۔ میں فرار نہ ہوتی تو کیا کرتی۔''

میں نے اسے گھورا اور سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں دروازہ کھولنے کے

لیے کہا تھا جب تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو ہمیں مجبوراً اندر آنے کے لیے دوسرا طریقہ اپنانا پڑا۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کیا۔ "اور تمہاری یہ بات بھی درست نہیں کہ شریف لوگ پولیس کو دیکھ کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ صرف مجرم ہی پولیس سے گھبراتے ہیں اور اس کے سامنے آنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ تم جس طرح اپنے گھر کے عقبی دروازے سے فرار ہو رہی تھی اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ تم کسی نہ کسی جرم میں ملوث ہو؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے نجیب کے بارے میں غلط بیانی کیوں کی۔"

"میں نے کوئی جھٹ نہیں بولا تھا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔ "میں نے آپ لوگوں کو یہ بتایا تھا نا کہ نجیب گھر میں نہیں پھر تم لوگوں نے گھر کی تلاشی لی تو کیا نجیب آپ کو ملا؟ نہیں ملا نا دیکھا، میں نے سچ بولا تھا نا؟"

وہ مکاری سے کام لے کر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک ملزم کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کا اسٹائل اپنے اندر ایک جارحانہ پن رکھتا تھا یہ انداز اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "شاہدہ! تم بہت زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش کر رہی ہو مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ میں عورتوں کو سخت قسم کی تفتیش سے گزارنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"میں نے کیا چالاکی دکھائی ہے تھانے دار صاحب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ تلاشی کے دوران میں تمہارے گھر سے نجیب ہمیں نہیں ملا میں تمہارے دوسرے جھوٹ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ جھوٹ جو تم نے کہا تھا نجیب صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔"

"اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے۔" وہ آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی۔ "نجیب واقعی آٹھ بجے ڈیوٹی پر گیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے تم سے سختی کے ساتھ پیش آنا ہوگا!" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "شاہدہ! میں ریلوے اسٹیشن پر جا کر یہ معلوم کر چکا ہوں کہ نجیب آج سے ایک ہفتے چھٹی پر ہے۔ اسٹیشن ماسٹر کے مطابق وہ آٹھ دن کے بعد ڈیوٹی پر آئے گا...... اور تم کہہ رہی وہ حسب معمول ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔ تم میں سے کوئی ایک جھوٹا ہے۔ تم یا اسٹیشن ماسٹر! اسٹیشن ماسٹر کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی فائدہ۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا۔ اس میں تمہارا کیا فائدہ تھا؟"

میں شاہدہ اور نجیب کے تعاقب میں ریحان علی کی وجہ سے تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ۔ تو یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ریحان کی موت زہر خورانی سے واقع ہوئی تھی۔ اسے یہ زہر شاہدہ نے

تھا یا نجیب نے یا دونوں کی ملی بھگت سے وہ شریف بندہ موت کے منہ میں چلا گیا تھا یہ مجھے معلوم کرنا تھا لیکن نجیب کے غیاب اور شاہدہ کی دروغ گوئی مجھے ذرا مختلف انداز میں تفتیش پر اکسا رہی تھی۔ میں فی الحال ریحان کو چھوڑ کر شاہدہ اور نجیب کی تازہ ترین حرکتوں کا تجزیہ کر رہا تھا تاہم میں اپنے اصل مقصد کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔

میرے پوچھتے ہوئے سوال کے جواب میں شاہدہ نے بتایا۔ "تھانے دار صاحب! میں یہ تو نہیں کہتی کہ اسٹیشن ماسٹر جھوٹ بول رہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے نجیب کی ایک ہفتے والی چھٹی کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔"

اس کی آنکھوں میں چال بازی کے تاثرات چمک رہے تھے۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "تم اس کی بیوی ہو۔ چھٹی والی بات اتنی اہم ہے کہ تم سے چھپ نہیں سکتی تم خوامخواہ جھوٹ بول کر اپنے لیے مصیبتیں کھڑی کر رہی ہو۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ نجیب نے دانستہ چھٹی والی بات مجھ سے چھپائی ہو۔"

"ہونے کو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "لیکن تمہاری اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ نجیب نے تم سے چھٹی والی بات چھپائی ہوگی۔ اگر اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لی ہے تو یقیناً وہ تمہارے ساتھ کہیں جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا ہوگا۔ ابھی ایک ماہ پہلے تم لوگوں نے شادی کی ہے۔ وہ تمہیں اس ویران کوارٹر میں اکیلے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ "جو سچ ہے وہ شرافت سے بتا دو ورنہ تمہارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا ہو جائے گا شاہدہ!"

وہ اندازہ لگانے والے اسٹائل میں مجھے دیکھنے لگی۔ شاید وہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ مجھ سے کس حد تک کھل کر بات کرے۔ چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد اس نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! پتا نہیں، آپ کو میری بات کا یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میں سولہ آنے سچ کہہ رہی ہوں کہ نجیب نے مجھے ایک ہفتے کی چھٹی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے معمول کے مطابق ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔"

"مجھے تمہاری بات کا یقین اس لیے نہیں آ رہا کہ تم احمقانہ بات کر رہی ہو۔" میں نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں نے پسند کی شادی کی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نجیب ایک ہفتے کی چھٹی لے اور تمہیں نہ بتائے۔ وہ آج ڈیوٹی پر نہیں پہنچا۔ گھر میں بھی نہیں ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ وہ کہاں گیا ہے۔ مجھے اس وقت نجیب کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں تشویش دکھائی دی، الجھن زدہ لہجے میں اس نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! یہ بھی تو ہوسکتا ہے، نجیب اپنے ماں باپ

سے ملنے چک جھمرا چلا گیا ہو!''

''اور تمہیں بتائے بغیر؟'' میں نے زہرخند انداز میں کہا۔ ''ایک یتیم و یسیر شخص ا
والدین سے ملنے چک جھمرا کس طرح جا سکتا ہے۔ مرحومین سے ملاقات کے لیے تو کسی ا
جہاں کا سفر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کیا سمجھیں؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ اپنے چور تاثرات کو چھپانے کی کوشش کر
ہوئے بولی۔ ''یہ...... یہ آپ کیا...... کہہ رہے ہیں۔ نجیب کے ماں باپ کا انتقال ہو چکا ہے؟''

''کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟''

''نہیں، نجیب نے کبھی ایسا ذکر نہیں کیا۔''

''میں نے کہا۔ ''تم دونوں نے ایک ماہ پہلے ایک دوسرے کو اپنا رفیق حیات بنایا۔ تمہیں اتنی بات تو معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے ساتھی کے والدین زندہ ہیں یا مرحوم ہو ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے تائیدی انداز میں بولی۔ ''نجیب صرف مجھے اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے والدین چک جھمرا میں رہتے ہیں اور ہم ایک ہفتے کے ان سے ملنے......''

اچانک وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس ڈانواں ڈول چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''...... جا رہے ہیں۔ اسی مقصد کی خاطر نجیب اپنے محکمے سے ایک ہفتے کی چھٹی بھی لی ہے...... تم یہی بتانے جا رہی تھی نا؟''

اسے اچھی طرح محسوس ہو گیا کہ وہ ایک سنگین غلطی کر چکی تھی۔ یقینی طور پر وہ نجیب کی ہفتے والی چھٹی سے باخبر تھی۔ نجیب نے اس سے یہی کہا ہو گا کہ وہ چک جھمرا اپنے والدین ملوانے لے کر جائے گا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ نجیب نے اتنا فاش جھوٹ بولا۔ اس کے والدین کا انتقال ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے تایا امانت علی نے تفصیلاً سب کچھ بتا دیا تھا پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ سلمٰی والے واقعے کے بعد نجیب چک رخ کیوں کر سکتا تھا۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو نجیب نے شاہدہ کو کوئی چکر دیا ہے یا پھر مجھ سے غلط بیانی کر رہی تھی مگر کیوں؟ اس غلط بیانی سے وہ کیا حاصل کرنا چاہتی تھی؟''

یہ سوالات میرے ذہن میں بگولوں کی مانند چکرا رہے تھے۔ شاہدہ کی خود اعتمادی میں لگ چکی تھی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے وہ الفاظ پھسل گئے تھے جنہیں وہ چھپانا چاہتی کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ واپس نہیں آتے۔ اسی لیے وہ اپنے پچھتا رہی تھی اور بات کو سنبھالنے کی کوشش میں مزید حماقت کر رہی تھی۔

''آ...... آپ...... میری بات غلط سمجھے ہیں تھانے دار صاحب!'' اس نے بوکھلاہٹ

انداز میں کہا۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔ یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ یقین کریں میں نہیں جانتی نجیب کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور یہ کہ...... اس نے ایک ہفتے کی چھٹی......''

''بس بس۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تم پہلے بھی کئی مرتبہ دہرا چکی ہو...... اور کان کھول کر سن لو کہ میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں۔ تم سیدھی طرح مجھے بتاتی ہو، نجیب کہاں ہے؟ یا میں تمہاری زبان کھلوانے کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کروں؟''

وہ ہراساں نظر سے مجھے اور کبھی اے ایس آئی رفیق کو تکنے لگی۔ محمد رفیق اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ شاہدہ کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت خود کو چاروں طرف سے گھرا محسوس کر رہی تھی۔ میں اس تیز طرار اور مکاری کی پڑیا کی گھبراہٹ سے محظوظ ہونے لگا۔ میں نے شاہدہ جیسی خوبصورت اور پرکشش عورتیں بہت کم دیکھی تھیں۔ وہ ایک ایسی دلکش اور زوردار عورت تھی جس کے حصول کی خاطر کوئی مرد کچھ بھی کر سکتا تھا...... حتیٰ کہ قتل بھی! شاہدہ کو دیکھنے کے بعد مجھے یہ بخوبی اندازہ ہو گیا کہ نجیب اس کے لیے پاگل کیوں ہو گیا تھا۔

وہ چند لمحات خاموش رہ کر کچھ سوچتی رہی پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ آپ کو اس وقت نجیب کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے بتائیں، آپ کو نجیب سے کیا کام ہے؟''

میں نے اس کے ہاتھوں میں موجود ہتھکڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہاری طرح اسے بھی گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔''

''مگر کیوں...... کس جرم میں؟''

''تم دونوں کا جرم ایک ہی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بھونچکا رہ گئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ شدید حیرت کی اداکاری کر رہی تھی گویا دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ پوری دال ہی کالی تھی۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں مجھ سے پوچھنے لگی۔

''ہم نے کون سا جرم کیا ہے تھانے دار صاحب!''

''ننھی بچی مت بنو۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''اپنے جرم کے بارے میں تم اچھی طرح جانتی ہو۔''

وہ ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے بولی۔ ''تو کیا آپ بھی اس انداز میں سوچ رہے ہیں جیسا اس بستی کے اکثر لوگ سوچتے ہیں۔''

وہ ازخود میرے دام میں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''بستی کے اکثر لوگ تمہارے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری محبت نے ریحان کی جان لے لی۔''

''یعنی تمہاری اور نجیب کی محبت؟'' میں نے تصدیق چاہی۔

''جی ہاں، میرا یہی مطلب تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میرا خیال عام لوگوں سے مختلف ہے۔''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی پھر پوچھا۔ ''آپ کا ہماری محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں تمہاری محبت کی نہیں بلکہ ریحان کی موت کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کی محبت کو تو میں محبت ہی نہیں مانتا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟''

''میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''محبت ایک مثبت جذبہ ہے۔ محبت کرنے والے اپنی محبت میں جان دیتے ہیں...... یہ نہیں کہ ایک دوسرے کو حاصل کرنے کے لیے کسی تیسرے کی جان لے لیں۔''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے کس کی جان لی ہے؟''

''ریحان کی...... اور کس کی؟''

''آپ کی سوچ دوسروں سے مختلف نہیں۔''

''بالکل نہیں ہے بی بی۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عام لوگوں کا خیال ہے کہ تم دونوں کی محبت نے ریحان کی جان لے لی لیکن میں سمجھتا ہوں بلکہ مجھے یقین ہے کہ ریحان کو قتل کیا گیا ہے اور قاتل تم دونوں میں سے کوئی ایک یا تم دونوں ہو۔ اب آئی سمجھ میں میری بات کہ میں نجیب کو اتنی شدومد سے کیوں تلاش کر رہا ہوں۔''

اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی جو اس کی شکست کا منہ بولتا ثبوت تھی مگر میں نے دیکھا، وہ ابھی بھی پسپائی اختیار کرنے پر تیار نظر نہیں آتی تھی۔ قدرے توانا لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ریحان کو قتل کیا ہے؟''

اس کے اس سوال میں وہ پہلے والا دم خم نہیں تھا۔ صورتحال کی نزاکت کا اس نے اندازہ لگا لیا تھا تاہم میں اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دوں گا کہ ان حالات میں بھی وہ ڈٹی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میرے وثوق کی بنیاد پوسٹ مارٹم ہے۔''

''پوسٹ مارٹم!'' وہ اس طرح اچھلی جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''ہاں بی بی! پوسٹ مارٹم۔ میں نے ریحان کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا ہے، جس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس بے چارے کو زہر دے کر موت کے

گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کرسی سے گر جائے گی تاہم وہ گری نہیں، گردن جھکا کر اپنے ہتھڑی لگے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ ں کی خاموشی نے مجھے بہت کچھ باور کرا دیا تھا۔

میں اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے اے ایس ئی رفیق کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار صاحب! میں نہائی میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

اس کی آنکھوں میں اضطراب اور حرکات و سکنات میں اچانک بے چینی بھر گئی تھی۔ اب وہ ہلے والی پرسکون اور بااعتماد شاہدہ نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں شافی اطمینان محسوس کیا ر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تنہائی میں مجھ سے جو کچھ کہنا چاہتی ہو وہ یہاں بھی کہہ سکتی ہو۔ یہ اے ایس آئی میرے ہروسے کا آدمی ہے۔''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ سمجھیں ناں! میں آپ کو جو بات بتانا چاہتی ہوں اس کے لیے تیسرے آدمی کی موجودگی مناسب نہیں۔''

پتا نہیں، ایسا کون سا راز فشا کرنا چاہتی تھی جس کے لیے اس قدر رازداری برت رہی تھی۔ م ملزموں یا مجرموں کی فرمائشیں عموماً پوری نہیں کرتے اور بڑے کڑے لہجے میں ان سے بات کی جاتی ہے لیکن خواتین کا معاملہ دوسرا ہے پھر شاہدہ نے کچھ اس انداز میں تنہائی میں بات کرنے کی درخواست کی تھی کہ میں اس کی استدعا پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے اے ایس آئی رفیق کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔

جب ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو شاہدہ نے نیچی آواز میں مجھ سے استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟''

مجھے اس کے سوال پر قدرے حیرت ہوئی تاہم میں نے اسے اپنا نام بتانے کے بعد پوچھا۔

''کیا تمہیں صرف میرا نام پوچھنے کے لیے تنہائی کی ضرورت تھی؟''

''نہیں صفدر صاحب!'' وہ بے تکلفی سے بولی۔ ''بات تو میں کوئی اور کرنا چاہتی ہوں آپ کا نام تو میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ہے۔ صفدر حیات!'' اس نے میرا نام بڑی ادا سے دہرایا اور محبوبانہ انداز میں بولی۔ ''کتنا خوبصورت نام ہے، بالکل آپ کی شخصیت کے مطابق، آپ کے بدن پر پولیس کی وردی خوب سجتی ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میں محتاط ہو گیا۔ میرا اندازہ صد فی صد درست نکلا تھا۔ وہ مردوں کو بے وقوف بنانے کے سینکڑوں گر جانتی تھی۔ میری تعریف کر کے وہ یقیناً مجھ سے کوئی رعایت چاہتی

تھی جس کا بڑا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ ریحان علی کی موت میں بلاواسطہ یا بالواسطہ ملوث ہے
میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ ”میں اپنے بارے میں بخوبی جانتا ہوں۔ تم مطلب کی بات کرو، تنہائی میں مجھ سے کون سی راز کی بات کہنا چاہتی ہو؟“

اس نے جب دیکھا کہ اس کا آزمودہ ہتھکنڈا مجھ پر ناکامیاب رہا ہے تو ذرا کھل کر ادا دکھانے لگی۔ ایسی ادائیں جس سے کسی مرد کا دماغ خراب ہو سکتا تھا اور وہ آنکھیں بند کر کے کے حسن کے جال میں گرفتار ہو سکتا ہے۔

میں نے سخت رویہ اپنانا ضروری سمجھا اور تھوڑی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد دوٹوک الفاظ میں سے کہا۔ ”میرا وقت فالتو ہے اور نہ ہی ان چونچلوں کا میں عادی ہوں۔ تم نے جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو تا کہ میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ سکوں۔“

وہ خاصی مایوس ہوئی اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”آپ کچھ سننا ہی نہیں چاہتے میں کہوں کیا۔“ پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ ”بہر حال میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کو ریحان کی لاش کے پوسٹ مارٹم کا خیال کیسے آیا؟“

میں نے کہا۔ ”اس کام کے لیے ریحان نے خود مجھ سے درخواست کی تھی۔“

”آپ جتنے اچھے نظر آتے ہیں، مذاق بھی اتنا ہی خوبصورت کرتے ہیں۔“ وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی مسکراہٹ پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ”میں تم سے کوئی مذاق نہیں کر رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہارے سابق شوہر نے مجھ سے گڑے مردے اکھاڑنے کی فرمائش کی تھی۔“

میں کسی قسم کی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا تاہم شاہدہ کو میں یہ نہیں بتا سکتا تھا ریحان کی روح نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔

وہ بے یقینی سے بولی۔ ”آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے ماننا ہی پڑے گا کیونکہ میں اس وقت قیدی ہوں...... آپ کی قیدی۔“ اس نے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اور میں قیدی کی مرضی نہیں چلتی، قید کرنے والے کے احکام چلتے ہیں۔“

یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ بڑا معنی خیز انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ اب میں شاہدہ کی رگ رگ سے واقف ہو چکا تھا۔ وہ اپنی اداؤں اور باتوں سے مردوں کو لبھانے کے فن سے آشنا تھی۔

میں نے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ ریحان کو ایک خطرناک زہر دے کر مارا گیا ہے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔ تمہاری یا نجیب اللہ کی...... یا پھر تم دونوں نے مل کر ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟“

اس نے اچانک پٹری بدلی اور عشوہ طرازی سے ہٹ دھرمی کی طرف نکل آئی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے رکھائی سے کہا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ ریحان کو کس نے زہر دیا تھا۔ میں تو بس یہی سمجھتی ہوں کہ اسے ہیضہ ہوا، رات بھر وہ الٹیاں کرتا رہا پھر مر گیا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی......اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں۔“

”جب کہ ایک بیوی ہونے کے ناتے تمہیں اس سے زیادہ کچھ جاننے کی ضرورت تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا اور کہا۔ ”ہیضے سے مرنے والا کوئی شخص خون کی الٹیاں نہیں کرتا!“

”جی...... کیا کہا...... آپ نے......؟“ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے بولی۔

”میں نے کوئی مافوق الخیال اور ناممکن بات نہیں کی بی بی۔“ میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چاچی منظوراں نے مجھے بتایا ہے کہ اس رات ریحان نے خون کی الٹیاں کی تھیں اور ہیضے کے مرض میں خون کی الٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!“

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگی جیسے یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اب اسے مجھے چکر دینے کے لیے کون سی پٹری بدلنا چاہیے۔

میں نے کرخت انداز اپناتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی اس اداکاری و داکاری کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دو۔ میں نے بہت دیکھ لیے تمہارے کھیل تماشے...... اور تم نے یہ بھی بخوبی اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میں تمہاری چال بازیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ اس لیے تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ سچ اگل دو ورنہ تم کو شاید معلوم نہیں کہ پولیس زبان کھلوانے کے کتنے طریقے جانتی ہے!“

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، تم نرمی اور شرافت سے میری بات نہیں سمجھو گی۔ تمہیں تفتیش کے کڑے تجربے سے گزرنا ہی ہو گا۔“

پھر میں نے اے ایس آئی رفیق کو اپنے پاس بلا لیا۔ میرے تیور دیکھ کر شاہدہ بے چین ہو گئی۔ اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو اس وقت اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں مگر شاہدہ خاصے مضبوط اعصاب کی عورت ثابت ہو رہی تھی۔ تاہم وہ اتنا ضرور بھانپ گئی کہ اب میں اس سے کوئی رعایت کرنے والا نہیں ہوں۔

اس نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”ملک صفدر صاحب! آپ میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”میں تفتیش کے نام پر نازک اندام عورتوں کو کسی پرتشدد تجربے سے گزارنے کا قائل نہیں ہوں لیکن جب تم جیسی کسی مجرم عورت سے واسطہ پڑ جائے تو سچ اگلوانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے نا۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ”اس لیے مجرموں کی زبان کھلوانے کے

لیے میں نے کچھ ایسے فارمولے وضع کر لیے ہیں جنہیں تشدد کے خانے میں تو فٹ نہیں سکتا تاہم وہ بڑے موثر ثابت ہوتے ہیں۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی اے ایس آئی رفیق کو دیکھ رہی تھی۔ محمد رفیق سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جی حکم ملک صاحب!''

میں نے کہا۔''بندی پر پانی والا فارمولا آزمانا ہے۔''

''سمجھ گیا سر۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر شاہدہ کی جانب دیکھتے بولا۔''آجاؤ بی بی! تمہاری کچھ خاطر مدارات کی جائے۔''

شاہدہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اے ایس آئی کے ساتھ جائے یا وہیں میرے زبان کھول کر اپنے جرم کا اقرار کر لے۔ مجھے اس کی جرأت کی داد دینا پڑی جب وہ ایک لفظ کہے بغیر اے ایس آئی کے ساتھ ٹرائل روم کی طرف چلی گئی۔

میں جانتا ہوں، اس کی جرأت اس کے لیے فائدہ مند ثابت ہونے کے بجائے ایک بڑا وبال بننے والی تھی۔ پانی والا فارمولا اس کو سچ بولنے پر مجبور کر دیتا۔ دراصل، اس فار کے تحت مجرم کو زبردستی پانی پلایا جاتا ہے۔ اس کی خواہش ہو یا نہ ہو۔ وہ پانی پی سکتا ہو سکتا ہو مگر بہ زور اسے پانی پینے پر مجبور کیا جاتا ہے اور وہ بھی کوئی ایک دو گلاس نہیں، بلکہ دیگرے پانی سے بھرے ہوئے گلاس اس کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آ کہ وہ ایک گھونٹ بھی بھرے تو اسے ابکائی آنے لگتی ہے۔ اس موقع پر تھوڑا وقفہ دے کر ا دوبارہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس فارمولے میں نکتے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مجرم کو خارج کرنے کے لیے باتھ روم جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد کے دباؤ سے جب اس کا مثانہ پھٹنے کے قریب پہنچتا ہے تو وہ کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگ اس موقع پر مجرم سے ہر سچ اگلوایا جا سکتا ہے۔

بعض بزدل اور کم ہمت مجرموں کا وہیں ٹرائل روم ہی میں پیشاب خطا ہو جاتا ہے بہت زیادہ ہمت اور برداشت کے مالک ہوتے ہیں وہ جب اپنی برداشت کو آزمانے کرتے ہیں تو نہ صرف مثانے پر بلکہ گردوں پر بھی دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ وہ شدی تکلیف میں مبتلا ہو کر زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

❁❁❁

میری امید نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

وہ میرے اندازوں کے پورا ہونے کا دن تھا۔ ہم نے شاہدہ کو دوپہر میں گرفتار کیا تھا نے معلوم کر لیا تھا کہ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اور اب لگ بھگ شام ہونے وا

خالی پیٹ پانی فوراً پیشاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک گھنٹے سے چند منٹ پہلے ہی اے ایس آئی محمد رفیق شاہدہ کو میرے پاس لے آیا۔

''ملک صاحب! یہ اقبال جرم کرنا چاہتی ہے۔'' اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے بغور شاہدہ کو دیکھا۔ اس کی حالت دیدنی تھی بلکہ میں کہوں گا، اس وقت وہ مجھے کسمپرسی کی حالت میں نظر آئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے فریاد کی۔

''میں سب کچھ بتا دوں گی، پہلے مجھے باتھ روم میں جانے دیں۔''

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پیٹ کو تھام لیا تھا اور قدرے جھک کر کھڑی تھی میں نے اے ایس آئی کو مخصوص اشارہ کر دیا۔ وہ اسے میرے کمرے سے باتھ روم کی طرف لے گیا۔

اس کے بعد آدھے گھنٹے کے اندر اندر شاہدہ نے اپنا اقراری بیان قلم بند کروا دیا۔ اس نے نجیب کے ساتھ مل کر ریحان کو قتل کرنے کا اقبال کر لیا تھا۔ وقوعہ کی رات نجیب گرما گرم سموسے لایا تھا جس میں سے ایک سموسے کے اندر اس نے خطرناک زہر ملا دیا تھا اور وہی سموسہ نجیب نے ریحان علی کو دیا تھا تاکہ وہ ان دونوں کا راستہ صاف کر دے۔ شاہدہ نے اپنی سازش کو تسلیم کر لیا۔

میں اس کی ساری کتھا سن چکا تو پوچھا۔''اب آخری بات بھی بتا دو...... نجیب کہاں ہے؟''

''وہ ماسی صابراں کے گھر میں ہوگا۔''

''یہ ماسی صابراں کون ہے۔'' میں نے سوال کیا۔''اور اس کا گھر کہاں ہے؟''

شاہدہ نے بتایا۔''وہ اسی بستی میں رہتی ہے۔'' پھر اس نے مذکورہ ماسی کے گھر کا پتا بھی بتا دیا۔

میں نے پوچھا۔''کیا وہ صبح ہی سے صابراں کے گھر میں ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''وہ وہاں کیا کرنے گیا ہے؟''

شاہدہ نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔''نجیب کو اپنی نگرانی کا شک ہو گیا تھا۔ کچھ دن پہلے آپ نے اسے تھانے بلوا کر بھی ریحان کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تھی۔ ریحان چوں کہ ہم دونوں کی باہمی کوشش سے مرا تھا اس لیے ہم اس نگرانی اور پوچھ گچھ سے پریشان ہو گئے مگر ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ آپ ریحان کی لاش کو قبر سے نکلوا کر اس کی چیر پھاڑ بھی کروائیں گے۔''

میں نے کہا۔''یہ بہت ضروری تھا۔ اگر تم شرافت سے زبان نہ کھولتیں تو ممکن ہے، میں پانی والے فارمولے کے بعد کوئی پرتشدد کارروائی بھی کر ڈالتا۔ بہرحال، تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ نجیب ماسی صابراں کے گھر میں کیوں چھپا بیٹھا ہے اور وہ وہاں کب تک روپوش رہنا چاہتا ہے؟''

اس نے بتایا۔''میں نے کہا نا، وہ نگرانی کرنے والے کانسٹیبل کو تاڑ گیا تھا اس لیے وقتی طور پر نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ واپس

گھر آ جائے گا۔"

میں نے اپنے کمرے سے باہر نظر دوڑائی۔ شام کا سماں رات میں بدل رہا تھا، تھوڑی ہی دیر میں اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ اس کا مطلب تھا، اگر اسی ریلوے کوارٹر میں گھات لگائی جاتی تو نجیب بہ آسانی گرفت میں لیا جا سکتا تھا۔

میں نے شاہدہ سے پوچھا۔ "کیا تم اس کی آمد تک اکیلے گھر میں ڈر یا خوف محسوس نہیں کرتیں؟"

میں نے اس حوالے سے نجیب سے بات کی تھی۔" اس نے بتایا۔ "اس کہا تھا، میں پورے کوارٹر کی بتیاں روشن رکھوں اس طرح مجھے ڈر نہیں لگے گا۔ ویسے بھی وہ روزانہ رات آٹھ بجے گھر آتا تھا۔ سردیوں کے موسم میں آٹھ کافی دیر سے بجتے ہیں۔ اس دوران میں، میں کوارٹر میں تنہا ہی ہوتی ہوں۔ اب اگر وہ نو یا دس بجے بھی آتا تو میں کسی نہ کسی طرح رہ ہی لیتی۔ ویسے بھی ایک ہی رات کی بات تھی۔"

"ایک ہی رت کی بات کیوں تھی؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

اب چونکہ وہ پٹری میں آ چکی تھی اس لیے ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دے رہی تھی۔ اس نے بتایا۔ "نجیب نے ایک ہفتے کی چھٹی اسی لیے لی تھی کہ ہم دونوں چند دنوں کے لیے بستی سے کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ہمیں کل علی الصباح یہاں سے روانہ ہو جانا تھا مگر قسمت کی خرابی کہ میں آپ کی گرفت میں آ گئی اور نجیب بھی عنقریب......"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا۔ "کل صبح ہی صبح تم لوگ کس طرف جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔ "نجیب نے کہا تھا، بعد میں بتاؤں گا اور میں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان تھا۔"

"جب کام پریشان ہونے والے کریں گے تو پریشان بھی ہونا پڑے گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم دونوں نے مل کر ریحان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔"

"کون سا ظلم جی!" وہ نحیف آواز میں بولی۔

میں نے کہا۔ "تم نے بے وفا......اور نجیب نے یار مار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ تم لوگوں نے ایک ایسے شخص کو موت کے منہ میں دھکیل دیا جو تم دونوں پر فرداً فرداً بھروسہ کرتا تھا؟"

"وہ تھا اسی لائق!" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "ہماری محبت کا دشمن۔ ہر شخص کو اپنی راہ کے کانٹے چننے کا حق ہے۔ وہ ہمارے درمیان ایک خار کی طرح تھا اور ہر لمحے ہمارے دلوں میں کھٹکتا رہتا تھا۔"

اس کے لہجے میں اپنے سابق شوہر کے لیے نفرت بھری ہوئی تھی۔ میں اپنا مقصد حاصل کر

چکا تھا اس لیے اس آفت کی پرکالہ سے کسی قسم کی بحث کرنا مناسب نہ تھا۔ اس سے کوئی بات کرنا اپنے غصے کو بڑھانے کے مترادف تھا۔ میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

"تم دونوں اول درجے کے بے غیرت اور کمینے ہو۔"

پھر میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ شاہدہ کو حوالات میں بند کر کے فوراً میرے پاس آ جائے۔ پانچ منٹ بعد وہ میرے سامنے موجود تھا۔ "جی ملک صاحب!" میں نے اس سے کہا۔ "ہمیں فوراً نجیب کے کوارٹر پہنچنا ہے۔ تم پانچ منٹ میں اس کی گرفتاری کے لیے مکمل تیاری کر کے مجھے اطلاع کرو۔"

وہ "یس سر" کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد میں اے ایس آئی محمد رفیق اور دو کانسٹیبل نجیب کے کوارٹر پر قابض ہو چکے تھے۔ ہم نے کوارٹر کی تمام بتیاں روشن کر دیں اور شکار کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ شاہدہ نے مجھے بتایا کہ وہ کوارٹر کے عقبی دروازے سے داخل ہوگا مذکورہ دروازہ اندر باہر دونوں جانب سے بہ آسانی کھولا جا سکتا تھا۔ رات کے وقت اس جانب خاصی ویرانی اور سناٹا رہتا تھا۔

میں نے اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل کو کوارٹر کے عقبی دالان کے ایک تاریک گوشے میں تعین کر دیا اور خود دوسرے کانسٹیبل کے ساتھ کوارٹر کے اندرونی حصے میں مستعدی سے نجیب کا انتظار کرنے لگا۔

وہ لگ بھگ نو بجے کوارٹر کے عقبی سمت سے نمودار ہوا۔ اے ایس آئی نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس نے دالان میں داخل ہونے سے پہلے چوکنا نظر سے چاروں طرف دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنے تعاقب کے بارے میں اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحات بعد وہ مطمئن ہو کر عقبی دروازے سے کوارٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر میں اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ جیسے ہی کوارٹر کی عمارت میں داخل ہوا، اے ایس آئی، کانسٹیبل کے ساتھ اس کے پیچھے ہی اندر پہنچ گیا۔ نجیب کے سامنے ہم دونوں موجود تھے۔

خود کو پولیس والوں میں گھرا دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، بے اختیار اس نے چیخ کر مشابہ آواز میں پکارا۔

"شاہدہ......تم کہاں ہو؟"

اس کی آواز نے جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ اے ایس آئی نے میرے اشارے پر عقب سے اس کے دونوں بازوؤں کو قابو کر لیا پھر بجلی کی سرعت سے اسے ہتھکڑی پہنائی تھی۔ وہ مچل کر رہ گیا۔

میں نے اس کے چہرے کے نزدیک اپنا چہرہ لاتے ہوئے خوں خوار لہجے میں دریافت کیا۔ "کس شاہدہ کو آواز دے رہے ہو گدھے کے بچے؟"

"مم......میں......اپنی بیوی شاہدہ......"

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ بندہ سمجھ دار لگتا ہے اس لیے اس بھانپ لیا کہ بساط الٹ چکی ہے۔ میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کر ہوئے کہا۔

”فکر نہیں کرو، میں تمہیں تمہاری بیوی سے ملوانے کے لیے ہی اپنے ساتھ لے کر جا ہوں۔“

”کک...... کہاں۔“ وہ اٹکتے ہوئے بولا۔ ”شاہدہ کہاں ہے؟“

”میرے تھانے کے حوالات میں۔“ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے ”اور تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ تمہاری محبوبہ بیوی نے اقبال جرم کرلیا ہے۔“

”یہ...... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ وہ ہکلایا۔ ”ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟“

ہم دھکیلتے ہوئے اسے کوارٹر سے باہر لے آئے۔ میں نے خالص تھانے دارانہ انداز کہا۔ ”تفصیل تو تمہیں تھانے جا کر ہی بتاؤں گا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ تم دونوں کے لیے پھانسی پھندا تیار ہو چکا ہے۔“

پھر ہم اسے اپنے ساتھ تھانے لے آئے۔ شاہدہ کے اقبال جرم کرنے اور ہماری تحویل ہونے کے سبب نجیب زیادہ ”پھرتی“ اور چالاکی نہ دکھا سکا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ ریحان لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جا چکا ہے اور اب اس کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہیں بچی تو وہ کئی برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ بالآخر اس نے بھی اپنے کالے کرتوت تسلیم کرتے ہوئے ریحان قتل کا اقرار کرلیا۔

ریحان کے قتل والا معاملہ تو ایک کنارے سے جا لگا تھا مگر میرے ذہن کا ایک گوشہ تک اطمینان سے محروم تھا۔ چک جھمرا کے نزدیکی گاؤں میں نجیب کے تایا امانت علی سے ہ والی ملاقات میرے ذہن میں نقش تھی۔ میں نے سلمٰی کے حوالے سے نجیب سے پوچھ گچھ کی مجھے بھی وہی کہانی سنانے لگا جو ایک سال سے اس نے مشہور کر رکھی تھی لیکن میں اس سے ک جاننا چاہتا تھا۔

میں نے نجیب اللہ کو ایک جلاد صفت حوالدار کے حوالے کیا اور اپنا مقصد سمجھاتے ہ اس سے کہا۔ ”میں اس کی زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں۔ اب یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم کی زبان کس طرح کھلواتے ہو۔“

اس حوالدار کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ ٹرائل روم کی جانب سے چند کرب ناک چیخیں ہوئیں نجیب اللہ کو میرے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے اس کے سامنے کوئی تھانے دار نہیں بلکہ ملک الموت کھڑا ہو۔ اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”قتل ایک کیا ہو یا ایک ہزار، پھانسی تو ایک ہی بار لگے گی، پھر میں کوئی بات چھپا کر

کے ہاتھوں کیوں لمحہ بہ لمحہ موت سے زیادہ اذیت سہوں۔“

میں نے طنزیہ انداز میں اس کے سمجھ دار ہونے کی تعریف کی اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔

نجیب کے بیان کے مطابق اس نے اپنی پہلی بیوی سلمٰی کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی لاش کو اس نے کوارٹر کے داخلی دروازے کے قریب اندر کی جانب زمین کھود کر دبا دیا تھا اور اسی مقام پر دوسرے روز اس نے نیم کا ایک پودا بھی لگا دیا جو ایک مضبوط پیڑ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میں نے بھی وہ درخت دیکھا تھا۔

دوسری صبح نجیب کے کوارٹر میں جب نیم کے پیڑ کے نیچے کھدائی کی گئی تو سلمٰی کی ہڈیاں دریافت ہوگئیں۔ ریحان کی روح نے تو صرف نجیب اللہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میں نے نجیب کا تعاقب کیا تو اس کے سارے کرتوت سامنے آ گئے۔ یہ گویا گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہوگی۔

شاہدہ اور نجیب کا جرم بلکہ جرائم اتنے سنگین تھے کہ میں نے ان کے خلاف بہت مضبوط چالان تیار کر کے انہیں حوالہ عدالت کر دیا۔ وہ میرے نزدیک کسی بھی رعایت کے حق دار نہیں تھے۔

شاہدہ اور نجیب نے اپنے کیے کی سزا پالی مگر بے وفائی اور پیٹھ پر خنجر گھونپنے کی داستانیں ان کے ساتھ ختم نہیں ہوگئیں کیونکہ معاشرہ شاہدہ اور نجیب جیسے کرداروں سے خالی نہیں۔ آج بھی آئے روز اس قسم کی کہانیاں سننے کو ملتی رہتی ہیں۔ یہ بہت گمبھیر اور غور طلب مسئلہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی شخص کی بیوی اپنے آشنا کے ساتھ واقعی فرار ہوگئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے، اس عورت کے شوہر نے نجیب والا کردار ادا کیا ہو۔

یہ کہانی یہاں ختم ہوگئی اور مجرم اپنے انجام کو پہنچے مگر ایک خلش تادیر میرے ذہن میں چبھتی رہی۔ میں یہ یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ ریحان کی روح نے اس کیس کی طرف میری توجہ مبذول کرائی تھی۔ میں روح کے وجود کا منکر نہیں ہوں مگر اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ روح ایک لطیف شے ہے جو کسی بھی کثیف شے پر کسی بھی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتی لہٰذا کسی بھی روح کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ میرے گھر کے دروازے پر دستک دے سکتی۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتا اتنا ہی الجھتا رہتا تھا۔ کافی عرصے کے بعد میرا تبادلہ چک جھمرا ہو گیا۔ وہاں میری ملاقات امانت علی سے بھی ہوئی وہ اپنی بیٹی سلمٰی کے قاتل کی گرفتاری کے باعث میرا شکر گزار تھا۔

ایک دن میں ایک سرکاری معاملے کے چکر میں امانت علی کے پاس موجود تھا کہ اچانک ایک شخص کو دیکھ کر میرے وجود میں پھریریاں سی دوڑنے لگیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اسے کبھی بہت قریب اور نہایت ہی پراسرار انداز میں دیکھا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے میرے اور امانت علی کے پاس آیا اور یوں لگا کہ مجھے دیکھتے ہی اس نے وہاں سے روانہ ہونے میں تاخیر نہیں کی تھی۔

”یہ کون ہے بھئی!“ میں نے امانت علی سے پوچھا۔

"میرا بیٹا ہے جی۔" امانت علی نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔

"کیا کرتا ہے تمہارا بیٹا؟" میں نے پوچھا۔

"کرنا کیا ہے جی میلوں ٹھیلوں کا شوقین ہے اور اداکاری و بہروپ بھرنے کے پیچھے دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ خصوصاً اپنی بہن سلمٰی کے غائب ہونے کے بعد سے تو اس کی حالت ہی بگڑ گئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

اس جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ "بہروپ بھرنے کا شوق بھی ہے اسے؟" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آہو جی!" اس نے جواب دیا۔ "کئی سال اس نے اس شوق میں برباد کیے ہیں۔ ہمارے علاقے کے اکثر لوگوں کی نقلیں خوب اتارتا رہتا ہے اور اپنے قد و قامت کے لوگوں کا تو بہروپ بھی بہت شاندار انداز میں اختیار کر لیتا ہے۔"

"ذرا بلائیں تو اسے۔" میں نے امانت علی سے کہا۔

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر مختار...... او مختار" کہہ کر پکارنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہی نوجوان دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔

"اوئے ملک صاحب کو سلام کر۔" امانت علی نے جھڑکنے والے انداز میں اسے ہدایت کی تو اس نے ڈرتے ڈرتے مجھے دیکھا اور پھر ہلکے سے کہا۔ "سلام جی۔"

"وعلیکم السلام برخوردار۔" میں نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے یہ تم بتاؤ۔"

وہ ایک لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "آپ صحیح کہہ رہے ہیں، میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔"

"کب اور کیوں؟" امانت علی نے بے ساختہ پوچھا۔ وہ میرے اور اپنے بیٹے کے انداز پر حیرت زدہ ہو چکا تھا۔ "تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تو پہلے بھی ملک صاحب سے مل چکا ہے۔"

"تو میرا اندازہ درست ہے۔" میں نے پوچھا۔ امانت علی کے سوالوں کا جواب دینا میرے اور مختار دونوں کے لیے بیکار تھا۔

"جی ملک صاحب!" وہ دھیرے سے بولا اور پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحے اسی طرح گزرے پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "ملک صاحب! مجھے پہلے دن سے یقین نہیں تھا کہ میری بہن سلمٰی نجیب کو چھوڑ کر فرار ہو سکتی ہے مگر میں اس کی تردید کرنے کی حیثیت میں نہیں تھا۔ میں تو اسی معاملے کی ٹوہ میں نجیب کے پیچھے تھا اور اسی دوران میں نے نجیب شاہدہ کی پینگیں بڑھتی دیکھ لی تھیں جس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا اس نے سلمٰی کے معاملے میں کوئی نہ کوئی چکر

ضرور چلایا ہوا ہوگا پھر جب اچانک ریحان کی موت ہو گئی تو مجھے سارا کھیل سمجھ میں آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے ان دونوں نے مل کر مارا ہوگا مگر میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آپ سے پہلے اس علاقے کے تھانے دار کو میں نے کچھ اور طریقوں سے بتلانے کی کوشش کی مگر مجھے ناکامی ہوئی پھر آپ وہاں آ گئے تو میں نے ریحان کی روح کا سوانگ رچانے کا سوچا۔ مجھے علم تھا کہ آپ نے ریحان کو نہیں دیکھا ہے لہٰذا صرف اس جیسا نظر آنا ہی کافی ہوگا لہٰذا اس کی موٹی موٹی نشانیاں سجا کر میں نے آپ سے ملاقات کی اور پھر جو ہوا اس سے سب واقف ہیں۔" وہ چپ ہو گیا۔ اپنی بہن کے ذکر پر اس کی آواز قدرے بھرا گئی تھی۔

امانت علی منہ پھاڑے یہ سب سن رہا تھا۔ اس کی تو جو کیفیت تھی وہ تھی مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے دل پر رکھا کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا ہو۔

اس کی روح نمائی ہو چکی تھی جس نے قتل کے ایک کیس کی نشاندہی کر کے اس کے ذمے داران کو قرار واقعی سزا دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہمارے معاشرے کو اس انداز سے بھی سوچنا چاہیے۔ اب ہر کیس میں روح نمائی تو ہونے سے رہی۔ عورت کو الزام دینا ہماری روایت بنتی جا رہی ہے کیونکہ یہ بہت آسان کام ہے...... مگر اس سے بدترین گناہ اور کوئی نہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے بیچ اس مسئلے کے؟

غیرت مند

بات معمولی سی تھی لیکن معمول سے ہٹی ہوئی تھی اس لیے خاص ہوگئی۔ میں اس غیر معمولی دستک کو نظر انداز نہ کر سکا اور بستر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ وہ فروری کے اختتامی دن تھے مگر ابھی تک سردی کا زور باقی تھا، گاؤں دیہات میں ویسے بھی رات جلد اتر آتی ہے۔ ان دنوں سات بجے تک لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہوکر اپنے بستر میں دبک چکے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو بجے تک جاگتے، اس کے بعد دیہات اور دیہاتی ماحول گہرے سناٹے میں ڈوب جاتا۔

اس روز میں لگ بھگ آٹھ بجے تھانے سے اٹھ آیا تھا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے عشا کی نماز ادا کی اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ مجھے نہیں یاد، میں کس وقت نیند کی مہربان آغوش میں جا پہنچا۔

دس بجے آنکھ دستک کی آواز پر کھلی۔ تھوڑے سے وقفے سے دوسری دستک ہوئی اور میں اپنے کمرے سے نکل کر بیرونی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں میرے ذہن میں یہی تھا کہ وہ کوئی کانسٹیبل ہوگا جو کسی فوری ضرورت کے تحت مجھے بلانے آ گیا تھا۔ ان دنوں میری رہائش سرکاری کوارٹر میں تھی جو تھانے ہی کی حدود میں عقبی جانب بنا ہوا تھا۔ رات کے دس بجے تھانے سے آنے والی پکار کا ایک ہی مطلب تھا...... اور وہ یہ کہ کوئی مصیبت کھڑی ہوگئی تھی۔

انہی خیالوں میں چلتے ہوئے میں دروازے تک پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ میں دروازے کی کنڈی گراتا، ایک مرتبہ پھر وہی مخصوص دستک سنائی دی۔ ایک لمحے میں میرے دماغ نے اس خیال کو رد کر دیا کہ دستک دینے والا کوئی پولیس اہلکار ہوگا۔ اس دستک میں ایک نرمی، دھیما پن اور احتیاط پائی جاتی تھی جیسے وہ کسی دست حنائی کی کارفرمائی ہو!

اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ ایک پستہ قامت عورت سفید چادر میں لپٹی میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں، باقی پورا جسم ٹا سے کی وسیع و عریض چادر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی مخصوص چمک اور اضطرار کے باعث اندازہ لگایا کہ وہ عورت تھی۔

''کیا بات ہے بی بی؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت ایک پردہ پوش عورت کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مجھے عجب سا احساس ہوا تھا اور اس احساس میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔ چادر کے پیچھے اس کے ہونٹوں کی جنبش ہوئی اور ایک سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''تھانے دار جی! میں ایک شکایت لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لوگوں کی شکایتیں سننے کے لیے میں پورا دن ادھر تھانے میں بیٹھتا ہوں، تم صبح آ کر مجھ سے مل لینا۔''

مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ ایک تو اتنی رات گئے میرے پاس آئی تھی اور وہ بھی سیدھی میرے کوارٹر کے دروازے پر۔ اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوئی کہ وہ کسی خاص معاملے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ کوئی ہنگامی سلسلہ بھی ہوسکتا تھا۔

میرے جواب نے اسے تھوڑا مایوس ضرور کیا لیکن وہ ہمت نہ ہاری اور بولی۔ ''تھانے دار جی! تھانے میں اور بھی بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ان کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتی۔ اگر سلامو کو پتا چل گیا کہ میں تھانے آئی تھی تو وہ میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دے گا۔''

''یہ سلامو کون ہے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میرا گھر والا جی!'' نقاب کے پیچھے سے اس کا جواب آیا۔ ''نام سلام دین ہے اس کا لیکن بچپن سے بگڑ کر سلامو ہوگیا ہے اور اب تو سب اسے سلامو ہی کہتے ہیں۔''

سر دست میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اپنا کوئی ازدواجی جھگڑا لے کر میرے پاس آئی ہے اور اس معاملے کو مجھ تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ اس حوالے سے میں نے اس سے سوال کیا۔ ''اپنے گھر والے کی شکایت کرنے آئی ہو؟''

''نہیں جی!'' اس نے نفی میں گردن جھٹکی۔ ''میں تو ماکھا کے بارے میں آپ سے بات کرنے آئی ہوں۔ مشتاق عرف ماکھا، سلامو کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''سلامو کا ماکھا سے کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''کوئی خاص نہیں جی۔ بس آپ ان دونوں کو حریف سمجھ لیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالی!'' اس نے بتایا۔ ''اقبال بی بی عرف بالی۔''

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''سلطان پورہ''

سلطان پورہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا اور تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ماکھا بھی سلطان پورہ ہی میں رہتا ہے؟''

''نہ جی!'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلائی۔ ''یہ مردود فرید نگر میں رہتا ہے۔''

میں نے سلطان پورہ اور فرید نگر دیکھ رکھے تھے۔ ان دونوں گاؤں کے درمیان صرف ایک ریلوے لائن تھی۔ اس سنگل ٹریک ریلوے لائن پر لاہور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے لاہور تک ٹرین چلتی تھی۔

اس وقت اچھی خاصی ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ ابھی تک میرے اور بالی کے درمیان دروازے میں کھڑے کھڑے یہی سوال و جواب ہوا تھا۔ اس دوران میں وہ سہمی ہوئی چوکنا نظروں سے بار بار ادھر اُدھر دیکھتی رہی تھی۔ ابھی تک کوئی سنگین بات سامنے نہیں آسکی تھی اس لیے میں نے تسلی دینے والے انداز میں بالی سے کہا۔

''تم فکر نہ کرو، میں تنہائی میں تم سے بات کروں گا۔ میری اجازت کے بغیر کوئی میرے کمرے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ تم صبح تھانے میں آکر مجھ سے ملو۔''

وہ ایک مرتبہ پھر محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! بڑی مشکل سے موقع نکال کر آئی ہوں۔ پھر شاید میں ہمت نہ کر سکوں۔ آج تو اتفاق سے ماکھا کہیں گیا ہوا ہے ورنہ وہ مجھے گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتا۔''

ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں اسے اپنے کوارٹر کے اندر بلا کر اس کی بات سن لوں لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور بالی سے کہا۔

''تمہارا گھر والا کہاں گیا ہوا ہے؟''

''وہ ملی وال گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کی واپسی صبح کو ہوگی۔''

''میں تمہاری کہانی سننے کو تیار ہوں۔'' میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''تم میرے کمرے میں پہنچو، میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

''آپ کا مطلب ہے، میں تھانے جاؤں!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کی۔ ''ہاں، میرا یہی مطلب ہے...... اور اس وقت بھی تم تھانے کے احاطے ہی میں ہو۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ تم سب کی نظر بچا کر اس طرف کیسے نکل آئی ہو؟''

''جب میں سب کی نظر بچا کر ادھر آ ہی گئی ہوں تو آپ بھی تھوڑی نظر کرم کریں جناب!'' وہ لجاجت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر مجھے کوارٹر کے اندر بلانے میں آپ خطرہ محسوس کر رہے ہیں تو یہیں میری بات سن لیں۔ ویسے میں اتنی خطرناک بھی نہیں ہوں۔''

آخری جملہ اس نے عجیب سے انداز میں ادا کیا پھر بولی۔ ''ادھر تھانے میں جا کر آپ سے ملوں گی تو پھر یہ بات چھپی نہیں رہے گی اور...... سلامو......''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں تذبذب کے عالم میں تھا۔ اسے کوارٹر کے اندر بلانا ٹھیک تھا اور نہ ہی وہاں کھڑے کھڑے بات کرنا مناسب

تھا، مجھے کش مکش کا شکار دیکھ کر بالی نے کہا۔

''تھانے دار جی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں، اگر آپ میری بات سننے کو تیار نہیں تو میں واپس چلی جاتی ہوں۔ کل کلاں کوئی خطرناک واقعہ پیش آ گیا تو پھر مجھ سے سوال نہ کرنا کہ...... بالی جب تمہیں اتنا کچھ پتا تھا تو پھر بتایا کیوں نہیں۔''

بالی نے بات ہی ایسی کی تھی کہ میں اسے اپنے کوارٹر کے اندر بلانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ کوارٹر ایک کمرے اور صحن پر مشتمل تھا۔ کمرے میں بستر لگی چارپائی کے علاوہ بیٹھنے کے لیے ایک کرسی موجود تھی۔ میں نے بالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا تاہم کسی لاشعوری احتیاط کے پیش نظر میں نے کمرے اور کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھلا رہنے دیا تھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے بالی سے استفسار کیا۔ ''ہاں، اب جلدی سے بتاؤ تم کیا جانتی ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار جی! میں کافی دنوں سے یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ماکھا کے ارادے بہت خطرناک ہیں، وہ کسی بھی وقت سلامو کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آپ ماکھا کو تھانے بلا کر دبکا ماریں تاکہ وہ اپنے دل سے یہ خیال باہر نکال دے۔''

''تمہارے دل میں ایسا خیال کیوں آیا؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''چند روز پہلے ان دونوں میں خاصی منہ ماری ہوئی تھی۔'' بالی نے بتایا۔ ''اس کے بعد ہی ماکھا کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ اس نے تلخ کلامی کے دوران میں سلامو کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان دونوں کے درمیان کس بات پر تلخ کلامی ہوئی تھی؟ تم نے بتایا ہے وہ ایک دوسرے کے حریف ہیں، ذرا ان کے حریف ہونے کی بھی وضاحت کر دو۔''

''تھانے دار جی!'' بالی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''سلامو اور ماکھا کو مرغ لڑانے کا شوق ہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ وہ مرغوں کی لڑائی پر شرطیں بدھتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں، ابھی تم کے ایک مرغ مقابلے میں ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور ماکھا نے سلامو کو دھمکی دی۔'' وہ چند لمحے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا، ہر کام میں بے ایمانی چلتی ہے۔ میں نے جس مرغ مقابلے کا ذکر کیا ہے نا اس میں غلطی سراسر ماکھا کی تھی۔ ایک موقع پر چینا بازی جیت رہا تھا۔ ماکھا نے دھاندلی کی اور چینا کی ٹانگوں پر چھری سے ایک ضرب لگا دی، سلامو غصے کا بہت تیز ہے غلط بات اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ ماکھا کی بے ایمانی پر سلامو نے اسے گالی دی پھر ان میں جھگڑا ہونے لگا۔ بات تلخ کلامی سے آگے بڑھی تو انہوں نے ایک دوسرے کے گریبان پکڑ لیے۔ وہاں موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے خطرہ ٹال دیا لیکن ماکھا نے بڑے خطرناک انداز میں سلامو کو دھمکی دی ہے کہ وہ اسے مزہ چکھا دے گا۔'' وہ

سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تھانے دار جی! شاید آپ کو پتا نہیں، ماکھا لڑائی بھڑائی اور بدمعاشی کے کاموں کا ماہر ہے۔ فرید نگر کے تمام لوگ اس کی غنڈا گردی سے ڈرتے ہیں۔ مجھے اسی لیے بہت زیادہ تشویش ہے۔“

”تم نے اپنے خاوند کو نہیں سمجھایا کہ وہ اس مرغ بازی سے باز آ جائے۔“ میں نے اس کی بات کے اختتام پر کہا۔ ”ایسے کاموں کے نتائج اچھے نہیں نکلتے!“

وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی۔ ”سلامو میری سنتا ہی کہاں ہے۔ ادھر میں نے زبان کھولی ادھر اس کا لات، مکا شروع! میں اپنی ہڈیوں کا بہت سرمہ بنوا چکی۔ اب مجھ میں اور مار کھانے کی ہمت نہیں ہے مجھ سے تو وہ چینا زیادہ خوش قسمت ہے، سلامو کسی محبوبہ کی طرح اس کے نخرے اٹھاتا ہے بعض اوقات تو مجھے اس مرغے سے حسد ہونے لگتا ہے اور میں اپنے دل میں اس خبیث کے لیے نفرت محسوس کرتی ہوں۔“

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں برہمی ناپسندیدگی اور بیزاری کے تاثرات تھے۔ ”کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں...... میں کوئی لڑاکا مرغا ہی ہوتی، شاید اس طرح سلامو کی نظر میں میری کوئی اہمیت ہوتی۔“

آخری الفاظ اس نے بڑے حسرت ناک انداز میں ادا کیے تھے۔ اس کے اظہار سے دکھ ٹپکتا تھا۔ بالی نے مجھے سلامو کے مشاغل کے بارے میں جو کچھ بتایا، اگر اس میں دروغ گوئی کا دخل نہیں تھا تو پھر وہ بے چاری واقعی ہمدردی کی مستحق تھی۔ جن بیویوں کے شوہر...... اور گھرانوں کے سربراہ مرغ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی اور دیگر مختلف قسم کی بازیوں کے عادی اور شوقین ہوتے ہیں...... اس شوق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بھی بنا لیتے ہیں، وہ بیویاں...... اور گھرانے بری طرح متاثر ہوتے ہیں، اگر یقین نہ آئے تو گرد و پیش میں ایک گہری نگاہ ڈال کر دیکھ لیں۔

بالی اپنے شوہر کے لیے پریشان تھی۔ ایک مرغ باز غنڈہ اس کے شوہر کا دشمن ہو گیا تھا اور اس دشمنی کا سبب مرغ بازی تھی۔ سلامو کا چینا اگر ماکھا کے مرغ کو پچھاڑنے کی کوشش نہ کرتا تو ان مرغ بازوں کے بیچ تلخ کلامی نہ ہوتی۔

میں نے بالی سے چینا کے بارے میں چند سوالات کیے۔ اس نے بتایا کہ سلامو کا مرغا سفید اور سرمئی رنگ کا تھا، چت کبرا ہونے کے باعث اس مرغ کو چینا کہا جاتا تھا جب کہ ماکھا بدمعاش کا مرغا سرخا کہلاتا تھا، سرخ رنگ کے اس مرغ میں کوئی کوئی پر کالا بھی تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی وہ سرخ ہی نظر آتا تھا۔ چینا اور سرخا کی لڑائی نے ماکھا کو سلامو کا دشمن بنا دیا تھا۔

میں نے بالی کو گہری نظر سے دیکھا اور کہا۔ ”ٹھیک ہے بالی! میں نے تمہاری شکایت نوٹ کر لی تم فکر نہ کرو، میں ماکھا کو صبح ہی تھانے بلواتا ہوں، اگر تمہاری بات میں سچائی ہوئی تو میں

اس سورما کی وہ کھنچائی کروں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلیں یاد رکھیں گی۔“

”میں نے آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ”اور تمہارا گھر والا جب مکی وال سے واپس آ جائے تو اسے بھی میرے پاس بھیجنا میں اس کے بھی کان کھینچوں گا۔ بیوی پر ہاتھ اٹھانا کہاں کی مردانگی ہے...... اور وہ بھی تم ایسی ننھی منی بیوی پر جس میں شوہر کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے!“

بات ختم کرتے ہی میں نے چادر میں لپٹے ہوئے بالی کے سراپا کا جائزہ لیا، وہ میری نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے چادر کے اندر کسمسائی پھر ڈرے سہمے لہجے میں بولی۔

”تھانے دار جی! ایسا غضب نہ کرنا، اگر سلامو کو پتہ چل گیا کہ میں نے......!“

”نہیں چلے گا اسے پتا۔“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ میں طریقے سلیقے سے سمجھاؤں گا اسے تم پر شک نہیں آئے گا۔“ ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کیا۔ ”وہ واپس آئے تو تم اس سے کہنا، تھانے سے کوئی بلانے آیا تھا، تھانے دار اس سے ملنا چاہتا ہے، پھر وہ خود ہی سمجھ جائے گا، اس طرح تم پر بات نہیں آئے گی۔“

وہ تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی، میں نے مزید تسلی تشفی دی تو وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کوارٹر کا بیرونی دروازہ بند کیا اور اپنے بستر پر لیٹ کر بالی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ پستہ قامت عورت میری سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی اس کی باتیں۔ وہ جو شکایت لے کر میرے پاس آئی تھی اس کی نوعیت بہت معمولی تھی مگر اس کی آمد کا انداز بہت پراسرار تھا۔ ایک طرف وہ اپنے شوہر سے بہت خوف زدہ تھی اور دوسری جانب وہ شوہر کی غیر موجودگی میں تن تنہا اتنی رات کو گھر سے نکل کر تھانے پہنچ گئی...... تھانے بھی کیا پہنچی، وہ تو سیدھی میرے رہائشی کوارٹر میں چلی آئی تھی، بہت کچھ سامنے نہیں تھا اور اسے سامنے لانے کی ضرورت تھی۔

میں نے سوچا، اگلی صبح میں ماکھا کو تھانے بلوا کر پوچھ تاچھ تو کروں گا ہی، اس کے ساتھ ہی میں بالی کے بارے میں بھی تحقیق ضرور کروں گا۔ اس کی پراسرار آمد نے میرے ذہن میں الجھن زدہ خیالات کا ایک جال سا بن دیا، میرے حساب سے اسے تھانے آ کر اس قسم کی شکایت درج کروانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام سراسر سلامو کا تھا، اگر وہ اس سلسلے میں فعال نہیں تھا تو بالی اسے کسی بھی طرح اکسا سکتی تھی!

میں نے بالی، سلامو اور ماکھا کو ذہن سے جھٹکا اور لحاف میں گھس کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں مجھے بہت جلد کامیابی حاصل ہو گئی۔

ماکھا مضبوط جثے کا مالک ایک پہلوان نما شخص تھا۔ اس کی چال ڈھال، ڈیل ڈول اور

چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بہ خوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا تعلق معاشرے کے کس طبقے سے ہے، وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ایک مستند بدمعاش نظر آتا۔ اس نے سفید تہ بند پر سرخ رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور گریبان کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ میرے بلانے پر دو کانسٹیبل کے ساتھ تھانے آیا تھا اور اس وقت معصوم صورت بنائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے نرم لہجے میں اس سے کہا بیٹھ جاؤ!'' پھر ایک کرسی کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''سرکار! آپ نے مجھے تھانے کیوں بلایا ہے؟''

''بس ایسے ہی'' میں نے کندھے اچکائے۔ ''تم سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

میرے جواب نے اسے اور الجھا دیا۔ ''مجھ سے ملنے کے لیے!'' وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''ماکھا! سنا ہے تمہارے اندر بہت گرمی بھری ہوئی ہے، تم کیا کھاتے ہو؟''

''پتا نہیں جناب، آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''اچھی خاصی سردی ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''لیکن تمہارا گریبان اوپر سے نیچے تک کھلا ہوا ہے۔ کیا کسی حسینہ کے عشق میں تم نے اپنا گریبان چاک کر رکھا ہے یا واقعی تمہیں سردی نہیں لگتی؟''

وہ گڑبڑا گیا۔ ''جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں؟''

''پھر کیسی بات ہے!'' میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ ''جب تمہیں بھی دوسرے انسانوں کی طرح سردی لگتی ہے اور تم کسی عورت کے عشق میں بھی مبتلا نہیں ہو تو پھر گریبان کیے کیوں گھومتے ہو؟''

''وہ جی، بس عادت سی ہو گئی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، عادی مجرم ہو!''

''کیا'' وہ چونک کر مجھے تکنے لگا۔ ''میں نے کیا جرم کیا ہے جناب؟''

''گریبان کھول کر رکھنا شرفا کا چلن نہیں بلکہ بدمعاشوں کا وتیرہ ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور بدمعاشی سنگین جرائم میں شمار ہوتی ہے۔''

میرے مسلسل گھورنے سے وہ تھوڑا اجزبز ہوا۔ ''سرکار! لگتا ہے، کسی دشمن نے آپ کو میرے خلاف بھڑکا دیا ہے ورنہ میں تو ایک سیدھا سادہ انسان......''

''اوئے جلیبی کی طرح سیدھے اور ببول کے مانند سادہ انسان!'' میں ن اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے کسی چاچے مامے نے مجھے نہیں بھڑکایا بلکہ مجھے باوثوق ذرائع سے پتا چلا ہے کہ تم کھلی بدمعاشی کرتے ہو، فرید نگر کے لوگ تم سے خوف

زدہ اور نالاں ہیں اور......'' میں نے دانستہ رک کر تھوڑا توقف کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تو آس پاس کے علاقے بھی تمہاری غنڈہ گردی سے محفوظ نہیں تم نے سلطان پورہ کے سلامو کو جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے!''

جان سے مارنے والی بات میں نے اپنی طرف سے لگائی تھی تاکہ اس کے تاثرات کھل کر سامنے آسکیں۔ مجھے اپنے مقصد میں بڑی حد کامیابی ہوئی، وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا سلامو آپ کے پاس میری کوئی شکایت لے کر آیا تھا؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا۔ ''ماکھا! تھانے دار میں ہوں یا تم؟''

وہ اس انوکھے استفسار پر فکرمند نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے جناب! تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔''

''جب تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ میں تھانے دار ہوں تو یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ سوال میں کروں گا، تم صرف جواب دو گے۔''

وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے میری بات اس کے پلے نہ پڑی ہو، میں نے مزید کہا۔

''کیا یہ بات درست نہیں کہ تم نے سلامو کو جان سے مارنے کی دھمکی دی تھی؟''

''جناب! میں نے اسے ایسی کوئی دھمکی نہیں دی۔'' وہ کمزور احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ''البتہ پچھلے دنوں ہمارے درمیان کسی بات پر ہلکا پھلکا جھگڑا ہو گیا تھا، اس نے مجھے گندی گالی دی تو میں طیش میں آ گیا اور میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔''

''تم دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''مرغوں کے مقابلے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اور اس گڑبڑ کا سبب بھی تم ہی تھے۔ ایک مرحلے پر سلامو کا چینا تمہارے سرخا کو پچھاڑنے والا تھا اور تم نے چینا کی ٹانگوں پر چھڑی رسید کر دی۔ جس پر سلامو آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے تمہیں گالی دے دی؟''

''آپ کو جس نے بتایا ہے بالکل غلط بتایا ہے۔'' وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''میں نے چینا کی ٹانگوں پر چھڑی سے ضرب نہیں لگائی تھی بلکہ میں تو چھڑی کو زمین پر مارتے ہوئے اپنے سرخا کا حوصلہ بڑھا رہا تھا تاکہ چینا اس پر حاوی نہ ہونے پائے۔''

چینا اور سرخا پر ریسرچ کرنا میرا موضوع نہیں تھا۔ مرغ اور مرغ باز رہیں ایک طرف، میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ ماکھا نے اگر واقعی سلامو کو کسی قسم کی دھمکی دی تھی تو وہ اس دھمکی پر عمل کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ بالی نے بھی مجھ سے اسی حد تک مدد طلب کی تھی۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ماکھا کو تیز نظر سے گھورا اور تنبیہی انداز میں کہا۔ ''تم کس

بلندی کے بدمعاش ہو یہ تو میں بعد میں ناپ لوں گا۔ فی الحال کان کھول کر سن لو، سلامو کا بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسے ایک کانٹا بھی چبھا تو اس کا ذمے دار میں تمہیں ہی سمجھوں گا۔" میں نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے تم پہلی اور آخری وارننگ تصور کرو۔ مرغ بازی کو مرغوں تک ہی محدود رہنے دو، ورنہ میں تمہیں سلاخوں کے پیچھے پہنچا دوں گا اور...... یہ سلاخیں حوالات کی بھی ہو سکتی ہیں اور جیل کی بھی!"

اس نے وعدہ کیا کہ مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ میں نے مزید ہدایات کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔ مجھے یقین تھا، اس تاکید اور تنبیہ کے بعد وہ سلامو کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرے گا۔

میں توقع کر رہا تھا کہ اس دن کسی وقت سلامو بھی تھانے آ کر مجھ سے ملاقات کرے گا لیکن میری یہ توقع پوری نہ ہو سکی، یا تو وہ کمی وال سے واپس ہی نہیں آیا تھا یا پھر بالی نے میرا پیغام اس تک نہیں پہنچایا تھا، یہ بھی ہو سکتا تھا پیغام موصول ہو جانے کے باوجود بھی وہ میری طرف نہ آیا ہو۔ بہرحال اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس سے اگلے روز صبح ہی صبح بالی اور سلامو تھانے میں رکھے تھے۔ میں حسب معمول جب کوارٹر سے تھانے پہنچا تو انہیں برآمدے میں بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔ میں نے اپنے کمرے میں آنے کے بعد انہیں فوراً اندر بلا لیا۔

وہ اچھے خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے، میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا تو انہوں نے کرسیاں سنبھال لیں۔ میں نے تنقیدی نظر سے سلامو کا جائزہ لیا۔ بالی کی نسبت وہ خاصا قد آور تھا۔ دونوں قامت میں ایک دوسرے کے متضاد تھے۔

سلامو دبلا پتلا اور عام سی صورت کا انسان تھا۔ اس وقت وہ شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ اس بات سے مجھے قدرے حیرت ہوئی، بالی نے پورے بدن کو لپیٹنے کے بجائے ایک دوپٹا عام انداز میں اوڑھ رکھا تھا۔ جس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ اس رات مجھ سے ملاقات کے لیے اس نے پردے کا خصوصی اہتمام کیا تھا ورنہ وہ عام حالات میں ایسی نہ تھی۔ بالی بس قد سے مار کھا گئی تھی ورنہ اس کا شمار جاذب نظر اور دل کش حسین و جمیل عورتوں میں ہوتا تھا۔

وہ دونوں متذبذب انداز میں مجھے دیکھ رہے تھے جیسے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ بات کہاں سے شروع کریں۔ میں نے ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کر دیا۔ سلامو زندہ سلامت میرے سامنے موجود تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ ان کی آمد کا سبب تشویش ناک نہیں ہو گا۔

میں نے سلامو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تو کل میرے پاس آنا تھا۔ کیا تمہیں

پیغام نہیں ملا تھا؟"

وہ کھسیانے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے بالی کی طرف تکتے ہوئے استفسار کیا۔ "میں نے پرسوں اپنا ایک بندہ تمہارے گھر بھیجا تھا جس نے مجھے آ کر بتایا تھا کہ سلامو گھر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ کیا تم نے اپنے خاوند کو پولیس اہلکار کی آمد کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟"

میں نے سلامو کی نظر میں بالی کی پوزیشن کی صاف کی تو وہ تشکر بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر اس سے قبل کہ وہ میرے سوال کو جواب دیتی، سلامو بول اٹھا۔

"مائی باپ!" اس کے انداز میں عجز و انکسار تھا۔ "آپ کا پیغام تو مجھے مل گیا تھا لیکن بس مصروفیت کی وجہ سے حاضری نہیں دے سکا۔"

"اوئے مصروفیت کے گھوڑے!" میں نے اسے گھر کا "کیا تمہیں مرغ بازی سے اتنی زمت بھی نہیں ملتی کہ تھانے میں آ کر جھانک سکو۔ یاد رکھو! یہ مرغ بازی تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گی، سدھر جاؤ ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔"

"وہ جی...... وہ جی ہم چینا کی وجہ سے صبح صبح آپ کے پاس آئے ہیں۔" سلامو کے بجائے بالی نے کہا۔ "بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے جناب!"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ "چینا کو کیا ہو گیا؟"

"کسی ظالم نے اسے ختم کر دیا۔" سلامو نے زخمی لہجے میں بتایا۔

بالی تڑخ کر بولی۔ "کسی ظالم کیوں کہتے ہو سلامو سیدھی طرح ماکھا کا نام کیوں نہیں لیتے یہ ظلم اس کے سوا اور کون توڑ سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے، یہ ماکھا ہی کی کارروائی ہو۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "میں نے اسے یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا اس لیے نام لینا ٹھیک نہیں۔"

"تمہاری سادگی اور ڈھیلا پن تمہیں ضرور ڈبوئے گا۔" بالی نے غصیلے انداز میں کہا۔

"چینا کو ختم کرنے میں صرف اور صرف ماکھا ہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس نے تمہیں خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی تھی۔"

میں اس پونے پانچ فٹی حسینہ کا تنتنا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس رات وہ مجھے یکسر مختلف دکھائی دی تھی۔ شوہر سے ڈرنے والی، اس سے پٹنے والی اور ہر حال اس کی خیر خواہ ایک وفا شعار اور دبو بیوی۔ لیکن اس وقت اس کے مزاج کا رنگ ڈھنگ ہی دوسرا تھا۔ وہ کہیں سے بھی دکھی نظر نہیں آ رہی تھی جیسا اس نے ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ سلامو اس کے سامنے جس طرح بھیگا بلا بنا بیٹھا تھا اس سے تو یہی نتیجہ نکل رہا تھا کہ گھر میں حالات اس سے بالکل مختلف ہوں گے جیسا بالی نے بیان کیے تھے۔ یقیناً بالی ہی اپنے خاوند کو ٹھکائی کرتی ہو گی اور سلامو کی

ہڈیوں کو فاسفورس بنانے کا کوئی موقع نہیں گنواتی ہوگی۔

بالی کی شخصیت کے اس تضاد نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سلامو نے میری طرف دیکھتے ہوئے رنجیدہ انداز میں کہا۔ ”تھانے دار صاحب! چینا کی موت میرے لیے بڑا صدمہ ہے۔ آپ میرے دکھ کو سمجھ سکتے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”چینا نامی اس لڑاکا مرغ کو کب اور کہاں موت کے گھاٹ اتارا گیا؟“

بالی نے جواب دیا۔ ”جناب! چینا مردہ حالت میں ہمارے گھر کے باہر سیڑھیوں پر پڑا ہے۔ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور یہ آج ہی صبح کا واقعہ ہے...... میرا مطلب ہے ہم نے آج اسے دیکھا ہے۔“

”چینا رات کے وقت کہاں رہتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”گھر کے اندر صحن میں اس کا ڈربا بنا ہوا ہے۔“ سلامو نے بتایا۔ ”مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے کل شام کو خود اپنے ہاتھوں سے اسے ڈربے میں بند کیا تھا۔“

”کیا تم صبح اسے خود ہی کھولتے ہو؟“

”جی، چینا سے متعلق تمام تر ذمے داری میں ہی نبھاتا ہوں۔“ سلامو نے کہا۔ ”بالی کو ان معاملات میں ذرا دلچسپی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”چینا کا مردہ حالت میں تم لوگوں کی دہلیز پر پایا جانا یہ ثابت کرتا ہے کہ گزشتہ رات کوئی شخص چپکے سے تمہارے گھر کے صحن میں اترا تھا۔ وہ شخص چینا کو ڈربے سے نکال کر باہر لے گیا ہوگا اور چینا کی موت کا ذمہ دار بھی وہی شخص ہو سکتا ہے۔“

میں چینا کی موت کے بارے میں یہ سوال و جواب اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ اس عظیم الشان قتل میں مجھے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ اس طرح میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ماکھا اس واقعے میں کس حد تک ملوث ہو سکتا تھا۔

بالی نے ایک مرتبہ پھر زوردار انداز میں کہا۔ ”تھانے دار جی! چینا کی موت کا ذمے دار ماکھا ہی ہو سکتا ہے۔“

”تمہارے اس یقین کا سبب کیا ہے بالی؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”دیکھیں نا جی! ماکھا کے لیے چینا خطرے کی کسی گھنٹی سے کم نہیں تھا۔ اس گاؤں اور آلے دوالے کے تمام علاقوں پر چینا ہی ایک ایسا شاہ زور ہے جو ماکھا کے سرخا کی ناک سے لکیریں نکلوا سکتا ہے۔ ماکھا کو اپنی بدمعاشی برتری خطرے میں نظر آئی ہوگی اس لیے اس نے چینا کو اپنی راہ سے ہٹا دیا۔ یہ بہت ہی کینہ پرور شخص ہے جناب مجھے تو ڈر ہے، اگر آپ نے ماکھا کا کوئی ٹھیک بندوبست نہ کیا تو وہ سلامو کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوگا۔“

”تم کیا کہتے ہو سلامو؟“ بالی کی بات کے اختتام پر میں نے اس کے شوہر سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”جناب! میرا چینا تو واپس نہیں آ سکتا لیکن میری خواہش ہے، آپ اس کے قاتل کو عبرتناک سزا دلوائیں۔“

”سلامو! کسی مرغ کی موت اور ایک انسان کے قتل میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ میں نے اس احمق کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بالفرض، اگر یہ پتا چل بھی جاتا ہے کہ تمہارے چینا کو کس نے مارا ہے تو بھی میں اس فرد مذکورہ کو پھانسی کے پھندے تک نہیں پہنچا سکتا...... اور نہ ہی اسے اس جرم کی پاداش میں عدالت میں گھسیٹ سکتا ہوں۔“ میں نے ایک لمحے کا وقفہ دے کر دوبارہ کہنا چاہا۔ ”یہ ٹھیک ہے قانون کی ضخیم کتابوں میں جانوروں کے بارے میں بھی بہت سے ایکٹ درج ہیں، خصوصاً پالتو جانوروں کے حوالے سے، اس صورت میں تمارے پاس چینا کا سرٹیفکیٹ اور لائسنس ہونا ضروری ہے۔ قانون سے مدد لینے کے لیے قانونی تقاضے بھی پورے کرنا پڑتے ہیں۔ تمہارے چینا کا معاملہ اتنا جان دار نہیں کہ تمہیں عدالت سے کچھ وصول ہو سکے۔“

حاصل وصول کے الفاظ پر میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک کو انگڑائی لے کر بیدار ہوتے دیکھا۔ وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب! یہ تو ہو سکتا ہے نا کہ آپ چینا کی موت کے ذمے دار شخص سے کچھ ہرجانہ وصول کر کے دے دیں۔ آپ کو شاید پتا نہیں چینا ہی میرے معاش کا ذریعہ بھی تھا۔“

یہ بات بالی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکی تھی لیکن سلامو کے سامنے میں نے اپنی معلومات کا اظہار نہیں کیا اور وعدہ کرنے والے انداز میں کہا۔

”ٹھیک ہے سلامو! پہلے مجھے اس واقعے کے ذمے دار تک پہنچنے دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس شخص کو نچوڑنے کی میں پوری کوشش کروں گا۔“

بالی نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”ذمے دار تو آپ کی نظر کے سامنے ہے۔ میں تو کہتی ہوں آپ ہرجانے وغیرہ کے چکر میں نہ پڑیں اور چینا کے بدلے ماکھا کا سرخا ہمیں لا دیں۔ اس طرح حساب برابر ہو جائے گا۔“

بالی کسی پیاز کی طرح پرت در پرت کھل رہی تھی، بقول خود یہ وہی عورت تھی جسے چینا سے نفرت تھی کیونکہ اس کے مطابق، سلامو نے چینا کو اپنی توجہ اور محبت کا مرکز و محور بنا رکھا تھا اور اب وہ خود ہی چینا جیسے ایک پرند کو دوبارہ گھر میں لانے کی تجویز دے رہی تھی۔ نظریات اور خیالات میں اتنا بڑا تضاد خالی از معنی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ویسے بھی اس کی طرف سے محتاط ہو چکا تھا۔ میں اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر سے کتنا ڈرتی تھی حالانکہ سرکاری کوارٹر پر ہونے والی شبینہ ملاقات میں اس نے مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی۔

بالی پر مزید ریسرچ کی ضرورت تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس کے بارے میں حتی

الامکان معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے بالی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ اُس کے بارے میں، میں کیا فیصلہ کر چکا ہوں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے بالی! میں دیکھتا ہوں کیا صورت بنتی ہے، اگر ماکھا چینا کی موت کی ذمے داری قبول کر لیتا ہے تو میں اس کا سر خاتمہیں دلوانے کی کوشش کروں گا۔''

''اس کے ساتھ ہی اسے یہ وارننگ بھی دینا ہوگی کہ وہ ہماری طرف رخ نہ کرے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔ ''اس بدمعاش کا کیا بھروسا، بعد میں وہ سلامو کا دشمن ہو گیا تو ہمیں کوئی شدید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں تم دونوں کی حفاظت کا شافی بندوبست کروں گا۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تھانے سے رخصت ہو گئے۔

چینا کی موت کوئی اتنا بڑا اور اہم واقعہ نہیں تھا کہ میں فوراً ان کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ کر کارروائی شروع کر دیتا۔ اس سے کہیں زیادہ ضروری معاملات تھانے میں موجود تھے۔

میں سلامو اور بالی کے لیے جو کر سکتا تھا، اس کا میں نے ان سے وعدہ کر لیا۔

اسی روز دوپہر کے بعد میں نے ماکھا کو تھانے میں بلوایا۔ وہ اس طلبی پر خاصا الجھا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلوانے کے بعد سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نے میری ہدایات کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا ہے۔''

میں نے اس مرتبہ اسے بیٹھنے کی پیش کش بھی نہیں کی اور اس کی مزاج پرسی کے لیے ایک ہٹے کٹے پولیس اہلکار کو بھی کمرے میں بلوا لیا تھا، وہ چوکنا نظر سے میرے اشارے کا منتظر تھا اور ماکھا کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس سیٹنگ اور میرے سوال نے ماکھا کے اوسان خطا کر دیے۔ وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے ایسی کیا خطا ہو گئی مائی باپ!''

''میں نے تمہیں تنبیہ کی تھی کہ سلامو سے دور رہنا!'' میں نے کڑک کر کہا۔

''سرکار!'' وہ دیدے پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ کے کہے ہوئے ایک ایک الفاظ کو اپنے ذہن میں بٹھا رکھا ہے، آپ یقین کریں جب سے میں آپ سے مل کر گیا ہوں اُس وقت سے اب تک میں نے سلامو کی شکل دیکھی ہے نہ ہی سلطان پورہ میں قدم رکھا ہے، دور رہنا اور کسے کہتے ہیں جناب!'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔

میں نے کہا۔ ''قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔''

اس کا جملہ نامکمل رہ گیا، تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر؟''

میں نے کہا۔ ''کیا واقعی پچھلے دو دن سے تم نے سلامو کو نہیں دیکھا؟''

''میں سولہ آنے صحیح کہہ رہا ہوں جناب!''

''اور آج صبح والے واقعے کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''کون سا واقعہ جی!'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

اس کا بے ساختہ انداز اس بات کا غماز تھا کہ وہ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہا تھا تاہم میں اتنی آسانی سے اس کی بات پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے مزید گھسنے کی خاطر کہا۔

''میں چینا کی موت والے واقعے کی بات کر رہا ہوں۔''

''کک...... کیا...... چینا مر گیا؟'' وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں، یہ بات تم سے زیادہ اور کون جانتا ہو گا کہ چینا آج صبح سلامو کے گھر کے دروازے پر مردہ پایا گیا ہے۔ اس کی گردن کٹی ہوئی ملی ہے۔''

''مم...... میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔ ''چینا کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''

''تمہارا نہیں تو تمہارے کسی چیلے چانٹے کا ہاتھ ہو گا؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔ ''میں چینا اور اس کی موت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

اس واقع پر میں نے اس تنومند سانڈ ساخت کانسٹبل سے بھی تھوڑا بہت ''کام'' لیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں موجود تھا۔ چند خوفناک ٹھڈے اور دھواں دھار لات مکا کھانے کے بعد بھی جب ماکھا نے اپنا بیان نہ بدلا تو مجھے ماننا پڑا، وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ چینا کے معاملے میں وہ واقعی ملوث نہیں تھا ورنہ ایک مرغ کی موت کو قبول کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ اگر وہ یا اس کا کوئی گرگا چینا کی موت کا ذمے دار ہوتا تو ماکھا زبان کھولنے کو مار کھانے پر ترجیح دیتا۔

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات ہمیں ملزم اور جرائم پیشہ افراد کی زبان کھلوانے کے لیے تشدد آمیز حربوں کو بھی کام میں لانا پڑتا ہے لیکن یہ انتہائی مجبوری کے عالم میں ہوتا ہے اور وہ بھی سکہ بند لوگوں کے لیے کیونکہ وہ اتنے آسان نہیں ہوتے کہ شرافت سے اپنا جرم قبولتے ہوئے منت سماجت کریں کہ انہیں جلد از جلد جیل میں ڈال دیا جائے البتہ شریف شہریوں کے ساتھ نرمی اور اخلاق کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ انہیں بیٹھنے کے لیے کرسی بھی پیش کی جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو عمومی رواج یہی اور بیش تر تھانے اسی مزاج کے زیر اثر کام کرتے تھے۔ آج کل سنا ہے، عوام کو پولیس سے بہت زیادہ شکایات پیدا ہو گئی ہیں۔ آوازِ خلق کو نقارۂ خدا جانتے ہوئے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو اس طرف توجہ دینا چاہیے۔ یہ صورتحال کسی لمحہ فکریہ سے کم نہیں! بس محسوس کرنے

کی بات ہے۔

میں نے ماکھا کو رخصت کرنے سے پہلے اسے مزید ہدایات دیں اور کہا۔ ”تم تھانے میں اطلاع دیے بغیر اپنے علاقے سے باہر نہیں جاؤ گے اور صبح وشام باقاعدگی کے ساتھ تھانے میں حاضری دو گے۔“

وہ کسی فرماں بردار بچے کی طرح میری ہدایات پر صاد کرتا چلا گیا۔ چینا کی موت کوئی سنگین معاملہ نہیں تھا لیکن میں ماکھا کو حدود میں رکھنے کے لیے یہ پیش بندی کر رہا تھا، بہرحال وہ بنیادی طور پر ایک بدمعاش تھا۔ اسے ویسے بھی لگام میں رکھنا ضروری تھا۔ اس بات کے امکانات معدوم نہیں ہوئے تھے کہ وہ سلامو یا بالی کو کسی قسم کا نقصان پہنچاتا۔

آئندہ تین چار روز میں کوشش کر کے میں نے سلامو اور اس کی بیوی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر لیں، وہ دونوں قریبی رشتے دار تھے اور ان کی شادی بڑے حادثاتی انداز میں ہوئی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں مختصراً ان کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں، یہ ذکر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔

❀❀❀

بالی، سلامو کی تایا زاد تھی اور اپنے والدین کی اکلوتی بھی۔ سلامو کے والدین کا انتقال ہوا تو وہ اپنے تایا کے گھر میں پرورش پانے لگا، سلامو کا تایا ایک چھوٹا زمیندار تھا۔ اپنی موت سے قبل اس نے بیٹی کا ہاتھ اپنے بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان کے ہاں رشتہ خاندان سے باہر نہیں ہوتا تھا لہٰذا اور کوئی امکان نہیں تھا۔ ازیں بعد بالی کی ماں بھی اس دنیا سے کوچ کر گئی۔

باپ کی زمین بالی کے ہاتھ آ گئی، لیکن سلامو انتہائی نکما اور کام چور ثابت ہوا۔ وہ اچھی خاصی زمین تھی، وہ جی جان سے کھیتی باڑی کرتا تو وارے کے نیارے ہو جاتے۔ اس نے تو تایا کی زندگی میں کبھی اس طرف توجہ نہیں دی تھی، اب کیا دلچسپی لیتا، نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ دس ایکڑ زمین ٹھیکے پر کسی مزارع کو دے دی گئی۔

اگر مالک جان کار اور زبردست نگرانی کرنے والا نہ ہو تو اس قسم کے معاملات اور ٹھیکوں میں زمین دار کا نقصان اور مزارع کا فائدہ ہوتا ہے اور بالآخر ایک روز وہی مزارع زمین کا مالک بن بیٹھتا ہے۔

اس کیس میں بھی یہی ہوا، دس ایکڑ زمین مزارع کے قبضے میں چلی گئی۔ اس نے جو اونی پونی قیمت لگائی وہ بہ حالت مجبوری بالی کو وصول کرنا پڑی کیونکہ زندہ رہنے کے لیے پیٹ کھانا مانگتا ہے اور کھانا ایسے ہی نہیں آ جاتا، اس کے لیے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔

اگر مال کو بڑھانے کی کوشش نہ کی جائے تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا۔ یہی صورت حال انہیں پیش آئی زمین کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم ختم ہوئی تو مکان کی باری آئی

اور...... وہ دونوں ایک شان دار بڑے گھرے کو فروخت کرنے کے بعد معمولی سے گھر میں آ گئے۔ سلامو کو مرغ لڑانے اور مفت کی کھانے سے فرصت نہیں تھی، وہ مستقبل کے بارے میں بھی کیا سوچتا گویا اس نے اپنی نالائقی سے قدم قدم پر بالی کو دکھ ہی پہنچایا تھا۔ اس تناظر میں بالی مظلوم اور بدنصیب نظر آتی ہے۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو گی کہ ان کی شادی کو لگ بھگ آٹھ سال ہو چکے تھے اور ابھی تک وہ صاحب اولاد بھی نہیں ہو سکے تھے۔

بالی جیسے تیسے سلامو کے ساتھ گزارہ کر رہی تھی کہ ماکھا کا قصہ بیچ میں آ گیا جو اس وقت ان دونوں کی پریشانیوں کا سبب بنا ہوا تھا۔ میں بالی کے بارے میں جتنا زیادہ واقف ہو رہا تھا، اس کی شخصیت کے نئے سے نئے پہلو میرے سامنے آ رہے تھے۔ میرے کوارٹر میں ہونے والی، ہماری پہلی ملاقات، اس ملاقات میں اس نے اپنے اور سلامو کے بارے میں ایک خاص قسم کا تاثر دیا تھا، دوسری ملاقات نے جس کی بھرپور تردید کر دی اور اب اس کا ماضی کوئی نئی کہانی سنا رہا تھا جس میں بالی سراسر بے قصور نظر آتی تھی، سلامو ہڈحرام اور نامعقول شوہر دکھائی دیتا تھا۔

میرے دل میں شدت سے اس خواہش نے سر ابھارا کہ اس ہمہ جہت پستہ قامت روحسینہ کا ایک بھرپور انٹرویو کروں۔ میرے خیال میں اس کی جتنی پرتیں کھل چکی تھیں اس سے کہیں زیادہ ابھی تہ بند پڑی تھیں۔

چھوٹے سے ریشمی تھان میں سیکڑوں تہوں کا اسرار بند ہوتا ہے۔ بالی بھی اپنے مختصر وجود میں ہزار ہا ان کہی، ان دیکھی اور ان سنی ہوش ربا داستانوں کا طلسم کدہ سجائے بیٹھی تھی۔

اگلے ہی روز مجھے اس سے تفصیلی بات کرنے کا موقع مل گیا۔

یہ موقع بھی معمول سے ہٹا ہوا تھا اور پہلی دستکی ملاقات ہی کا تسلسل معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے اور میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازے پر ابھرنے والی دستک نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے کسی ہنگامی صورت حال کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے کوارٹر کا دروازہ کھول دیا۔

صورتحال تو ہنگامی ہی تھی لیکن اس کا تعلق تھانے سے نہیں تھا۔ اس وقت میری نگاہ کے سامنے بالی کھڑی تھی، اس نے اپنے بدن کو چادر کے اندر چھپا رکھا تھا تاہم آج اس کی چادر کا رنگ سفید نہیں بلکہ سیاہ تھا۔ سیاہ نقاب کے اندر سے اس کی روشن آنکھیں شناخت کے لیے کافی تھیں، میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ آواز نیچی رکھتے ہوئے بولی۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں تھانے دار جی؟“

اس کے سوال میں التجا تھی، اس لیے میں اس کی درخواست کو رد نہ کر سکا اور اسے اندر آنے کا موقع دیتے ہوئے دروازے سے ہٹ گیا۔ شاید اس اجازت میں میری اس خواہش کا دخل بھی تھا کہ میں بالی سے طویل سوال و جواب کا ارادہ رکھتا تھا۔ بہرحال وہ کوارٹر کے اندر آ گئی تو

میں نے اس سے پوچھا۔

"لگتا ہے آج رات بھی تمہارا خاوند گھر میں نہیں اس لیے تم یہاں چلی آئی ہو۔" پھر میں نے طنز سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "سلامو کی موجودگی میں تو تم گھر سے باہر قدم نکالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی ہو کیونکہ تم اس سے بہت ڈرتی ہو؟"

"جی، ایسی ہی بات ہے۔" وہ میرے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ میں نے پوچھا۔ "آج تمہارا گھر والا کہاں گیا ہے؟"

"وہ باغ پورہ گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کی واپسی صبح ہی کو ہوگی۔"

"بالی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "یہاں آتے ہوئے تم خود کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ لیتی ہو لیکن اس دن تھانے میں تو تم نے اس قسم کا کوئی تکلف نہیں کیا تھا، یہ خاص بندوبست تم کیوں کرتی ہو؟"

"صرف اس لیے کہ کوئی مجھے یہاں آتے ہوئے دیکھ نہ لے۔" اس نے بتایا۔ "تھانے میں تو میں سلامو کے ساتھ تھی اس لیے فکر اندیشے والی کوئی بات نہیں تھی۔"

اس نے ایک معقول جواز پیش کیا۔ میں نے اس کے جواب کے پہلے حصے کی روشنی میں سوال کیا۔ "آج تم کون سی شکایت درج کروانے آئی ہو؟"

"شکایت کوئی نہیں۔" وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"پھر تمہاری آمد کیا مقصد ہے؟"

"بس، میرا جی گھبرا رہا تھا۔" وہ کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے سوچا آپ سے چند باتیں کرلوں۔ شاید میرے دل میں موجود خوف نکل جائے۔"

بالی کا انداز اور رویہ عام دیہاتی عورتوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی جگہ گاؤں کی کوئی اور عورت ہوتی تو رات کے وقت گھر سے اکیلی نہ نکلتی اور وہ بھی تھانے آنے کے لیے۔ بالی کا طرز عمل ظاہر کرتا تھا، وہ ایک بہادر اور نڈر عورت تھی لیکن وہ خود کو خوف زدہ اور بزدل ثابت کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "بالی! تم نے اپنے دل میں کسی خوف کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، کیا میں تمہاری گھبراہٹ اور اس خوف کا سبب جان سکتا ہوں؟"

"میں ماکھا کی طرف سے پریشان ہوں۔" وہ ہراساں لہجے میں بولی۔

ماکھا کے ذکر پر مجھے چونکنا پڑا کیونکہ میں نے ماکھا کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع فراہم نہ کرے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس نے کوئی تازہ ترین حرکت کی ہو۔ میں نے اسے ایسا پابند کیا تھا کہ وہ دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھی ہوئی بالی سے دریافت کیا۔ "ماکھا نے اب ایسا کیا کردیا کہ تم خوف میں مبتلا ہوگئی ہو؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "وہ ادھر الٹی سیدھی باتیں کرتا پھر رہا ہے۔"

"مثلاً کس قسم کی الٹی سیدھی باتیں؟" میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

بالی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔ "ماکھا نے حسین آباد کے حنیفو سے کہا ہے کہ چینا کے بعد سلامو کی باری ہے۔" پھر اس نے رک کر مجھ سے استفسار کیا۔ "اس کا مطلب کیا ہوا جی! یہی نا کہ پہلے اس نے چینا کی جان لی اور اب...... سلامو......"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور متوحش انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں بھی اس وقت کسی حد تک الجھن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے بالی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یہ بات حنیفو نے بتائی ہے؟"

حنیف عرف حنیفو کا تعلق حسین آباد سے بتایا جا رہا تھا۔ یہ گاؤں فرید نگر سے ملحق تھا اور میرے تھانے ہی کی حدود میں آتا تھا۔ بالی نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"نہیں جی، حنیفو سے میرا کیا لینا دینا۔"

"پھر تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے تو زبیدہ نے اس بارے میں بتایا ہے۔"

"یہ زبیدہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

وہ بولی۔ "زبیدہ سلطان پورہ میں ہی رہتی ہے اور اس کا گھر میری گلی میں ہے۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ زبیدہ کو حنیفو سے یہ بات پتا چلی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وضاحتی انداز میں بولی۔ "تھانے دار جی! بات دراصل یہ ہے کہ کل زبیدہ سلطان پورہ کی دوسری عورتوں کے ساتھ جوہڑ سے لپائی کی مٹی نکالنے گئی تھی۔ وہاں دوسرے گاؤں کی عورتیں بھی تھیں۔ وہ جوہڑ سلطان پورہ، فرید نگر، حسین آباد اور مدینہ کالونی کے درمیان، ریلوے لائن کے کنارے واقع ہے۔ سب عورتیں لیپ پوت کے لیے اسی جوہڑ سے مٹی نکالتی ہیں۔"

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہیں جوہڑ پر حنیفو کی بیوی آسیہ بھی آئی ہوئی تھی۔ خالہ آسیہ نے ماسی جنت کو بتایا۔ ماسی جنت سے یہ بات نذیراں بی بی تک پہنچی۔ اس نے چاچی رسولاں سے بات کی جو زبیدہ کی رشتے دار ہے۔ اس طرح زبیدہ کو پتا چل گیا اور اس نے مجھے بتایا۔" وہ رک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔ "تھانے دار جی! لگتا ہے، آپ نے ماکھا کی کھنچائی نہیں کی اس لیے وہ اس قسم کی بکواس کرتا پھر رہا ہے۔ ہمارا چینا تو مر گیا ہے۔ کہیں اس شیطان ماکھا نے مجھے یا سلامو کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے تیقن سے کہا۔ "میں نے ماکھا کو خاصا ٹائٹ کردیا ہے۔ وہ کوئی

بھی حرکت نہیں کرے گا جس کی بنا پر میں اس کی کھال کھینچ لوں۔ تم خوامخواہ اندیشوں کو دل میں جگہ نہ دو۔"

وہ بے چین لہجے میں بولی۔ "اور وہ جو دھمکی والی باتیں کر رہا ہے......"

"بس بکواس ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قطعیت سے کہا۔ سینہ بہ سینہ اور منہ بہ منہ بات کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور بعض اوقات تو "کان کوا لے گیا" والا قصہ ہو جاتا ہے۔" پھر میں نے اسے کان اور کوے والا معروف قصہ سنایا اور کہا۔ "تم فکر نہ کرو، میں آپ کے شوہر حنیف عرف حنیفو کو بلا کر تفتیش کروں گا کہ اسے کس نے بتایا۔ اگر واقعی اس بات میں کوئی حقیقت نظر آئی تو میں ضرور کارروائی بھی کروں گا۔ تمہیں خوامخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ ایک خفیف سی جھرجھری لے کر رہ گئی۔ چادر کے اندر لپٹے ہوئے اس کے منی پیک بدن میں جنبش اور باہر سے یہی محسوس ہوا جیسے اس نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا ہو۔ اچانک اس کے لبوں سے ایک سراسیمہ آواز خارج ہوئی۔

"تھانے دار جی! میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ ویسے بھی آج رات تو سلامو بھی گھر پر نہیں۔"

میں نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "بالی! کیا واقعی تم اتنی ڈرپوک ہو؟"

"ہاں جی! برے آدمی کا کیا بھروسا۔ وہ کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتا ہے۔" وہ سراسیمہ انداز میں گویا ہوئی۔ "ماکھا ایک غنڈا ہے۔ کسی غنڈے اور بدمعاش سے اچھائی کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔"

"کیا تمہیں رات کے اندھیرے میں اکیلے تھانے آتے ہوئے ڈر محسوس نہیں ہوتا؟" میں نے اسے گھنے کے ارادے سے سوال کیا۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ "لگتا تو ہے جی، پر کیا کرتی! گھر میں بھی تو اکیلی تھی۔ وہاں اندیشے اور وسوسے زیادہ آ رہے تھے اس لیے آپ کے پاس چلی آئی۔"

"لیکن تم ساری رات تو یہاں نہیں گزار سکتی ہو؟" میں بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "تمہیں واپس تو جانا ہوگا، اسی گھر میں؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں جی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ "جانا تو پڑے گا۔"

"پھر باقی ماندہ رات میں تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟"

"میرا خیال ہے، نہیں لگے گا جی!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "آپ کی حوصلہ افزائی اور تسلی بھری باتوں نے میرے من کے خوف کو خاصی حد تک کم کر دیا ہے۔ میں اسی مقصد سے تو آپ کے پاس آئی تھی۔"

میں نے اچانک پوچھا۔ "سلامو باغ پورہ کیا لینے گیا ہے؟"

"نذر محمد نامی ایک بندے سے ملنے گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "نذر محمد اپنا مرغا فروخت کر رہا ہے اور سلامو اس مرغے کو خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔"

"اچھا! تو وہ نذر محمد بھی کوئی مرغ باز ہے۔" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔

بالی تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "ہاں جی، پکا مرغ باز۔ لیکن وہ کمینہ بہت چالاک اور مکار بھی ہے۔ پتا ہے، اس نے اپنے کالو کی کیا قیمت لگائی ہے؟"

"کالو غالباً نذر محمد کے مرغ کا نام ہے۔" میں نے پوچھا۔

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے بالی کے سوال کا جواب معلوم نہیں تھا اس لیے میں نے کہا۔ "میں نہیں جانتا، نذر محمد اپنے مرغ کے کتنے پیسے مانگ رہا ہے۔"

"پورے ایک سو روپے جناب!" بالی دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر وسعت کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ "غضب خدا کا! اس کلموہے کے سو رپے۔"

اس زمانے میں سو رپے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔

ایک مزدور کی ماہا اجرت چالیس پچاس روپے سے زیادہ نہیں تھی۔ پورے گھر کا مہینہ بھر کا راشن پچیس روپے میں آ جاتا تھا۔ اچھی گندم پانچ روپے من اور سونا اسّی روپے کا تولہ فروخت ہوتا تھا لیکن کہتے ہیں، شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ بعض لڑاکا مرغ اور بٹیر انتہائی مہنگے داموں فروخت ہوتے ہیں بلکہ میں نے تو سن رکھا ہے، نامی گرامی بازی گر اور شوقین افراد اپنے جانوروں کی باقاعدہ نیلامی بھی کرواتے ہیں۔

میں نے بالی سے پوچھا۔ "کیا سلامو کے پاس اتنی رقم ہے کہ وہ نذر محمد کا "کالو" خرید سکے؟"

"اس کے پلے تو کچھ بھی نہیں۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "لیکن وہ اپنا شوق پورا کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ مرغ بازی اس کی رگ رگ میں رچی بسی ہے۔ جب تک وہ کوئی اصیل لڑاکا مرغ حاصل نہیں کر لے گا، اسے چین نہیں آئے گا۔"

میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔ "جب سلامو کے پاس رقم نہیں تو پھر وہ کالو کو کیسے حاصل کرے گا۔ کیا کوئی ادھار یا قسطوں والا معاملہ ہے؟"

"نہیں جی!" بالی نے نفی میں گردن جھٹکی۔ "اس قسم کے سودوں میں ادھار اور قسطیں نہیں چلتیں حالانکہ سلامو نے نذر محمد کو ایسی پیش کش کی تھی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہتا ہے، نقد سو روپیا لاؤ اور کالو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ کم بخت کالو ہے بھی تو شیر جتنا۔ اس کی بہادری اور لڑنے کے انداز نے نذر محمد کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ منحوس ایک پیسا کم کرنے کو تیار نہیں۔"

"تو پھر سلامو کا شوق کیسے پورا ہوگا؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''مجھے ہی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ سلامو بھی رقم کے بندوبست کے لیے مجھ پر زور ڈال رہا ہے۔''

''تم کیا بندوبست کرو گی؟'' میں نے حیرت سے چادر پوش بالی کو دیکھا۔

وہ دکھی لہجے میں بولی۔ ''میرے پاس ایک جوڑی جھمکے بچے ہیں۔ پورے ڈیڑھ تولے کے ہیں۔ انہیں سنار کے ہاتھ بیچ دوں گی۔ اس طرح سلامو کا شوق پورا ہو جائے گا۔''

بالی کے لہجے میں بے چارگی اور درماندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھرتے محسوس کیے۔ حقیقی معنوں میں اس وقت مجھے اس پر ترس آرہا تھا۔ وہ شوہر پرستی اور وفا شعاری کی ایک عظیم مثال نظر آرہی تھی۔ اگر میں اس کے ماضی اور خاندانی پس منظر سے واقف نہ ہوتا اور سلامو کی زوجیت میں گزارے ہوئے آٹھ سالوں کا احوال میرے علم میں نہ ہوتا تو شاید میں اس کے جذبہ ایثار تک نہ پہنچ پاتا۔ مجھے اس وقت بالی پر ایک فخر سا محسوس ہوا۔

وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گئی۔ میرے کوارٹر کے کمرے میں ماتمی اور بوجھل فضا نے جگہ بنالی تھی اور یہ اچھا موقع تھا۔ بالی سے کرید کرنے کا۔ میرے خیال میں لوہا گرم ہو چکا تھا۔ اس وقت میں اس سے جو بھی پوچھتا، اس کا درست اور صحیح جواب ملتا۔ جذبات سے مغلوب مرد، شکستہ دل عورت اور نشے میں چور شرابی جھوٹ بولنے کی غلطی نہیں کرتا۔

میں نے اپنائیت سے لبریز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''بالی! میں تمہارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ تم بہت ہی بہادر اور مثالی عورت ہو!''

اس نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا اور مجروح لہجے میں بولی۔ ''کیا واقعی آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں؟''

اس کا سوال بہت طاقت ور اور انداز یقینی تھا۔ میں اس کا جواب دعوے سے ''ہاں'' نہیں دے سکتا تھا اس لیے محتاط رویہ اپناتے ہوئے میں نے کہا۔

''سب کچھ نہیں، بہت کچھ۔''

''اوہ!'' اس کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''بالی! میں نے تمہاری گزری ہوئی زندگی کے بارے میں اچھی خاصی چھان بین کی ہے۔ مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا ہے لیکن ابھی بہت کچھ جاننا باقی ہے۔ تمہاری ذات ایک زاویے سے میری نظر میں قابل تعریف ہے تو تمہاری ذات کا دوسرا زاویہ الجھن کا باعث ہے۔ میں متذبذب ہوں اور تمہاری شخصیت کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں۔''

''میں آپ کی الجھن کیسے دور کر سکتی ہوں تھانے دار جی!'' اس نے دھیمی مگر ٹھہری ہوئی

آواز میں پوچھا۔ انداز تعاون آمیز تھا اس لیے میں نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم ایک دو باتوں کی وضاحت کر دو تو شاید میری الجھن باقی نہ رہے۔''

''مثلاً کون سی باتیں؟''

''تم نے اب تک مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تم اپنے خاوند سلامو سے بہت ڈرتی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بات بات پر تمہیں زدوکوب کرتا ہے۔ اس کے سامنے تمہاری ایک نہیں چلتی لیکن میں نے تو اس کے برعکس محسوس کیا ہے۔ تمہاری اس روز کی تھانے والی گفتگو کو دیکھتے ہوئے تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ سلامو تمہارے سامنے دبتا اور پھر اس کی ایک واضح وجہ بھی موجود ہے۔''

''کیسی وجہ تھانے دار جی؟'' وہ چونک کر بولی۔

میں نے کہا۔ ''سلامو اول آخر تمہارے احسانوں تلے دبا ہوا ہے۔'' پھر میں نے اس کے ماضی کا احوال مختصراً دہرایا اور بات کو آگے بڑھایا۔ ''تم نے ساری زندگی اس کی خاطر قربانیاں دی ہیں اور ابھی تک دے رہی ہو۔ وہ تم پر کس طرح ہاتھ اٹھا سکتا ہے، کجا یہ کہ وہ مار مار کر تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا دے۔ یہ تضاد میری سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں تھانے دار جی!'' وہ تائیدی انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''واقعی، یہ تضاد کسی کی سمجھ میں نہیں آتا...... اور یہ تضاد درحقیقت سلامو کی ذات میں ہے۔ وہ دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ میں اس کی بیوی ہوں اسی لیے ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں۔ میں اس کی شخصیت کے ایک ایک پہلو سے واقف ہوں۔''

وہ خاموش ہو کر گھائل نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں کچھ نہ بولا اور بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میرے کمرے میں آ کر ریلیکس ہونے کے بعد اس نے چہرے سے چادر ہٹادی تھی اور میں اس کے ماہتابی چہرے کی ایک ایک جنبش کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔ ''تھانے دار جی! کمزور، نالائق اور نکھٹو آدمی لاشعوری طور پر شرمندہ ہوتا رہتا ہے، چاہے وہ اس ندامت کا اظہار کرے یا نہ کرے، اس کا ضمیر اسے ضرور کچوکے دیتا ہے۔ یہ کچوکے اور ضمیر کی خلش اس کے اندر منفی جذبات کو ہوا دیتی ہے۔ اسے بات بے بات پر غصہ آنے لگتا ہے۔ یہ جھنجھلاہٹ اور غصہ اس کی شخصیت میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے۔ سلامو کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کا معاملہ ہے۔''

میں حیرت اور دلچسپی سے اس چار فٹ دس انچ کی بالی کو تک رہا تھا۔ اس کا لہجہ عام دیہاتی عورتوں جیسا ہی تھا تاہم وہ بڑی عقل اور دانش کی باتیں کر رہی تھی۔ لگتا تھا اس نے معقول تعلیم بھی حاصل کر رکھی تھی۔ میں نے اسی حوالے سے پوچھا۔

''بالی! تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟''

''میں نے مڈل کیا ہوا ہے جی۔'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''پوری

آٹھ جماعتیں، لیکن یہ سب شادی سے پہلے کے قصے ہیں۔"

وہ اچانک بہت غم زدہ نظر آنے لگی۔ میں موضوع گفتگو کو تبدیل کرتے ہوئے واپس سلامو کی طرف لے آیا اور پوچھا۔ "بالی! ایک بات تو بتاؤ، ایک طرف تو تم سلامو کے چھینا سے بڑ حسد بلکہ نفرت کرتی تھی اور دوسری جانب تم کالو کی خریداری کے لیے اپنے جھمکے تک بیچنے کو تیار ہو۔ یہ کیا پہیلی ہے۔ کیا تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ کالو کے گھر میں آ جانے کے بعد سلامو پھر تمہیں نظر انداز کر دے گا اور اسی کی دل داری میں صبح شام ایک کر دے گا؟"

"مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہے جی!" وہ پرسوچ انداز میں گردن کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "پر کیا کروں۔ سلامو کی بات مانے بنا بھی چارہ نہیں۔ اگر میں نے جھمکے کی فروخت میں کوئی روڑا اٹکایا تو وہ اپنی اصلیت پر اتر آئے گا اور مجھے اپنے جوڑ جوڑ کو سوا ستیاناس کروانا پڑے گا۔"

"کیا سلامو کی اصلیت یہی ہے؟" میں نے بڑی گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا اصلیت کے لفظ پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور جھٹ سے بولی۔ "کیا مطلب جی؟"

"مطلب یہ کہ۔" میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "کیا واقعی تم سلامو سے مار کھا لیتی ہو میں نے یہ بات پہلے بھی ذرا مختلف انداز میں تم سے پوچھی ہے، مجھے یقین نہیں آ رہا کہ انتہا فرمانبردار نظر آنے والا سلامو تنہائی میں تمہیں زدوکوب کرتا ہوگا۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "تھانے دار جی! ویسے تو میں آپ کے اس سوال کا بڑا تفصیلی جواب دے چکی ہوں لیکن پھر بھی وضاحت کر دوں کہ سلامو بڑا مکرا ہے...... فریبی ہے وہ اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ ہے۔ میں اس کے اصلی روپ سے واقف ہوں۔ وہ لوگوں کے سامنے جیسا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے، وہ بظاہر میرا ہمدرد اور خیال رکھنے والا دکھائی دیتا ہے اس کے رویے کو دیکھ کر سب یہی کہتے ہیں کہ سلامو نے بالی کو بہت اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے۔ بعض عورتیں تو اس کی مثالیں دیتی ہیں اور اٹھتے بیٹھتے یہ دعا کرتی ہیں اللہ ان کی بیٹی کو بھی سلامو جیسا شوہر دے لیکن......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر چند لمحے کے لیے خاموش ہو گئی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے جی اور تپش وہیں محسوس کی جا سکتی ہے جہاں آگ جلتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ بظاہر انتہائی مہذب اور شائستہ نظر آنے والا سلامو تنہائی میں کتنا وحشی اور سفاک ہو جاتا ہے۔ وہ جب ہاتھ پاؤں چلاتا ہے تو یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی انسان ہے۔ اس وقت اس کی بے دردی کی انتہا دیکھنے والی ہوتی ہے۔"

"لیکن ظاہر ہے، کوئی دیکھ نہیں پاتا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اسی لیے سلامو کا اصلی روپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔"

"کیا وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی جارحانہ رویہ رکھتا ہے؟" میں نے پوچھا حالانکہ میں جانتا تھا، وہ کیا جواب دے گی۔

اس نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔ "یہی تو اس کی مکاری اور لاچارگی ہے جی۔ دوسرے لوگوں کے سلسلے میں وہ بہت محتاط رہتا ہے اگر میں کسی سے اس کے ناروا سلوک کی شکایت کروں تو اسے یقین ہی نہ آئے بلکہ وہ الٹا مجھے ہی قصوروار سمجھنے لگے...... اس نے مجھے بری طرح باندھ رکھا ہے۔"

مجھے کچھ کچھ اس کی بات پر یقین آنے لگا۔ بعض مرد اور بعض عورتیں بڑی شاطرانہ نفسیات کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اس مخصوص نفسیات میں جب اداکاری کا تڑکا لگاتے ہیں تو صورت حال پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر سب کی ہمدردیاں انہی کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ سلامو کا شمار بھی ایسے پیچیدہ افراد میں ہوتا تھا۔

میں نے بالی سے استفسار کیا۔ "کیا تم نے کبھی کسی کے سامنے سلامو کے نامعقول رویے کا تذکرہ کیا؟"

"نا جی!" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "آپ پہلے آدمی ہے جس کے سامنے میں نے زبان کھولی ہے اور وہ بھی انتہائی مجبور ہو کر، خیر سلامو کا سلوک تو اتفاقاً بیچ میں آ گیا، میں درحقیقت اس کی زندگی کی طرف سے پریشان ہوں۔ اگر آپ ماکھا کا کوئی پکا بندوبست کر دیں تو میں ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گی۔"

"وہ تو میں کروں گا۔ تم اس سلسلے میں اپنی جان نہ گھلاؤ۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اور اب ایک آخری بات یہ بتا دو کہ آخر سلامو کو تم سے شکایت کیا ہے۔ وہ تم سے ایسا وحشیانہ برتاؤ کیوں کرتا ہے؟"

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "یہ تو آپ اسی سے پوچھیں جی!"

"اس سے تو پوچھوں گا ہی۔" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ "تمہارے بارے میں، میں جو کچھ جان پایا ہوں اور اپنے متعلق تم نے جس حد تک بتایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے ہمیشہ اس کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ وہ تمہارے احسانات کے نیچے دبا نظر آتا ہے۔ اسے تو چاہیے وہ تمہارے پاؤں دھو کر پیے، کجا یہ کہ وہ تمہارے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کرتا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے خلا میں گھورنے لگی۔ وہ اس وقت انتہائی سنجیدہ اور پُرسوچ دکھائی دے رہی تھی، میں نے بھی زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی اور سوالیاتی جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس سے پوچھنے والی کوئی بات باقی نہیں بچی تھی۔

وہ جس طرح پراسرار انداز میں چھپتے چھپاتے تھوڑی دیر پہلے میرے کوارٹر میں پہنچی تھی، بالکل اسی محتاط انداز میں رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کے

بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایسی ہی تھی کہ اس سے متعلق زیادہ سے زیادہ سوچا جاتا!''

بالی نے اگر دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا تو وہ ایک مظلوم اور متاثرہ عورت تھی۔ مظلوم کی فریاد پر کان دھرنا قانون کا عین فرض ہے۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ سلامو کو تھانے بلا اس کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کروں گا۔

❀❀❀

آئندہ روز میں سلامو کی طرف بندہ روانہ کرنے ہی والا تھا کہ ماکھا تھانے پہنچ گیا۔ میں نے ماکھا کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ صبح شام تھانے میں حاضری لگوائے۔ اس پر نگاہ پڑی تو بالی کی بات میرے ذہن میں گھوم گئی۔ میں نے فی الفور اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

اس نے میرے کمرے میں داخل ہو کر بڑا عاجزانہ سلام پیش کیا جس میں کسی حد تک عیاری بھی شامل تھی پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا، وہ پوچھ بیٹھا۔

''حضور! یہ صبح شام کی حاضری کب تک چلے گی؟''

''جب تک تمہاری سانس چل رہی ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور مجھے محسوس ہو رہا ہے، تمہاری سانس بھی میرے ہاتھوں ہی بند ہو گی۔''

وہ گھگھیایا۔ ''سرکار! ایسا غضب نہ کریں۔'' اس کی گھگھیاہٹ میں مصنوعی پن تھا۔ ''میں ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ آپ میری سانس بند کر دیں گے۔''

تمہارے جرم کے بارے میں تو بعد میں فیصلہ ہو گا۔'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو میں دیکھ رہا ہوں تم پر میری کسی نصیحت کا اثر نہیں ہو رہا۔ میں سوچ رہا ہوں کیوں نا تمہیں چند دنوں کے لیے حوالات کی سیر کروا دوں۔ وہاں کی فضا اور آب و دانہ تمہیں راس آئے گا۔''

وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''جناب! میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔'' اس کے چہرے پر سجے مصنوعی تاثرات اچانک غائب ہو گئے اور وہ خاصا سنجیدہ نظر آنے لگا۔

میں نے کڑک کر کہا۔ ''سمجھ کی ناسمجھ اولاد! میں نے تمہیں کتنی سختی سے منع کیا تھا کہ تم سلامو اور سلطان پورہ سے دور رہو گے۔''

''آپ مجھ سے قسم لے لیں جناب!'' وہ متذبذب نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نہ تو ان دنوں میں سلامو سے ملا ہوں اور نہ ہی میں نے سلطان پورہ میں قدم رکھا حتیٰ کہ میں نے سلامو کو کہیں اور بھی نہیں دیکھا۔ میں نے تو اس منحوس آدمی کو اپنے دماغ سے نکال دیا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ''آخر بات کیا ہے جناب!''

میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم حسین آباد کے حنیفو کو جانتے ہو؟''

''جانتا ہوں جی!'' وہ الجھن بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''کیا تم پچھلے دونوں اس سے ملے تھے؟''

''جی، ملا تھا جناب!''

''تم نے حنیفو سے کیا بکواس کی ہے؟''

وہ آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں جناب!''

''کیا تم نے حنیفو سے یہ نہیں کہا کہ چینا کے بعد سلامو کی باری ہے۔''

وہ ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد بولا۔ ''اوہ، اچھا تو یہ بات ہے۔''

''یہ بات ہے کے گھوڑے۔'' میں نے اسے کھا جانے والی نظر سے گھورا۔ ''کیا تمہاری اس بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ چینا کی موت میں تمہارا ہاتھ ہے اور تم سلامو کو بھی کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہو؟''

وہ چند لمحے مجھے ایسی نگاہ سے دیکھتا رہا جیسے مجھے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''یہ حنیفو والی بات آپ تک کیسے پہنچی ہے؟''

''سوال نہیں کرو، صرف بات کا جواب دو۔'' میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے مجھ پر جو پابندیاں عائد کر رکھی ہیں وہ صرف اور صرف سلامو کی وجہ سے ہیں۔ اور ان پابندیوں نے مجھے جھنجلا کر رکھ دیا ہے۔ میں بستی بستی، نگر نگر گھومنے والا ایک آزاد پنچھی تھا۔ آپ نے میری آزادی سلب کر کے ایک مخصوص علاقے تک محدود کر دیا ہے۔'' وہ چند لمحات کے لئے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی! حنیفو بھی میری طرح گھومنے پھرنے کا شوقین ہے۔ ہماری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا۔ ''ماکھا! چلو، لاہور کا چکر لگا کر آتے ہیں۔'' میں نے مایوسی سے کہا فی الحال یہ ممکن نہیں۔ اس نے وجہ دریافت کی تو میں نے اسے اصل سبب سے آگاہ کر دیا اور ساتھ ہی تلخی سے یہ بھی کہ سلامو کا چینا تو ختم ہو گیا۔ اب اللہ کرے یہ بدبخت بھی ختم ہو جائے تا کہ مجھ پر لگی ہوئی پابندیاں ختم ہو سکیں لیکن جناب!'' وہ ایک لمحہ متوقف رہنے کے بعد بولا۔ ''بات کچھ کی کچھ ہو گئی۔ آپ کہہ رہے ہیں میں نے سلامو کو ختم کرنے کی بات کی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے جھنجلا کر اسے بددعا دی تھی۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی امید تھی کہ اس قضیئے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یہ جو حنیفو، خالہ آسیہ، ماسی جنت، نذیراں بی بی، چاچی رسولاں اور زبیدہ کا رُٹ سامنے آیا تھا، اس نے معاملے کو نہ صرف مشکوک بلکہ ناقص بھی بنا دیا تھا۔ ناقص معلومات اور کمزور حقائق پر کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ میں نے ماکھا کو چند نئی ہدایات دیں اور تھانے سے رخصت کر دیا۔

دوپہر کے بعد، میں نے سلامو کی جانب ایک کانسٹیبل کو روانہ کیا جس نے تھوڑی دیر بعد

واپس آکر اطلاع دی کہ سلامو باغ پورہ سے ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اس کانسٹیبل نے بالی کو تاکید کر دی تھی کہ جیسے ہی سلامو گھر پہنچے، وہ اسے تھانے بھیج دے۔

لگ بھگ دو بجے دوپہر تھانے میں بلوے اور فساد کا ایک کیس آ گیا جو کسی دیرینہ خاندانی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ اس دنگے میں نصف درجن افراد شدید زخمی ہوئے تھے تاہم کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ دونوں پارٹیاں زمین دار اور طاقتور تھیں اور ان کے کرتا دھرتا تھانے میں بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے میں نے اس کیس میں چار پانچ افراد کو پکڑ کر حوالات کے اندر بھی کر دیا تھا جن میں دونوں پارٹیوں کے بندے تھے...... اور اب ان کے ولی نعمت مجھے اپنی پہنچ اور تعلقات سے متاثر کر کے اپنے بندوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان لوگوں سے نمٹتے ہوئے شام ہو گئی۔ دونوں زمین دار گھرانوں کا پس منظر بڑا دلچسپ اور دشمنی بڑی ہلاکت خیز ہے۔ بعد میں کچھ ایسے خطرناک واقعات پیش آئے جو ایک مکمل کہانی کا تقاضا کرتے ہیں۔

❁❁❁

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، میں گرم بستر میں دبکا مزے دار نیند سو رہا تھا کہ مجھے اس پُرسکون اور خوشگوار نیند کو خیرباد کہنا پڑا۔ میری آنکھ اچانک کھل گئی، میں نے اپنی سماعت میں تیز دستک کی آواز سنی۔ یقینی طور پر وہ زوردار دستک میرے کوارٹر کے دروازے پر دی جا رہی تھی۔ اس صورت حال میں بستر چھوڑنا لازمی ہو گیا۔

میں افراتفری کے عالم میں چلتے ہوئے کوارٹر کے بیرونی دروازے پر پہنچا۔ اس دوران میں، میرے ذہن میں مختلف سوالات ڈوب ابھر رہے تھے۔ ایک خیال بالی سے متعلق بھی تھا۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ گزشتہ رات کی طرح وہ آج بھی نہ آ گئی ہو لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے اس خیال کی تردید کر دی۔ ایک تو اس وقت رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، دوسرے دستک کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بالی نہیں ہو سکتی۔

بالی تو ہمیشہ میرے سونے سے پہلے آئی تھی اور اس نے بہت محتاط دستک دی تھی۔

میں نے کوارٹر کا بیرونی دروازہ کھولا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ میری نگاہ بالی کی بجائے ایک کانسٹیبل کے چہرے پر پڑی۔ وہ چہرہ حواس باختہ اور خاصا گھبرایا ہوا تھا۔ یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

میں نے کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے منظور! تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟''

''جناب! ایک بندہ قتل ہو گیا ہے۔'' منظور نے جلدی سے کہا۔

یہ اطلاع ایسی تھی کہ میں چونک اٹھا۔ ''کون قتل ہوا ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ منظور نے بتایا۔ ''مقتول کا نام سلام دین اور عرف سلامو ہے جی۔ وہ ادھر سلطان پورہ میں

رہتا ہے، تھانے میں اس کی بیوی بالی بیٹھی ہوئی ہے۔''

بالی کے ذکر پر میں ایک مرتبہ پھر چونکا۔ اس سے پہلے وہ دو مرتبہ آ کر مجھ سے ملی تھی اور دونوں ہی مرتبہ میرے کوارٹر میں۔ آج اس نے ادھر کا رخ کرنے کی بجائے تھانے جانا مناسب سمجھا۔ کیوں؟ یہ ایک انوکھا سوال تھا جس کا جواب بالی ہی دے سکتی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے کہا۔ ''تم چلو، میں پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔''

وہ مجھے سلیوٹ کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے جلدی جلدی مناسب لباس پہنا اور تھانے پہنچ گیا۔ وہاں بالی کے ساتھ ایک اور مرد بھی نظر آیا۔ ازاں بعد مجھے معلوم ہوا وہ اس کا پڑوسی تھا جو ازراہِ ہمدردی اس کے ساتھ تھانے تک چلا آیا تھا۔

میں نے بالی کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مذکورہ شخص نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو میرے اشارے پر کانسٹیبل نے اسے روک دیا۔

بالی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ غم کے باعث اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے نرمی سے دریافت کیا۔ ''کیا ہوا بالی! سلامو کو کس نے قتل کر دیا؟''

وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہی تھا...... وہی شیطان...... اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا......''

اس کے بے ربط الفاظ اور شکستہ باتوں نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے استفسار کیا۔ ''تم کس شیطان کا ذکر کر رہی ہو؟''

وہ سسک اٹھی۔ ''تھانے دار جی...... میں ماکھا کی بات کر رہی ہوں۔''

''کیا؟'' میں اچھل پڑا۔ ''کیا ماکھا نے سلامو کو قتل کر دیا...... کب، کہاں؟''

حیرت کے باعث الفاظ بڑی تیزی سے میرے منہ سے نکلے۔ وہ شکستہ آواز میں بولی۔ ''ابھی...... تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے وہ...... وہ ادھر...... گھر ہی میں پڑا ہے...... میرا مطلب ہے، اس کی لاش کمرے میں ایک چارپائی پر پڑی ہے...... آپ خود چل کر دیکھ لیں۔''

''کیا تم نے ماکھا کو یہ قتل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں......'' وہ ایک مرتبہ پھر سسکی۔ ''جب میری آنکھ کھلی تو وہ جا رہے تھے۔ میں نے انہیں صحن عبور کر کے بیرونی دروازے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔''

بالی کے بیان نے مجھے الجھا دیا۔ اس نے جمع کا صیغہ استعمال کیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا ماکھا کے ساتھ کوئی اور بھی تھا...... تم نے ان لوگوں کا ذکر کیا ہے؟''

''ج...... جی......'' ہکلاہٹ بھری آواز میں اس نے بتایا۔ ''وہ کل تین افراد تھے۔ ماکھا اور اس کے دو ساتھی۔''

"تم ماکھا پر زور دے رہی ہو۔" میں نے گہری نظر سے گھورا۔ "کیا تم نے ماکھا کو پہچان لیا تھا؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے اس کے ڈیل ڈول اور جثہ سے اندازہ لگایا ہے، شکل نہیں دیکھ سکی۔"

"تو تم صرف اندازے کی بنا پر ماکھا کو قاتل گردان رہی ہو؟"

"مجھے یقین ہے تھانے دار جی، پکا یقین ہے۔" وہ روہانسا ہوگئی۔

میں نے اس نازک موقع پر اس سے جرح کرنا مناسب نہ سمجھا اور ضروری تیاری کے بعد سلطان پورہ روانہ ہوگیا۔ میں نے حوالدار قادر بخش اور کانسٹیبل فدا حسین کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

سلطان پورہ میرے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ جب ہم بالی کے گھر پہنچے تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس واقعے کی خبر آس پاس کے لوگوں کو ہو چکی تھی۔ جب ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو دروازے کے قریب لگ بھگ آٹھ افراد کھڑے نظر آئے جو آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم پر نظر پڑی تو وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ ہم بالی کے گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

وہ گھر پانچ مرلے پر بنا ہوا ایک سادہ سا مکان تھا۔ کراچی کے رہنے والے اسے ایک سو بیس گز کا مکان سمجھ لیں۔ گھر کے پچھلے حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے جن کے آگے پچیس چھبیس فٹ طویل اور آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ تھا۔ کمروں اور برآمدے کا فرش کچا تھا۔ اس کے بعد صحن آتا تھا۔

وسیع و عریض صحن کے وسط میں جامن کا ایک قد آور درخت کھڑا تھا۔ کمروں اور برآمدے کے بعد ایک دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور غسل خانہ بنائے گئے تھے۔ اس کے بعد ایک ڈربا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ انار اور امرود کا ایک ایک پیڑ استادہ تھا۔

ڈربے کی دو دیواروں میں جالی لگی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً وہی ڈربا تھا جس میں چند روز پہلے چینا رہائش پذیر تھا۔ میں بالی کی راہ نمائی میں اس کمرے تک پہنچا جہاں اس کے بقول سلامو کو قتل کیا گیا تھا۔

وہ بارہ ضرب پندرہ کا ایک عام سا کمرا تھا۔ ایسا ہی ایک کمرا اس کے برابر میں بھی بنا ہوا تھا۔ بالی نے مجھے بتایا کہ سلامو اس رات اس سے الگ دوسرے کمرے میں سو رہا تھا "شاید" کہنا ٹھیک نہ ہوگا ان میں یقیناً کوئی ان بن ہوگئی ہوگی جو وہ دو علیحدہ کمروں میں رات گزار رہے تھے۔

میں نے لالٹین کی روشنی میں سلامو کی لاش کا معائنہ کیا اور پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ ایک خوف ناک خنجر دستے تک اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست نظر آ رہا تھا۔ اس کا کرتہ اس جگہ سے خون میں تر بہ تر ہو رہا تھا۔ خون کی حالت کو

دیکھتے ہوئے پتا چلتا تھا، سلامو کی موت واقع ہوئے ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔

میں نے الٹ پھیر کر لاش کا تفصیلی جائزہ لیا اور اہم پوائنٹس اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا گیا۔ اس کمرے میں چھوٹے بڑے عام سامان کے ساتھ صرف ایک چارپائی تھی جو کمرے کی عقبی یعنی شمالی دیوار کے ساتھ بچھی تھی۔ سلامو کو اس چارپائی پر سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔

لاش کے معائنے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا اور موقع کی کارروائی ختم کر دی۔ بالی نے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ قاتل ماکھا کے سوا کوئی اور نہیں تھا لہٰذا کھرا وغیرہ اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ماکھا کو میں جب چاہتا اپنے پاس تھانے بلا سکتا تھا۔ ویسے وہ آج شام میں بھی تھانے میں حاضری لگوا کر گیا تھا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ماکھا نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا!

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال بھجوانے کے بعد میں بالی کو ایک کمرے میں لے کر بیٹھ گیا۔ اس کا تفصیلی بیان ازحد ضروری تھا۔ موقع پر جو دوسرے لوگ مجھے دکھائی دیئے، میں نے ان سے بھی پوچھ تاچھ کی لیکن وہ اس واقعے سے بے خبر تھے۔ ان میں سے کسی نے ماکھا یا اس کے ساتھیوں کو بالی کے گھر میں داخل ہوتے یا وہاں سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

بالی سے گفتگو کا آغاز کرنے سے پہلے میں نے حوالدار قادر بخش کو تھانے بھیج دیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنے ساتھ دو کانسٹیبلو کو لے کر اس وقت ماکھا کے گھر واقع فرید نگر پہنچ جائے اور اسے گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دے۔ حوالدار میری بات کی تہ میں پہنچ گیا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوگیا۔

میں بالی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ غم سے نڈھال تھی۔ وہ اس وقت جس جذباتی صدمے سے گزر رہی تھی، مجھے ڈر تھا، کہیں اس کا دماغ ہی نہ الٹ جائے۔ میں اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ اس وقت اسے سچی ہمدردی کی ضرورت تھی۔ میں جانتا تھا، سلامو کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ جیسا تیسا بھی تھا، اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا۔ میرے خلوص اور ہمدردی کے کلمات نے حیرت انگیز اثر دکھایا۔

جب وہ قدرے نارمل ہوگئی تو میں نے اس سے واقعے کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ تھوڑی دیر تو گم صم خلا میں دیکھتی رہی پھر اس نے رک رک کر مجھے تفصیل بتائی۔ وہ بار بار رونے لگتی تھی اور اس کے بیان میں تعطل پیدا ہو جاتا۔ آدھے پونے گھنٹے کی محنت کے بعد میں اس سے صرف اتنا معلوم کر سکا کہ وقوعہ کی رات شام ہی سے ان میں نوک جھوک ہونے لگی تھی۔ بالی نے اسے میرے پیغام کے بارے میں بتایا تو اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ تھانے مجھ سے ملنے آیا اور نہ گھر سے باہر کہیں گیا۔ وہ کالو سے بات شروع کرتا اور کالو پر ہی اس کی بات ختم ہو جاتی۔ کالو کو حاصل کرنا اس کی زندگی کا خواب بن گیا تھا۔ پتہ نہیں باغ پورہ کے اس مرغ نے سلامو پر

کیا سحر پھونک دیا تھا کہ اسے اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

سلامو نے جب بالی سے جھمکے بیچنے کی بات کی تو تھوڑی پس و پیش کے بعد وہ اس کی خواہش پوری کرنے پر تیار ہو گئی۔ بعد میں سلامو نے جھگڑے کی کوئی اور راہ نکال لی۔ اس جھگڑے نے رات کا کھانا بھی غارت کر دیا۔ پھر وہ سونے کے لئے کمرے میں پہنچے تو سلامو نے دوسرے کمرے کا رخ کیا حالانکہ وہ پہلے ساتھ ہی ایک کمرے میں سوتے تھے۔ بالی نے سمجھا کہ شاید سلامو غصے اور ناراضی کے سبب سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلا گیا ہے۔ سلامو کی طرف سے اس کا دل بہت دکھا ہوا تھا۔ لہٰذا اس نے سلامو کی پروا نہ کی اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ پھر جلد ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس کی آنکھ آدھی رات کے وقت اچانک کھل گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا، گھر میں کسی قسم کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ اس نے بستر چھوڑا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسی وقت اس نے صحن میں تین افراد کو جاتے ہوئے دیکھا۔ بیرونی دروازہ کھلا پڑا تھا اور وہ لوگ وہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ انہی تین میں سے بالی نے ایک کو پہچان لیا۔ بالی نے اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھا تھا تاہم اسے یقین تھا، وہ ماکھا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

ماکھا کا خیال آتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا اور وہ اس کمرے کی جانب پلٹی جہاں سلامو سویا ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے صورت حال اس پر واضح ہو گئی۔ ایک خطرناک خنجر سلامو کے سینے میں گڑا تھا اور وہ خون میں لت پت چارپائی پر مُردہ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے پہنچ گئی تھی۔

میں بالی کا مفصل بیان قلم بند کر چکا تو وہ خاصی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا، اب اس سے سوال جواب بھی کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''بالی! جب تمہاری آنکھ کھلی تو تم نے محسوس کیا، گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس نے زبان سے جواب نہیں دیا۔ آنکھوں میں میرے سوال کے لئے تائیدی تاثرات تھے، گویا میں اس کے نزدیک غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ میں نے دریافت کیا۔

''بالی! جب گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی تم کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئیں تو تم نے بہ قول خود، ماکھا کو اس کے دو ساتھیوں کے ہمراہ گھر کے کھلے ہوئے بیرونی دروازے سے نکلتے دیکھا۔ تم سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا تم لوگوں نے رات سونے سے پہلے وہ دروازہ بند نہیں کیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، بیرونی دروازہ بند کیا گیا تھا۔'' پھر وہ کسی فوری خیال کے تحت بولی۔ ''آپ ہمارے صحن کی چار دیواری تو دیکھ ہی چکے ہیں۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں۔ ممکن ہے، ان تینوں میں سے کوئی ایک کود کر اندر آ گیا ہو اور اس نے اپنے

ساتھیوں کے لئے دروازہ کھول دیا ہو۔''

''ہاں، ایسا ممکن تو ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''کیا تم لوگوں نے دروازے کو اندر سے کوئی تالا وغیرہ نہیں لگایا تھا؟''

''نہیں جی، ہم دروازے کو صرف کنڈی لگاتے ہیں۔'' بالی نے جواب دیا۔ ''اس قسم کے واقعے کے بارے میں تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

میں نے ایک اہم بات کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ ''بالی! تمہیں تو شدت سے یہ احساس بلکہ یقین تھا کہ ماکھا تمہارے خاوند کو کوئی نقصان پہنچانے کی تاک میں ہے۔ اس صورت میں تو تم لوگوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔''

وہ آب دیدہ ہو گئی اور بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''مجھے کیا پتہ تھا، وہ کافر کا بچہ گھر میں گھس کر سلامو کے سینے میں خنجر اتار دے گا۔ میں تو سمجھ رہی تھی، وہ باہر ہی کہیں اس سے الجھنے کی کوشش کرے گا۔''

''تم نے مبینہ ماکھا اور اس کے ساتھیوں کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اس کی آنکھیں برس چکی تھیں اور مزید چھلکنے کو تیار تھیں۔ اس کے گداز گالوں پر آنسوؤں نے جولڑیاں پروئی تھیں، ان کی راہ ابھی باقی تھی۔ سوگواریت کی اس فضا کو لالٹین کی مخصوص ماتمی روشنی نے سوا کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی اجڑے دیار میں آ گیا ہوں یا کسی سنسان قبرستان کے ویران مرقد پر دیپ جلانے آیا ہوں یا پھر...... یا پھر...... میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ لب تو پہلے ہی خاموش تھے، سوچ بھی تھم گئی۔

بالی نے میرے سوال کے جواب میں اپنی گردن کو نفی میں جنبش دی تو اس کے نین کٹورے چھلک گئے۔ گنگنے نمکین آنسوؤں کی ایک ننھی اور مختصر سی پھوار نے میرے دل پر دستک دی تو میں تڑپ کر رہ گیا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ بیوہ کے آنسوؤں میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ یہ آنسو اپنے اندر کتنی چیخیں روکے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان نوحہ گر آنسوؤں کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ اپنی بے زبانی سے وار کرتے ہیں...... اور بڑا کاری وار کرتے ہیں!

بالی کے بے زبان آنسوؤں نے میری زبان پر خاموشی کا قفل ڈال دیا اور میں مزید کوئی سوال کئے بغیر اس کے گھر سے اٹھ آیا۔

❀❀❀

دیوار گیر کلاک نے رات کے تین بجنے کا اعلان کیا تو میں اپنے کمرے سے اٹھ گیا۔ اس وقت تک حوالدار قادر بخش ماکھا کو گرفتار کر کے تھانے نہیں پہنچا چکا۔ تھانے آتے ہی مجھے اتنا تو معلوم ہو گیا تھا، قادر بخش دو کانسٹیبلو کے ساتھ فرید نگر روانہ ہو گیا تھا جہاں ماکھا کا گھر تھا۔ اب

تک اسے واپس آ جانا چاہیے تھا۔ اس تاخیر کا سبب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا، یا تو ماکھا اپنے گھر میں نہیں ملا یا پھر اس نے گرفتاری دینے میں کوئی رخنہ ڈال دیا ہے۔ بہر حال، وجہ جو بھی رہی ہو، میرے لئے تشویش کی بات ضرور تھی۔

میں نے شبینہ ڈیوٹی والے اے ایس آئی کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ماکھا کی آمد پر اس کا خاص خیال رکھنے کو کہا جس پر اس نے مجھے اس کی خاطر مدارات کا یقین دلایا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں موجود ایک خاص قسم کی چمک دیکھی تو تنبیہی انداز میں کہا۔ ''فضل الٰہی! فی الحال خاطر مدارات کی ضرورت نہیں، صرف ''مزاج پرسی'' سے بھی کام چل جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بڑا ہولا ہتھ رکھوں گا۔ آپ کو کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ملے گی۔''

میں مطمئن ہو کر اپنے کمرے سے نکل آیا۔

اگلا دن خاصا روشن اور امید افزا تھا۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ ماکھا کو حوالات میں پہنچایا جا چکا ہے۔ میں نے حوالات کے نگراں حوالدار قادر بخش کو فوراً اپنے پاس بلا لیا۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد سلیوٹ کیا۔ اس کے چہرے پر کامیابی کی جھلک تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''قادر بخش! تم کتنے بجے واپس آئے تھے؟''

''اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔

میں نے کہا۔ ''اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ فرید نگر اتنا دور تو نہیں؟''

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ ماکھا فرید نگر میں نہیں ملا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ ماکھا کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اریب قریب کے لوگوں سے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ وہ آدھی رات کے وقت گھر سے کہیں چلا گیا ہے۔ سردیوں میں رات کے اس پہر سب لوگ گرم لحافوں میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ حوالدار نے جس شخص سے ماکھا کے بارے میں پوچھا، وہ اتفاق سے ماکھا کا دوست بھی تھا بلکہ آدھی رات تک وہ ماکھا کے ساتھ ہی تھا۔ اسلم عرف اچھو نامی اس بندے نے حوالدار کو بتایا کہ ماکھا مدینہ کالونی میں پرویز عرف پیجا کے گھر گیا تھا۔

مدینہ کالونی اور فرید نگر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور ان کے درمیان ریلوے لائن گزرتی تھی جبکہ سلطان پورہ اور مدینہ کالونی آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ حوالدار، ماکھا کی تلاش میں دو کانسٹیبلو کے ساتھ فرید نگر سے مدینہ کالونی پہنچ گیا پھر پرویز عرف پیجا کا گھر ڈھونڈنے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اچھو نے قادر بخش کو پیجا کے گھر کی درست لوکیشن بڑی وضاحت سے سمجھا دی تھی۔

حوالدار یہ تفصیل بیان کر چکا تو میں نے دریافت کیا۔ ''قادر بخش! ماکھا نے گرفتاری دینے میں اودھم تو نہیں مچایا؟''

''کوشش تو کی تھی جناب! لیکن میں نے اس کی پیش نہیں چلنے دی۔'' حوالدار سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے سلامو کے قتل کے الزام میں ہتھکڑی پہنا رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے ماکھا کو وجہ گرفتاری بتا دی ہے؟''

حوالدار نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔ ''جناب! وہاں پیجا کے گھر میں پیجا اور ماکھا کے علاوہ دو افراد اور بھی موجود تھے۔ یہ چاروں تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ جب سب نے باری باری مجھ سے پوچھا کہ میں کس جرم میں ماکھا کو گرفتار کر رہا ہوں تو میں نے بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ کیا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ماکھا نے اس واردات کے بارے میں کوئی انکشاف کیا، میرا مطلب ہے وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے؟''

''وہ سلامو کے قتل سے انکاری ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔

''اس کی زبان کھلوانے کے لئے کوئی چارہ جوئی کی گئی ہے؟''

''اے ایس آئی کے ایما پر ہم نے ایک چھوٹی سی ٹرائی کی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''پھر اس ٹرائی کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا؟''

''نہیں جناب! وہ زبان کھولنے پر آمادہ نہیں۔'' قادر بخش نے بتایا۔ ''میرا خیال ہے، ماکھا جیسے سانڈ کے لئے ہمیں آزمودہ فارمولاز کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس چھوٹی موٹی ٹرائی سے بات نہیں بنے گی۔''

''ٹھیک ہے، تم ماکھا کو میرے کمرے میں لے آؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

چند لمحات کے بعد حوالدار نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

ماکھا کمرے میں آیا تو میں غضب ناک نظر سے اسے گھورنے لگا۔ حوالدار بھی وہیں رک گیا اور میری طرف سے کسی مخصوص اشارے کا انتظار کرنے لگا لیکن میں نے ماکھا سے پوچھ گچھ کرنے سے پہلے حوالدار کو وہاں سے ہٹا دیا۔

جب ہم کمرے میں اکیلے رہ گئے تو ماکھا نے فریادی لہجے میں کہا۔ ''تھانے دار جی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی جس کی سزا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی؟''

میں نے کہا۔ ''ماکھا! تم سے وہ غلطی سرزد ہوئی ہے جو تمہیں پھانسی کے پھندے تک لے جائے گی۔ بتاؤ، تم نے سلامو کو کیوں قتل کیا؟''

''م...... میں نے کسی کو قتل نہیں کیا جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھ پر

جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔ آپ سے پہلے آپ کے بندوں نے مجھ پر بہت ظلم کیا ہے۔ وہ مجھے مارتے تھے اور یہی مطالبہ کرتے تھے کہ میں اپنا جرم قبول کرلوں، یہ اقرار کرلوں کہ میں نے سلامو کی جان لی ہے۔ لیکن جناب جب میں نے اس کا قتل کیا ہی نہیں تو تسلیم کیسے کرلوں؟"

میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ "تمہارے ساتھ دوسرے دو افراد کون تھے۔ ذرا ان کے نام بتاؤ۔ میں انہیں بھی تفتیش میں شامل کروں گا۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔" بات ختم کر کے میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

ماکھا کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے پوچھا۔ "تھانے دار جی! آپ کن دو افراد کا ذکر کررہے ہیں؟"

"یہ بھی میں ہی بتاؤں گا کہ میں کن دو افراد کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟" میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے ان دو ساتھیوں کا تذکرہ کررہا ہوں جن کی معیت میں گزشتہ رات سلامو کے گھر میں داخل ہوئے تھے اور تم لوگوں نے اس بے قصور کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب کچھ یاد آیا یا میں کوئی سنگین طریقہ اپناؤں؟"

وہ یک دم انتہائی سنجیدہ نظر آنے لگا۔ "تھانے دار صاحب! میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں سلامو کے گھر میں داخل ہوا ہوں اور نہ ہی میں نے یا میرے کسی ساتھی نے اسے قتل کیا ہے۔ آپ کو میرے کسی دشمن نے ورغلایا ہے، میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔"

"تمہارا ایسا دشمن کون ہوسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔ "ہر انسان کے دوست دشمن تو ہوتے ہیں۔ پتا نہیں یہ وار کس دشمن نے کیا ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سلامو کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ نے تو جس دن سے مجھ پر پابندی لگائی ہے، میں نہ تو سلطان پورہ میں داخل ہوا ہوں اور نہ ہی سلامو کو دیکھا ہے۔"

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "ماکھا! اب بھی وقت ہے، سچ اُگل دو۔ میں تمہارے ساتھ رعایت برتنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے یہ بات اسے چکر دینے کے لئے کہی تھی۔ "اگر یہ لمحات گزر گئے تو پھر میں تمہیں جس عذاب سے گزاروں گا اس کا تصور بھی تم پر کپکپی طاری کردے گا۔"

"جناب! میں نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔" وہ منت آمیز انداز میں بولا۔ "میں واقعی نہیں جانتا، سلامو کا قاتل کون ہے؟"

"میں تمہاری زبان پر کیسے اعتبار کرلوں؟"

"میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں جناب!" وہ تیز آواز میں بولا۔

اس نے قسم والی بات دہرائی تو میں نے کہا۔ "ماکھا! قسمیں کھانے سے بات نہیں بنے گی۔ تمہیں دو افراد کے ساتھ جائے واردات سے فرار ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اس لئے تم کسی

بھی طرح جان نہیں بچا سکو گے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکنے لگا پھر حیرت سے معمور لہجے میں مستفسر ہوا۔ "کس نے دیکھا ہے مجھے۔ ذرا اس جھوٹے کا نام تو بتائیں۔ میں اس بدبخت کو چیر کر رکھ دوں گا۔"

"ماکھا! تم اس وقت تھانے میں ایک فرض شناس تھانہ انچارج کے سامنے کھڑے ہو۔" میں نے پھنکار کر کہا۔ "تمہارے یہ دھمکی آمیز الفاظ جن خطرناک عزائم کو ظاہر کرتے ہیں، وہ پھانسی کے پھندے کو تمہاری گردن کے بہت نزدیک کردیں گے۔ یہ قتل کی کھلی دھمکی ہے۔ کیا سمجھے؟"

وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور گھگیا کر بولا۔ "تھانے دار صاحب! میں جذبات میں آ گیا تھا۔ معاف کردیں۔ میں کسی کو دھمکی دینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ویسے ایک بات میں اچھی طرح جان گیا ہوں، ابھی آپ نے جس شخص کا ذکر کیا ہے وہی میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ آپ میرے اس انجانے دشمن کا نام تو بتائیں!"

میں نے دانستہ بالی کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا اور ماکھا سے کہا۔ "ہم اپنے مخبروں اور قانون سے تعاون کرنے والے افراد کو ظاہر نہیں کرتے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنے جرم کو قبول کرلو ورنہ تمہیں معلوم ہی ہوگا، ہم اقرارِ جرم کے کتنے طریقے جانتے ہیں!"

وہ بڑی شدت سے اپنی گردن کو انکاری جھٹکے دینے لگا۔ ان گردنی جنبشوں کا ایک ہی مطلب تھا کہ سلامو کو اس نے قتل کیا ہے اور نہ ہی وہ اس واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ وہ شرافت سے زبان کھولنے کو تیار نہیں تو اس کی "خاطر تواضع" سے قبل چند دوسرے نفسیاتی حربے آزمانے کی کوشش کی۔

"ماکھا!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "حوالدار قادر بخش نے تمہیں مدینہ کالونی کے ایک گھر سے گرفتار کیا ہے۔ وہاں تم اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تم وہاں کتنے بجے پہنچے تھے لیکن پھر بھی تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دینا!"

اس نے سوچنے میں ایک لمحہ صرف کیا پھر جواباً بولا۔ "آدھی رات کے وقت۔ میرا خیال ہے، اس وقت بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے۔"

اسلم عرف اچھو نے حوالدار کو یہی وقت بتایا تھا۔ اسی حساب سے ماکھا غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورنے کا عمل جاری رکھا اور کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے، تم لوگ مدینہ کالونی میں پیجا کے گھر میں تاش کھیل رہے تھے۔ تمہارے اور پیجا کے علاوہ باقی دو افراد کون تھے؟"

"ان میں ایک تو عارف تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور دوسرا ریاض تھا۔"

"یہ دونوں افراد بھی مدینہ کالونی ہی کے رہنے والے ہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''عارف علی تو مدینہ کالونی کا ہی ہے لیکن ریاض کا تعلق سلطان پورہ سے ہے۔''

''یعنی وہ سلامو کے گاؤں میں رہتا ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''ماکھا! میں تمہارے بیان کی تصدیق کے لئے ان تینوں کو بھی تھانے بلواؤں گا۔ وہ لوگ مجھے بتائیں گے کہ تم مدینہ کالونی کتنے بجے پہنچے تھے۔''

''آپ اپنی تسلی کے لئے جیسی چاہے تصدیق کرلیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

بالی اس واردات کی اطلاع دینے لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے تھانے پہنچی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ سلامو کو بارہ بجے یا اس سے تھوڑا پہلے قتل کیا گیا تھا۔ میں کم و بیش ایک بجے جائے وقوعہ پر پہنچا تھا اور سلامو کے سینے سے خارج ہونے والے خون سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اسی حساب سے سلامو کی موت کا وقت رات گیارہ اور بارہ کے درمیان بنتا تھا۔ یہ میرا ایک رف اندازہ تھا۔ صحیح بات تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی بتا سکتی تھی۔

میں نے ماکھا کو سردست حوالات میں بھیج دیا اور مزید تفتیش کے لئے اس کے ساتھیوں کو تھانے بلوالیا۔ وہ ساتھی جن کے ساتھ وہ گزشتہ رات تاش کی بازی جما رہا تھا۔

میں نے لگ بھگ ایک گھنٹے تک باری باری پیجا، عارف اور ریاض کا ''انٹرویو'' کیا لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہ آسکی جس سے ماکھا کے بیان کی تردید ہوتی۔ ان تینوں میں پیجا قدرے معقول اور سمجھ دار دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ان تینوں کو پابند کر دیا کہ جب تک اس کیس کی تفتیش جاری ہے، وہ اپنے گاؤں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے، چاہے کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو...... اور یہ کہ میں انہیں مزید پوچھ تاچھ کے لئے کسی بھی وقت تھانے بلوا سکتا ہوں۔ میرے بلاوے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہیں۔

انہوں نے باری باری مجھے تعاون کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کریں گے۔ انہیں ماکھا کی گرفتاری کا دکھ تھا۔ انہوں نے کھل کر تو ماکھا کی حمایت نہیں کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ماکھا کو بے گناہ سمجھتے تھے۔

وہ تینوں ماکھا کے دوست تھے۔ انہیں ماکھا سے ہمدردی ہونا بھی چاہئے۔ لیکن میں ان کے ہمدردانہ جذبات کی روشنی میں ماکھا کو آزاد نہیں کر سکتا تھا۔

دو روز بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی۔ اس رپورٹ کے مطابق سلامو کو حالت نیند میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور موت کا وقت میرے اندازے کے عین مطابق تھا یعنی مقتول سلامو کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ آلہ قتل وہی خنجر تھا جو دستے

تک مقتول کے سینے میں پیوست پایا گیا تھا۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اٹھانے کا رواج عام نہیں ہوا تھا اور عدالت اس شعبے کی کارکردگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی لہٰذا فنگر پرنٹس لینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔ اسی روز مقتول سلامو کی تدفین کر دی گئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں موجود ایک نکتے نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ نکتہ یہ تھا کہ سلامو کو نیند کی حالت میں قتل کیا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ رات کو سوتے وقت وہ دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ بصورت دیگر اگر دروازہ بند ہوتا اور قاتل کسی بھی طرح اسے کھولنے کی کوشش کرتا تو عین ممکن تھا، مقتول کی آنکھ دروازہ کھلنے سے پہلے ہی کھل جاتی۔ پھر اس صورت میں بالی کے اٹھنے کے بھی امکانات پیدا ہو جاتے۔ سردست یہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ قاتل کو دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔

آئندہ دو تین روز تک تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے ماکھا کی زبان کھلوانے اور اس سے اقبال جرم کروانے کے لئے ''سختی'' بھی کی لیکن وہ اس سختی کو جھیل گیا۔ اس نے سلامو کے قتل کا اقرار نہیں کیا۔ ماکھا کے رویے اور ردِ عمل کو دیکھتے ہوئے ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔ اس کے دل کا احوال معلوم کرنے کے لئے مجھے روایتی تفتیشی ہتھکنڈوں سے کام لینا ہوگا۔

ماکھا ایک مستند غنڈا تھا۔ ایسے لوگوں سے کچھ اگلوانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بڑی مشکل سے اپنے کالے کرتوت قبولتے ہیں۔ کڑی آزمائش میں ڈالنے سے پہلے میں نے اس پر ایک نفسیاتی حربہ آزمایا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ خاصا مضمحل اور افسردہ ہو رہا تھا۔

میں نے اپنے لہجے میں گہری سنجیدگی بھرتے ہوئے کہا۔ ''ماکھا! تم چاہے لاکھ انکار کرو لیکن میں نے تمہارے جرم کا ایک ٹھوس ثبوت حاصل کر لیا ہے۔ اب تم کسی بھی قیمت پر جان نہیں بچا سکو گے۔''

اس نے الجھے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ ''کون سا ثبوت تھانے دار صاحب؟''

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اسے چکر دیا۔ ''ماکھا! میں نے آلہ قتل کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا ہے جس سے ثابت ہوا ہے، وہ خنجر تمہاری ملکیت ہے۔''

اس نے انتہائی غیر یقینی نظر سے مجھے دیکھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے جناب!'' اس کے سوال میں دنیا جہان کی حیرت پنہاں تھی۔

''یہ ہو چکا ہے ماکھا!'' میں نے کہا۔ ''اب تم شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کرلو۔''

وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔ ''جناب! جس خنجر سے سلامو کو قتل کیا گیا ہے اس سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ میں کسی لیبارٹری ٹیسٹ کو نہیں مانتا۔ پہلے تو میں نے ایسے کسی ٹیسٹ کے بارے

میں نہیں سنا۔ میرے خلاف کوئی گہری سازش کی جا رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ماکھا! یہ ایک جدید ٹیسٹ ہے۔ اس ٹیسٹ کی بدولت آلہ قتل پر قاتل کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "یہ فنگر پرنٹس ٹیسٹ کہلاتا ہے!"

میں یہ باتیں اسے الجھانے اور اس کی زبان سے سچ سننے کی خاطر کر رہا تھا ورنہ حقیقت سے اِن کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ماکھا میری چال میں نہ آیا اور بدستور نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

"تھانے دار صاحب! میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ مجھے اس چکر سے نکالیں۔ میں نے سلامو کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس بارے میں کچھ جانتا ہوں۔"

میں نے اسے دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔

یہ کیس ٹیڑھی کھیر بنتا جا رہا تھا۔ مبینہ قاتل میری تحویل میں تھا۔ تمام حالات و واقعات بھی اسی جانب اشارہ کرتے تھے لیکن وہ اپنے جرم کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کا ایک ہی راستہ باقی بچا تھا اور وہ تھا، پولیس کا روایتی تفتیشی راستہ!

اس سے پہلے کہ میں تشدد کی راہ اپناتا، ایک واقعہ پیش آ گیا جس نے تفتیش کا رخ پھیر دیا۔ ایک روز حوالدار قادر بخش میرے کمرے میں داخل ہوا اور نہایت ہی عاجزی سے بولا۔

"ملک صاحب! مجھ سے ایک کوتاہی ہو گئی ہے۔ میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔"

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات تھے۔ میں نے الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا۔ "قادر بخش! تم کس کوتاہی کی بات کر رہے ہو؟ میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ جلدی بتاؤ، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک زنجیر نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دی۔ میں نے دیکھا وہ ایک طلائی زنجیر تھی جس میں ایک ننھا سا لاکٹ بھی موجود تھا۔ میں نے وہ لاکٹ اٹھا لیا اور سرسری انداز میں اسے دیکھنے کے بعد سوالیہ نظر سے قادر بخش کو دیکھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے شرمندہ لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! اس رات جائے وقوعہ پر میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ کمرے کی تلاشی اور معائنے کے دوران میں یہ لاکٹ مجھے ملا اور میں نے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اس وقت آپ سے اس کا ذکر نہیں کیا اور بعد میں مجھے یاد نہ رہا۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "دراصل اس رات مجھے شدید نیند آ رہی تھی۔ اس لئے بھی مجھ سے یہ بھول ہو گئی۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں اسی وقت یہ لاکٹ آپ کے حوالے کر دیتا۔"

"تو اتنے دن بعد تمہیں اس لاکٹ کی یاد آئی؟" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ اور

لاکٹ کو گھورنے لگا۔

طلائی زنجیر کے ساتھ وہ لاکٹ ایک ننھے سے گول جسم کی مانند تھا جس پر انگریزی کا حرف "M" کندہ تھا۔ میں اس لاکٹ کا جائزہ لے رہا تھا کہ قادر بخش کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ملک صاحب! ہو سکتا ہے، میں اب بھی اس لاکٹ کو بھولا ہی رہتا۔ وہ تو بھلا ہو میری بیوی کا۔ وہ جب میرے کپڑے دھونے لگی تو اسے ایک جیب سے یہ لاکٹ مل گیا۔ اس نے رات ہی مجھے دیا ہے اور میں پہلی فرصت میں اسے آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ میں مانتا ہوں، میری غفلت نما کوتاہی کے باعث یہ لاکٹ کئی روز کے بعد آپ تک پہنچ رہا ہے۔ مجھے امید ہے، آپ میری اس غلطی کو درگزر کر دیں گے۔"

میں نے فروعی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے قادر بخش سے سوال کیا۔ "تمہیں یہ لاکٹ جائے وقوعہ پر کس مقام سے ملا تھا؟"

"یہ مقتول کی چارپائی کے نزدیک ہی پڑا ہوا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے لاکٹ پر نظر جما کر بہت دور تک سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم نے اس لاکٹ کو دھیان سے دیکھا تھا؟"

"نہیں جی، میں نے توجہ دیئے بغیر اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا پھر میرے انہماک نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ "کیوں، کوئی خاص بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے بدستور لاکٹ کے "M" کو گھورتے ہوئے کہا۔ "قادر بخش! اگر اس وقت تم نے لاکٹ کو غور سے دیکھا ہوتا تو خاموشی سے جیب میں نہ ڈال لیتے۔ یہ لاکٹ تمہیں خاموش رہنے ہی نہ دیتا۔ بہرحال۔" میں نے لاکٹ سے نگاہ ہٹا کر حوالدار کو دیکھا اور کہا۔ "میں تمہاری اس کوتاہی کو معاف کرتا ہوں۔ دیر آید، درست آید۔ اس کارنامے پر تمہاری بیوی کو کوئی انعام شنام ضرور ملنا چاہئے۔"

حوالدار قادر بخش نے کہا۔ "میری گھر والی بڑی تیز اور شکی مزاج عورت ہے۔ وہ کسی انعام کے بجائے اس بات میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے کہ یہ لاکٹ میرے پاس آیا کہاں سے؟ پوچھ رہی تھی، یہ ایم "M" کون ہے؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ناک پر انگلی رکھ کر معنی خیز اشارہ بھی کیا تھا۔

"بھئی، تمہاری بیوی تو پکی حوالدارن لگتی ہے۔" میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ "اس طرح تو پولیس والے ہی تفتیش کرتے ہیں۔ وہ ایک پولیس والے کی بیوی ہے تو پولیس والی ہی ہوئی۔"

حوالدار قادر بخش بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب! میں تھانے میں بڑے سکون سے رہتا ہوں، لیکن جیسے ہی گھر میں داخل ہوتا ہوں، لگتا ہے تھانے میں آ گیا

ہوں۔'' اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ملک صاحب! آپ نے میری بیوی کو حوالدارن کہا ہے لیکن وہ مجھے کسی ظالم جیلر سے کم نہیں لگتی۔''

میں نے اس کی کیفیت پر ایک نپا تلا قہقہہ لگایا اور کہا۔ ''قادر بخش! کچھ بھی ہے لیکن تمہیں یہ بات ماننا پڑے گی کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ ذہین ہے۔ اس نے فوراً لاکٹ پر کندہ ''M'' کے بارے میں تم سے پوچھ لیا......اور تم ابھی تک اسے فراموش کئے بیٹھے ہو!''

وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کس کے نام کا لاکٹ ہو سکتا ہے؟''

''مشتاق عرف ماکھا کے بارے میں کیا خیال ہے!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ملک صاحب! ماکھا کا اصلی اور عرفی نام ''M'' سے شروع ہے۔ یہ لاکٹ ماکھا کا ہو سکتا ہے۔''

''تو پھر تم ماکھا کو فوراً میرے پاس لے آؤ۔'' میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

حوالدار قادر بخش میرے کمرے سے نکل گیا تو میں لاکٹ اور ماکھا کے بارے میں سوچنے لگا۔ قادر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لاکٹ اسے مقتول کی چارپائی کے پاس پڑا ہوا ملا تھا۔ اگر لاکٹ ماکھا کا تھا تو پھر قتل کی واردات کے درمیان ہی وہ وہاں گرا ہوگا۔ ماکھا اس لاکٹ کے طفیل بری طرح میرے شکنجے میں آنے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حوالدار ماکھا کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اتنے دن حوالات کی ہوا کھا اور ہر آتے جاتے پولیس اہلکار سے لات جوتا کھانے کے بعد اچھے اچھوں کے مزاج ٹھکانے آ جاتے ہیں لیکن ماکھا اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی۔ تاہم سلامو کے قتل کے سلسلے میں حسب توقع تعاون پر آمادہ نہیں ہوا تھا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! مجھے اور رگڑیں گے۔ بہت دیر ہو گئی اب مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں تو آپ کی مہربانی ہو گی۔''

''ماکھا!'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے لئے ایک جادو کا چراغ ہو۔ میں تمہیں اس وقت تک رگڑتا رہوں گا جب تک تمہارے اندر سے چراغی جن نمودار نہیں ہو جاتا!''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''یہ تو سراسر زیادتی والی بات ہوئی نا۔''

''زیادتی کے بچے!'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''تم مجھے میرا کام سکھانے کی کوشش نہ کرو۔'' پھر ذرا رک کر میں نے گمبھیر آواز میں اضافہ کیا۔ ''لیکن اب اتفاق سے مجھے ایک ایسی چابی مل گئی ہے جس سے تمہاری زبان کا قفل کھٹک سے کھل جائے گا۔ مجھے امید ہے تمہاری مزید

رگڑائی اور منجھائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''آپ کس چابی کی بات کر رہے ہیں جناب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی مٹھی میں بند ''M'' والے طلائی لاکٹ کو نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تم اس ''چابی'' کو پہچانتے ہو؟''

وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے لاکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے اپنے ہاتھ میں لے کر اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھو۔ ممکن ہے، تم اسے شناخت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ یہ لاکٹ ہمیں مقتول سلامو کی لاش کے قریب کمرے کے فرش پر پڑا ملا ہے۔''

اس نے لاکٹ کو ہاتھ میں لے کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس دوران میں، میں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو نوٹ کرنے لگا۔ وہاں مجھے شناسائی کی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی۔ جب سے اس نے لاکٹ دیکھا تھا، میں نے شناخت یا شناسائی کا کوئی تاثر اس کی آنکھوں یا چہرے پر نمودار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ لاکٹ واقعی اسی کا تھا تو پھر کہنا پڑے گا، وہ ایک اچھا اداکار بھی تھا۔

آئندہ دس منٹ تک بھی جب ماکھا نے اس لاکٹ کو پہچاننے کا اعتراف نہ کیا تو میں نے اسے دوبارہ حوالات میں بھیج دیا۔ حوالدار اسے چھوڑنے کے بعد دوبارہ میرے پاس آ گیا۔

''ملک صاحب! یہ بندہ تو بہت پکا ہے۔'' اس نے خیال آرائی کے انداز میں کہا۔ ''اس کی زبان کھلوانے کے لئے خاص فارمولاز استعمال کرنا ہوں گے۔''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی ان فارمولاز کو آزمانے کا وقت نہیں آیا قادر بخش۔''

''پھر آپ کیا کریں گے؟'' اس کا انداز ٹٹولنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ''قادر بخش! ہم نے ماکھا کو مدینہ کالونی میں پیجا کے گھر سے گرفتار کیا ہے جہاں وہ پیجا، عارف علی اور ریاض کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا اور اس کے اس ٹھکانے کی نشان دہی اسلم عرف اچھو نے کی تھی۔'' میں خاموش ہوا تو قادر بخش کو پوری طرح اپنی جانب متوجہ پایا۔ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تمام وہ افراد ہیں جو ماکھا کے بہت قریب رہے ہیں۔ ہم انہیں تھانے بلا کر یہ لاکٹ دکھائیں گے۔ کوئی تو اس بات کی تصدیق کرے گا کہ اس نے مذکورہ لاکٹ ماکھا کے گلے میں یا اس کے پاس دیکھا ہے۔ اس تجربے سے معاملہ بالکل صاف ہو جائے گا۔ یعنی اس لاکٹ کا معما حل ہو جائے گا۔''

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی تجویز بہت زبردست ہے۔''

میں نے قادر بخش کی ڈیوٹی لگادی کہ وہ مطلوبہ افراد کو تھانے بلوالے۔ اس روز سورج غروب ہونے سے پہلے ہم اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ اچھو، ریاض اور عارف نے تو لاکٹ کو دیکھ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ البتہ پرویز عرف پیجا نے ایک عجیب انکشاف کیا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ لاکٹ...... یا بالکل ایسا ہی لاکٹ میں نے شہری بابو کے پاس دیکھا تھا۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''شہری بابو...... یہ کون ہے بھئی؟''

''اس لڑکے کا نام تو ماجد ہے جناب۔'' پیجا نے بتایا۔ ''لیکن کالونی میں سب اسے ''شہری بابو'' کہتے ہیں۔ یہ لاکٹ میں نے اس کے گلے میں پڑا دیکھا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''ماجد کو شہری بابو کیوں کہا جاتا ہے؟''

''M'' کی مناسبت سے وہ لاکٹ ماجد پر فٹ بیٹھتا تھا۔ پیجا نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''وہ ادھر لاہور میں پڑھتا ہے۔ ادھر مدینہ کالونی میں سب شلوار قمیص یا عام دیہاتی لباس پہنتے ہیں۔ ماجد واحد آدمی ہے جو پینٹ شرٹ میں یہاں آتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ اسے شہری بابو کہتے ہیں۔''

ماجد میں میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس کا لاکٹ جائے واردات پر پایا گیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا، اس واردات میں ماجد کا ہاتھ رہا ہوگا۔ اس حوالے سے وہ لڑکا اچانک بہت زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتا تھا۔ میں نے پیجا سے پوچھا۔

''تمہارا وہ شہری بابو اگر لاہور میں تعلیم حاصل کر رہا ہے تو پھر مدینہ کالونی میں وہ کیا لینے آتا ہے...... کیا یہاں پر کسی سے اس کی رشتے داری ہے؟''

پیجا نے بتایا۔ ''جناب! آپ رشتے داری کی بات کر رہے ہیں۔ ماجد کے تو ماں باپ مدینہ کالونی میں رہتے ہیں۔ لاہور میں تو وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس رہتا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کیا آج کل وہ شہری بابو مدینہ کالونی آیا ہوا ہے؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے دنوں وہ کالونی ہی میں تھا لیکن اب واپس جا چکا ہے۔''

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس سے پچھلے دنوں کا حساب طلب کیا تو یہ وہی عرصہ نکلا جب سلامو کو سینے میں خنجر گھونپ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یعنی وقوعہ کی شام ماجد مدینہ کالونی میں موجود تھا اور اس سے اگلے روز وہ لاہور روانہ ہو گیا تھا۔ اس صورتِ حال نے ماجد عرف شہری بابو کو میری نظر میں شک آلود کر دیا۔

میں نے پیجا سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں معلوم ہے، ماجد کا بڑا بھائی لاہور میں کس جگہ رہتا ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے معذوری ظاہر کی پھر بولا۔ ''یہ بات اس کے باپ ساجد علی سے

پوچھی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ تو ادھر ہی مدینہ کالونی میں موجود ہیں۔''

پیجا کی تجویز میں وزن تھا۔ میں نے اس سے شہری بابو کے دیہاتی باپ ساجد علی کے گھر کا پتا دریافت کیا پھر اسے تاکید کی کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔ اس کے بعد میں نے پیجا کو رخصت کر دیا۔

اگلے روز صبح ہی صبح میں مدینہ کالونی پہنچ گیا۔ میرے ساتھ اے ایس آئی فضل الٰہی بھی تھا۔ فضل الٰہی ان دنوں شبینہ ڈیوٹی انجام دے رہا تھا اس لئے وہ آسانی سے میرے ہتھے چڑھ گیا۔ جب ہم نے ساجد علی کے دروازے پر دستک دی تو وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔ ساجد علی اسکول ماسٹر تھا۔

وہ بڑے تپاک سے ملا اور ہمیں اپنے گھر کے اندر لے گیا۔ جب ہم اس کی بیٹھک میں بیٹھ چکے تو اس نے چائے پانی کے لئے بہت زور لگایا لیکن میں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ ہم بھرپور ناشتا کر کے آئے ہیں اور یہ بات رسمی نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی۔

ماسٹر ساجد علی نے جب ہماری آمد کی غرض و غایت پوچھی تو میں نے ''M'' کی شناخت والا وہ طلائی لاکٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔

''ماسٹر صاحب! یہ لاکٹ مجھے ایک سنگین مقام سے ملا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے، یہ آپ کے بیٹے ماجد کا ہے۔ آپ تصدیق یا تردید کریں تو بات آگے بڑھے؟''

ماسٹر ساجد علی اس لاکٹ پر نگاہ پڑتے ہی پہچان گیا تھا۔ تاہم جواب دینے میں اس نے چند لمحے صرف کئے۔ اس دوران میں وہ لاکٹ کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کچھ سوچ بھی رہا تھا۔

''تھانے دار صاحب! یہ لاکٹ میرے بیٹے کا ہی ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آپ کو یہ کہاں سے ملا ہے؟''

اس کے لہجے میں گہری تشویش چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اس لاکٹ کے حوالے سے کسی سنگین مقام کا ذکر کیا تھا۔ وہ ایک جوان بیٹے کا باپ تھا۔ اس کا پریشان ہو جانا قدرتی امر تھا۔ اس کے سوال کے جواب میں، میں نے ماسٹر ساجد علی سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور مختصراً اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ ایک معقول اور شریف آدمی تھا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! میں آپ کی تحقیق اور تفتیش کو جھٹلا نہیں رہا لیکن ایک بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ماجد قتل جیسی کسی سنگین واردات میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ میرے اس اعتماد کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے خون پر پورا بھروسا ہے۔ میں آج تک رزق حرام کا ایک دانہ گھر میں نہیں لایا۔''

میں نے کہا۔ ''یقیناً آپ بجا فرما رہے ہوں گے۔ لیکن میں بھی تو قانونی تقاضے پورے

کرنے کے لئے مجبور ہوں۔" پھر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے، آپ مجھ سے بھرپور تعاون کریں گے!"

"ہوں!" وہ پُرسوچ انداز میں پوچھنے لگا۔ "آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں یہ بات تو معلوم کر چکا ہوں کہ ماجد چند دن یہاں گزارنے کے بعد واپس لاہور جا چکا ہے۔ اتفاق سے وہ جس صبح یہاں سے روانہ ہوا ہے اس سے پچھلی رات سلامو کا قتل ہوا ہے۔ اس تناظر میں آپ کے بیٹے کی ذات اور زیادہ سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔" میں نے چند لمحات کا توقف کر کے نہایت ہی معتدل انداز میں کہا۔ "میں فوری طور پر آپ کے بیٹے ماجد المعروف شہری بابو سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ یا تو اسے آج ہی یہاں بلوالیں یا پھر اس کا لاہور کا ایڈریس مجھے بتائیں تاکہ میں وہیں جا کر اس سے بات کر لوں۔ اس معاملے کو لٹکایا تو نہیں جا سکتا۔"

وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ "ماجد کو فوری طور پر یہاں بلانا تو ممکن نہیں۔"

"پھر مجھے ہی لاہور جانا ہوگا!" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

صورت حالات کی نزاکت کا اندازہ لگانے کے بعد ماسٹر ساجد علی نے اپنے بڑے بیٹے واجد علی کے لاہور والے گھر کا پتہ مجھے نوٹ کروا دیا۔ واجد، ماجد کے پاس ہی رہتا تھا۔ میں ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔ اس کے گھر میری آمد کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

بوقت رخصت اس نے کہا تھا۔ "تھانے دار صاحب! میں ایک امن پسند اور قانون کی مدد کرنے والا شہری ہوں۔ میں قانون کی بالادستی کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے، ماجد کسی بھی نوعیت کے جرم میں ملوث نہیں۔ آپ اگر تفتیش کے نام پر اس سے پوچھ گچھ کریں تو اس بات کا خیال رہے کہ ایک بے گناہ کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہو جائے۔"

میں نے ماسٹر کا کندھا تھپکتے ہوئے پوری سچائی کے ساتھ کہا تھا۔ "آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں ذرا دوسری قسم کا تھانے دار ہوں۔ مجھے بے گناہ اور گنہگار کی اچھی طرح پہچان ہے اور جرائم پیشہ افراد کو میں دور ہی سے تاڑ لیتا ہوں۔ آپ کے بیٹے کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔"

میں اسی روز لاہور جانا چاہتا تھا۔ اس غرض سے پہلے ہیڈ کوارٹر جا کر اپنے سینئر آفیسر سے ملا اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر وہاں سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں لاہور روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ حوالدار قادر بخش بھی تھا۔

ماجد کا بڑا بھائی واجد لاہور کے ایک معروف علاقے اچھرہ میں رہتا تھا۔ وہاں ذیلدار روڈ پر اس کا ایک بڑا سا جنرل سٹور تھا۔ ماجد ایم اے او کالج میں پڑھتا تھا۔

لاہور پہنچنے کے بعد میں نے متعلقہ تھانے میں اپنی آمد کی اطلاع دی اور اس دورے کی

غرض و غایت بھی بتا دی۔ پھر ہم واجد کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ ماجد کالج سے واپس آ چکا تھا اور گھر ہی میں تھا۔ اس لئے اس سے ملاقات ہو گئی۔

میں نے ایک احتیاط یہ برتی کہ پہلے ہم واجد کے جنرل سٹور پر گئے۔ واجد کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم اس کے بھائی سے کسی سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے سٹور ایک بااعتماد ملازم کے حوالے کیا اور ہمارے ساتھ گھر چلا آیا۔

میں اور حوالدار اس وقت سادہ لباس میں تھے۔ لیکن جب ماجد کو پتا چلا کہ پولیس اس کی تلاش میں یہاں پہنچی ہے تو پریشان ہو گیا۔ واجد نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد ماجد کو وہیں بلا لیا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اپنی جیب سے "M" والا طلائی لاکٹ نکالا اور اصل موضوع پر آ گیا۔ مذکورہ لاکٹ پر نگاہ پڑتے ہی ماجد ایسے چونکا جیسے کسی خطرناک شے پر اس کی نظر پڑ گئی ہو۔ میں ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں سمجھ گیا، وہ اپنے لاکٹ کو پہچان گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ماجد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "برخوردار! تمہارا یہ لاکٹ ہمیں ایک لاش کے پاس پڑا ملا ہے۔ اب تم بتاؤ گے کہ تم نے اس بے گناہ بے چارے شخص کو کیوں قتل کیا؟"

قتل اور لاش کے الفاظ نے اس کے چہرے پر ہراسانی پھیلا دی۔ وہ نکنت زدہ انداز میں بولا۔ "کک...... کس کی...... لاش...... کون...... قت...... قتل ہوا ہے؟"

اس کی کیفیت نے مجھے بتا دیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "سلطان پورہ کا ایک رہائشی سلام دین عرف سلامو چند روز پہلے اپنے گھر میں قتل کیا گیا ہے۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے جس کی اگلی صبح تم مدینہ کالونی سے لاہور آ گئے تھے۔" پھر میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "کچھ یاد آیا تمہیں؟"

میں بدستور اس کی آنکھوں میں گھورنے لگا تاکہ وہ اپنے چور تاثرات کو چھپا نہ سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "وہ...... وہ تو ٹھیک ہے...... آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہوا ہوگا۔ لیکن میرا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔ یقین کریں، مجھے ابھی آپ کی زبانی پتا چلا ہے کہ سلامو کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر تمہارا سلامو کے قتل سے کوئی تعلق نہیں تو پھر تمہارا یہ لاکٹ اس کی لاش کے پاس کیسے پہنچ گیا؟" میں نے وہ لاکٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"پپ...... پتا نہیں جناب!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"اس سلسلے میں تو جو کچھ کہنا ہے وہ تمہیں ہی کہنا ہے شہری بابو!" میں نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ یہ لاکٹ تمہارا ہے!"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "جناب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا کہوں۔"

اس کے لہجے سے جھلکتی بے بسی کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "تمہاری سمجھ میں سب کچھ آ جائے گا برخوردار! میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤں گا۔ میرے تھانے میں بڑی پراسرار مشینیں نصب ہیں۔ وہ پتھروں اور مُردوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ تم تو گوشت پوست کے جیتے جاگتے انسان ہو۔"

میری دھمکی آمیز گفتگو نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس نے جان چھڑانے کے لئے ایک بہانہ گھڑا۔ "وہ...... وہ بات دراصل...... یہ ہے کہ یہ لاکٹ کچھ عرصہ پہلے کھو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا، یہ کس کے ہتھے لگا ہوگا اور......"

وہ خود ہی اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "یہ لاکٹ کتنا عرصہ پہلے کھویا تھا؟"

"دو ماہ پہلے...... نہیں، ایک ماہ یا شاید......" وہ بے ترتیب انداز میں بولا۔ "میرا خیال ہے، پندرہ دن پہلے مجھے پتہ چلا کہ لاکٹ میرے پاس نہیں۔"

اس کا لہجہ اور طرزِ بیان اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ کامل دروغ گوئی سے کام لے کر حقائق کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا یہ لاکٹ ہمیشہ تمہارے گلے میں لٹکا رہتا تھا؟"

"جج...... جی......" وہ ہکلایا۔

"پھر تو یہ جیسے ہی گم ہوا، تمہیں خبر ہو جانا چاہئے تھی۔" میں نے اسے ٹٹولا۔ "لیکن تم تو بتا رہے ہو...... دو ماہ، ایک ماہ اور پندرہ دن۔ یہ کیا حساب ہوا، یہ کیا بات ہوئی۔ کیا تم مجھے بچہ سمجھتے ہو کہ میں تمہاری ان بدمعاشیوں سے مطمئن ہو جاؤں گا۔ ہرگز نہیں!" میں نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "مجھے یاد آ گیا، یہ لاکٹ ایک ماہ پہلے کھویا تھا۔"

وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے بھی اسے چکر دینے کا فیصلہ کیا اور غصیلے لہجے میں کہا۔

"جھوٹ بولتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟" وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔ "میں نے سخت انداز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی چند روز پہلے جب تم مدینہ کالونی میں اپنے والدین سے ملنے گئے تھے تو یہ لاکٹ تمہارے گلے میں موجود تھا۔ اس بات کو ابھی ایک ماہ تو نہیں ہوا۔ بمشکل دس دن ہوئے ہوں گے۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا جو نشانے پر جا کر لگا۔ وہ یک دم بے حد ہراساں نظر آنے لگا۔ اس کی حالت ایسی متغیر ہوئی جیسے اچانک اس پر کوئی بہت بڑی افتاد ٹوٹ پڑی ہو۔ وہ مصیبت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

"آپ کو یہ بات کس نے بتائی کہ آٹھ دس دن پہلے یہ لاکٹ میرے گلے میں تھا؟"

میں نے حقیقت حال تک پہنچنے کے لئے ایک اور جھوٹ بولا۔ "تمہارے گاؤں میں یعنی مدینہ کالونی میں پرویز عرف پیجا رہتا ہے۔ تم اسے تو اچھی طرح جانتے ہو نا؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "اسی پیجا نے تمہاری گردن میں اس لاکٹ کو حمائل دیکھا تھا۔ اب تم کیا کہتے ہو؟"

"وہ...... وہ...... بدمعاش جھوٹ بولتا ہے!" وہ اچانک پھٹ پڑا۔

"میں یہ کیوں نہ سمجھوں کہ تم دروغ گوئی سے کام لے رہے ہو؟" میں نے اسے لتاڑا۔ "تمہارے کئی جھوٹ میرے سامنے کھل چکے ہیں۔"

وہ اپنے بڑے بھائی کی طرف امداد طلب نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پپ...... پانی......!"

ماجد کے ردِعمل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ اس لاکٹ کے حوالے سے، مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ انسان جب کچھ چھپاتا ہے تو اسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ جب اس سے متعلقہ شے کے بارے میں استفسار کیا جائے تو وہ کوئی اور ہی کہانی سنا دے۔ ماجد بھی اسی قسم کی تگ و دو میں مصروف تھا۔

میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔ "تمہیں جو پینا ہے، پی لو...... اور جو کھانا ہے، کھا لو۔ میں ٹھیک پندرہ منٹ بعد یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا...... اور تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ میرے تھانے، جہاں نصب زندہ مشینیں تمہاری زبان کو متحرک کر دیں گی۔"

میرے لہجے میں پوشیدہ سنگینی اور سفاکی کو محسوس کر کے وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ زبان پر صرف ایک ہی جملے کی تکرار تھی۔ "میں نے سلامو کو قتل نہیں کیا...... میں نے سلامو کو قتل نہیں کیا......"

المختصر، میں اسی روز ماجد علی عرف شہری بابو کو شہر سے گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے آیا۔ وہ تھانہ جو چند گاؤں دیہاتوں کی شناخت تھا جہاں پر خالصتاً دیہاتی فضا تھی جو اس شہری بابو کی صحت کے لئے بہت "مفید" ثابت ہونے والی تھی۔

ماجد کا زندگی میں پہلی مرتبہ پولیس سے واسطہ پڑا تھا۔ دو چار لاتیں مکے کھانے کے بعد وہ راہِ راست پر آ گیا اور اس نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا۔ "M" والا مذکورہ لاکٹ اس نے گاؤں سے روانہ ہونے سے قبل اپنی محبوبہ کو نشانی دیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "مدینہ کالونی میں کون ہے تمہاری محبوبہ؟"

"وہ مدینہ کالونی میں نہیں رہتی۔" وہ قدرے بہادری سے بولا۔

یہ ایک نفسیاتی امر ہے کہ سچ بولنے کے بعد انسان میں ایک انجانا سا اعتماد، ایک جرأت سی آ جاتی ہے جبکہ دروغ گو ہر وقت تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ اسے ہر لمحے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کا جھوٹ کھل نہ جائے۔ جھوٹے شخص کی مثال کسی چور کی سی ہوتی ہے جس کے پاؤں نہیں ہوتے۔

میں نے ماجد سے استفسار کیا۔ ”پھر وہ کہاں رہتی ہے اور اس کا نام کیا ہے؟“

”جناب! وہ سلطان پورہ میں رہتی ہے۔“ اس نے ایک اور انکشاف کیا۔ ”اور اس کا نام اقبال بی بی عرف بالی ہے۔“

میں اچھل پڑا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو ماجد...... بالی تو شادی شدہ عورت ہے اور وہ خاصی شوہر پرست بھی تھی۔ تم مجھے کسی اور چکر میں تو نہیں ڈالنا چاہتے؟“

”نہیں جناب!“ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ”اب تو میں سارے چکروں سے نکل آیا ہوں، آپ کو کیا کسی چکر میں الجھاؤں گا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس کا ایک ایک لفظ مبنی بر سچ ہے۔“

میں نے اچانک پوچھا۔ ”تم نے بالی کے شوہر کو کیوں قتل کیا؟“

”میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا جناب، سلامو کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔“

”دیکھو ماجد!“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”اگر میں تمہاری اس بات پر یقین کر لوں کہ تم بالی کو اپنی محبوبہ سمجھتے ہو تو پھر اس کے شوہر کے قتل کے بعد تمہاری ذات سب سے زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔ اب بھی وقت ہے، حقیقت حال پر سے پردہ اٹھا دو۔ ورنہ تم بہت بڑی آفت میں گھرنے والے ہو۔“

وہ پُرعزم لہجے میں گویا ہوا۔ ”تھانے دار صاحب! میں نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے وہ ایک روشن سچ ہے۔ آپ اس پر یقین کریں یا نہ کریں۔“

”کیا تمہاری یہ محبت یک طرفہ تھی؟“ میں نے یک لخت پوچھا۔

وہ پُرسکون انداز میں بولا۔ ”نہیں، ہماری محبت دوطرفہ تھی بلکہ ہے۔ بالی بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا کہ میں اسے چاہتا ہوں۔“

”تم یہ نہ سمجھنا کہ میں آنکھ بند کر کے تمہاری بات پر یقین کر لوں گا۔“ میں نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ”میں بالی کو تھانے بلا کر تمہارے بیان کی تصدیق کروں گا۔“

”آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر لیں۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔

میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ تاہم اسے ماکھا سے علیحدہ دوسرے کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ماجد کے انکشافات کی روشنی میں پہلی فرصت میں بالی سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں نے رات و دن کی پروا کئے بغیر اسے اسی وقت تھانے بلا لیا۔

بالی کو جب پتا چلا کہ میں نے ماجد کو سلامو کے قتل کے الزام میں تھانے میں بند کر رکھا ہے تو اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

”تھانے دار جی! ماجد بے قصور ہے۔ اس نے سلامو کو قتل نہیں کیا۔“

”پھر کس نے قتل کیا ہے تمہارے گھر والے کو؟“ میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

وہ نظر چرانے لگی۔ میں نے کڑک کر کہا۔ ”بالی! اگر تم نے مجھ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کروں گا۔“

اس کی گردن جھک گئی۔ میں نے کہا۔ ”ماجد کے مطابق، لاہور جانے سے پہلے اس نے ایک لاکٹ تمہیں محبت کی نشانی کے طور پر دیا تھا۔ وہ کہاں ہے؟“

اس نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھائی اور ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگی۔ میں نے مذکورہ لاکٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور کہا۔ ”یہ لاکٹ ہمیں سلامو کی لاش کے قریب پڑا ملا تھا۔ یہ وہاں کیسے پہنچ گیا؟“

وہ یک ٹک لاکٹ کو گھورتے ہوئے بولی...... پپ...... پہلے تو آپ نے اس لاکٹ...... کا ذکر نہیں کیا تھا......“ اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

”تم پہلے اور بعد کے حساب کو چھوڑو۔“ میں نے اسے گھورا۔ ”میرے سوال کا جواب دو؟“

وہ آئیں، بائیں، شائیں کرنے لگی۔ میں نے ذرا سختی کی تو اس نے سچ اگل دیا۔

یہ سچ گویا اس کے جرم کا اقرار تھا۔ سلامو کو بالی ہی نے قتل کیا تھا۔ سلامو کے سینے میں خنجر اتارتے وقت اس کا لاکٹ کمرے میں کہیں گر گیا تھا جو بعد میں باوجود کوشش کے بھی اسے مل نہ سکا۔

اقبالِ جرم کے بعد اس نے ایک طویل جذباتی بیان دیا جس میں اس نے خود کو مظلوم اور سلامو کو ظالم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے ماجد سے اپنی محبت کا اعتراف بھی کر لیا۔ اس جذباتی بیان کے آخر میں اس نے کہا۔

”تھانے دار جی! میں کیا کرتی؟ آپ ہی بتائیں، میں کیا کرتی؟“ اس کے لہجے میں ایک کرب پنہاں تھا۔ ”میرے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں بچا تھا۔ سلامو کو مر جانا چاہئے تھا۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔“

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کی خاطر رکی پھر دوبارہ آگ اگلنے لگی۔ ”میں نے سلامو کا ہر ظلم برداشت کیا۔ اس کی بے دریغ مار کھائی، اس کی خاطر اپنے آرام و آسائش کو تیاگ دیا۔ میں کیا تھی، کیا ہو گئی۔ کبھی اپنے حالات پر اُف نہ کی۔ میں نے اس کی فرمائشیں اور فضول شوق پورے کرنے کے لئے اپنا زیور بیچ ڈالا۔ گھر کا سامان بھی فروخت ہو گیا۔ میرے پاس بچا ہی کیا تھا۔ ایک جھمکوں کی جوڑی۔ میں تو اسے بھی فروخت کرنے کو تیار تھی لیکن اس نامراد نے بات ہی ایسی کر دی کہ اس کا قتل واجب ہو گیا۔ پتا ہے تھانے دار جی! سلامو نے اس رات مجھ سے کیا کہا تھا؟“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا اس لئے خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ”میں

بتاتی ہوں۔ وہ باغ پورہ نذر محمد سے مل کر آیا تھا جس نے اپنے شیطان مرغے کالو کی قیمت ایک سو روپے لگائی تھی۔ میں جھمکے بیچ کر یہ رقم سلامو کو دینے کو تیار تھی لیکن وہ بے حیائی سے بولا۔ ''بالی! نذر محمد نے میرے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔ وہ کہتا ہے، سلامو! تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے اگر تُو ایک رات کے لئے بالی کو مجھے سونپ دے تو میں اس کے بدلے کالو تمہیں مفت دینے کو تیار ہوں۔ سنا آپ نے؟''

وہ رکی اور سوالیہ انداز میں بولی۔ ''کیا اب میں سلامو کی خواہش پوری کرنے کے لئے خود کو بھی بیچ دوں؟ اس رات سلامو نے مجھ سے یہی مطالبہ کیا تھا۔''

میں حیرت اور استعجاب کے سمندر میں غوطہ زن وفا کی اس پتلی بالی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت غضب ناک ہو رہی تھی۔ شعلہ بار لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار جی! بے غیرتی کی یہ بات ایک ایسا شخص مجھ سے کہہ رہا تھا جو نکما ہی نہیں، بالکل ناکارہ ہے۔ اسے نالائق نہیں بلکہ نااہل کہنا چاہئے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں، سلامو کے ساتھ آٹھ سالہ ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد بھی میری گود ہری کیوں نہ ہوئی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا کہ میں نے جس پیڑ کے نیچے پناہ لی تھی، وہ خزاں رسیدہ تھا۔ جس ٹنڈ منڈ درخت پر ایک ہرا پتا موجود نہ ہو، وہ کسی کی گود کیا ہری کرے گا۔ میں نے تھانے دار صاحب!'' اس نے سینہ ٹھونکا اور ہیجانی انداز میں بولی۔ ''میں نے اس شخص کی ہر کمزوری، ہر کمی پر پردہ ڈال کر خود پر الزامات لئے۔ بعض لوگوں نے مجھے بانجھ بھی کہا اور یہ شخص مجھ سے ایک ایسی فرمائش کر رہا تھا جو بے غیرتی اور بے حیائی کی فہرست میں سب سے اوپر رقم نظر آتی ہے۔ میں نے تو اس کی زندگی کو لاحق چھوٹے سے چھوٹے خطرے کے لئے بھی خود کو ہلکان کیا۔ آپ تو اس بات کے گواہ ہیں تھانے دار جی...... بس!'' وہ دوٹوک انداز میں رکی اور بپھری ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے اس بے غیرت سلامو کو قتل کر دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ میری نظر میں اتنا گر گیا تھا کہ اسے ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہنا چاہئے تھا۔''

وہ خاموش ہو کر ویران نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی زبان تھم گئی مگر آنکھوں سے بدستور شعلے لپک رہے تھے۔ میں ان آتش بار آنکھوں کی تپش کو بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بوجھل آواز میں بولی۔

''میں تسلیم کرتی ہوں، ماجد مجھے اچھا لگتا ہے۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور یہ راہ بھی مجھے سلامو کے ناروا سلوک نے ہی دکھائی ہے۔ محبت کی حقیقت کو زمانہ جانتا ہے۔ یہ ہر زندہ شے کی ضرورت ہے...... اشد ضرورت۔ محبت کی بوند بوند کو ترسا ہوا شخص اگر کہیں نقب لگا بیٹھے تو اسے قصوروار نہیں سمجھنا چاہئے۔ میں نے بھی ماجد کی محبت سے اپنے لئے سکون کے چند لمحے کشید کئے ہیں۔ اس جرم میں آپ مجھے جو بھی سزا دینا چاہیں، میں تیار ہوں۔ محبت کرنا اگر جرم ہے تو میں اس جرم میں پھانسی لگنے کو تیار ہوں۔''

''محبت کرنا جرم نہیں۔'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''اور نہ ہی میں اس سلسلے میں تمہیں کوئی سزا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تمہارا اصل جرم ہے قتل! تم نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا اقرار کرلیا ہے۔''

وہ خاموش نظر سے خلا میں گھورنے لگی۔

بعد میں جب ماجد کو پتا چلا کہ بالی نے سلامو کا قتل قبول کرلیا ہے تو اس نے یہ الزام اپنے سر لینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں دم نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے ایک دبکا مار کر چپ کرا دیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ماکھا کو میں نے اگلے روز چھوڑ دیا تھا۔ یہ بدمعاش اس کیس میں خاصا خوش قسمت واقع ہوا تھا جبکہ بالی جیسی غیرت مند عورت جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلی گئی۔

غیرت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی خاطر جانی یا مالی نقصان اٹھانے والوں کو کسی قسم کا پچھتاوا نہیں ہوتا۔ غیرت مند انسان جیتا ہے تو سر اٹھا کر اور جان دیتا ہے تو بھی فخر سے۔ اس کا سینہ پھولا ہوا اور سر اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

❁❁❁

قبل از مرگ

ایک روز میں تھانے پہنچا تو پتہ چلا، ساتھ والے گاؤں میں کسی نے خودکشی کر لی ہے۔ میں نے اطلاع لانے والے کانسٹیبل کو اپنے کمرے میں بلایا اور اس سے استفسار کیا۔

''ہاں، بھئی اسلم! کس نے خودکشی کی ہے؟''

''ہمارے گاؤں کے چوہدری صاحب نے۔'' اس نے بتایا۔

میں چونکا۔ ''تمہارا مطلب ہے، چوہدری فرمان علی نے؟''

کانسٹیبل اسلم کا تعلق احمد نگر نامی گاؤں سے تھا جہاں فرمان علی کی چوہدراہٹ تھی۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''جی ملک صاحب! میں چوہدری فرمان علی ہی کی بات کر رہا ہوں۔''

''تمہارے چوہدری نے کیوں خودکشی کی؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ اتنا بزدل یا مجبور تو نہیں تھا۔''

چوہدری فرمان علی اپنے ظلم اور سختیوں کے سبب دور دور تک مشہور تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا، وہ جرائم پیشہ افراد خصوصاً ڈاکوؤں کی پشت پناہی بھی کرتا تھا۔ اس کے ظلم وستم اور دھاندلیوں کے قصے گاہے بہ گاہے مجھ تک پہنچتے رہتے تھے لیکن میں اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔ میری معذوری درحقیقت قانون کی مجبوری تھی۔ کسی بھی شخص کو حوالات میں پہنچانے اور ازاں بعد جیل بھجوانے کے لئے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ نمبر ایک رپورٹ اور نمبر دو گواہ! جب تک کوئی شخص ہمارے پاس کسی کے خلاف شکایت نہ لے کر آئے ہم قانونی کارروائی کے سلسلے میں بے بس ہوتے ہیں۔ از خود کسی ایکشن کے لئے مضبوط گواہوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چوہدری کی خوش قسمتی یا قانون کی بے بسی کہ فرمان علی کی زیادتیوں کے خلاف کوئی مدعی بننے کو تیار تھا اور نہ ہی گواہی دینے کے لئے...... اور اب اسی بے قابو چوہدری نے خودکشی کر لی تھی۔

کانسٹیبل اسلم نے جواب دیا۔ ''خودکشی کی وجہ ابھی تک سامنے نہیں آسکی۔ حویلی کے اندر اور باہر مختلف خبریں گردش کر رہی ہیں۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے واقعے کے بارے میں پتہ چلا۔ میں سیدھا حویلی کی طرف چلا گیا اور سن گن لینے کی کوشش کی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا اور تھانے چلا آیا۔

''کمال ہے!'' کانسٹیبل کی بات ختم ہونے پر میں نے حیرت سے کہا۔ ''نزدیکی گاؤں میں

بڑا واقعہ پیش آ گیا اور ابھی تک حویلی سے ایک بندہ بھی تھانے نہیں پہنچا۔''

کانسٹیبل نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''انہیں اپنے جھگڑوں سے فرصت ملے گی تو ادھر کا رخ کریں گے نا!''

''کیا چوہدریوں کی حویلی میں کسی قسم کا فساد پھیلا ہوا ہے؟''

''معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' کانسٹیبل نے مبہم لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں حویلی کے اندر جانے کا موقع ملا تھا؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''حویلی کا صدر دروازہ تو صبح ہی سے بند کر دیا گیا ہے۔ صرف قریبی رشتے داروں کو آنے جانے کی اجازت ہے۔ میں نے کوشش تو بہت کی لیکن اندر داخل نہ ہو سکا۔ حویلی کے باہر گاؤں میں جو خبریں گرم ہیں، میں نے انہی کی روشنی میں آپ کو اطلاع دی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ان لوگوں کو چاہئے تھا، فوراً تھانے اطلاع دیتے۔''

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چوہدری فرمان علی کی موت کوئی معمولی واقعہ نہیں اور وہ بھی خودکشی کی صورت میں۔ ابھی تک تو یہ بھی پتہ نہیں چلا اس نے کن حالات میں اور کس لئے خودکشی کی ہو گی!''

کانسٹیبل نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اگر حویلی والوں میں سے کوئی تھانے نہ آیا تو آپ کیا کریں گے؟''

''میں وہی کروں گا جو قانون کا تقاضا ہے۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''حویلی والے مجھے اطلاع دیں یا نہ دیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''تم حوالدار کو میرے پاس بھیجو۔ تھوڑی دیر میں ہم احمد نگر روانہ ہو جائیں گے۔''

''اوکے سر!'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

اگلے پندرہ منٹ کے اندر میں احمد نگر جانے کی تیاری کر چکا تھا۔ میں نے کانسٹیبل اسلم اور حوالدار شمشاد کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسلم چونکہ احمد نگر ہی کا رہنے والا تھا اس لئے اسے ساتھ رکھنے میں فائدہ تھا۔ ہمارے تھانے میں عملہ بہت کم تھا اور میں نے دو چار تجربات میں یہ نتیجہ حاصل کیا تھا کہ تفتیشی معاملات میں حوالدار شمشاد بہترین معاون ثابت ہوا تھا۔

ہم ایک سجے سنورے تانگے میں بیٹھ کر تھانے سے روانہ ہو گئے۔ تانگے والا خاصا شوقین مزاج لگتا تھا۔ اس نے اپنے تانگے کو کسی دلہن کی طرح سجا رکھا تھا۔ وہ خود بھی کسی بانکے سجیلے نوجوان کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ تانگا جب تھانے کی حدود سے نکل کر کچے راستے پر آ گیا تو کوچوان نے عاجزی سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ خیریت سے احمد نگر جا رہے ہیں نا؟''

"تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟" میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

"وہ جی...... وہ جی......" وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اوئے وہ جی کے کچھ لگتے لگاتے! تانگا چلاتے چلاتے تم نے تفتیشی کام کب سے شروع کر دیا۔ ہم احمد نگر کیوں اور کس لئے جا رہے ہیں، اس سے تمہیں کیا مطلب؟"

وہ قدرے سہم کر مجھے دیکھنے لگا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دراصل تھوڑی دیر پہلے میں نے کچھ سواریاں مراد پور سے احمد نگر پہنچائی ہیں۔ وہ لوگ بڑی افراتفری میں تھے۔ میں نے ان کی پریشانی کا سبب جاننا چاہا تو انہوں نے ٹال دیا اور اب آپ بھی احمد نگر جا رہے ہیں!" وہ معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا۔ "آپ کو اس طرف جاتے دیکھ کر مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ لگتا ہے احمد نگر میں کوئی لمبا پھڈا ہو گیا ہے۔"

تانگے والا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ احمد نگر میں ایک نہایت ہی اہم واقعہ پیش آ چکا تھا۔ اس کی باتوں سے ظاہر ہوا، وہ چوہدری فرمان علی کی خودکشی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس کا مطلب یہی تھا، اس کا تعلق احمد نگر سے نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "شہزادے! تمہارا نام کیا ہے؟"

کوچوان نے خود کو شہزادوں کی طرح بنا سنوار کر رکھنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ میرے طرز تخاطب نے اسے خوش کر دیا۔ اس کا سینہ مسرت کے جذبات سے خاصا کشادہ ہو گیا۔ اپنی تعریف سب کو اچھی لگتی ہے اور تعریف بھی کسی پولیس والے کے منہ سے! کوچوان کا فخر بے جا نہیں تھا۔

وہ بڑے انداز سے بولا۔ "جناب! بندے کا نام تو دلدار ہے لیکن سب دِلّو دِلّو کہتے ہیں۔ کیا کریں جی، لوگ نام بگاڑ دیتے ہیں۔ لاکھ سمجھاؤ، کوئی مانتا ہی نہیں!"

"تمہارا نام بگڑ کر بھی خاصا پُرکشش ہے۔" میں نے سامنے سڑک پر دور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ وہ کچی سڑک سیدھی احمد نگر گاؤں تک جاتی تھی۔ میں تصور کی آنکھ سے احمد نگر میں واقع چوہدری فرمان علی کی حویلی کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دلدار کوچوان سے ابھی بات چیت جاری تھی۔ "دلدار کی بہ نسبت "دلّو" زیادہ موثر ہے۔" ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"جناب! میرا تعلق چمن آباد سے ہے۔" اس نے بتایا۔

چمن آباد، احمد نگر، مراد پور وغیرہ ایک دوسرے کے آس پاس پائے جانے والے گاؤں تھے۔ یہ تمام علاقہ میرے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ میں نے کوچوان کو مخاطب کیا اور پوچھا۔

"دلّو! کیا تم احمد نگر کے چوہدری فرمان کو جانتے ہو؟"

"نام سنا ہے جناب، دیکھا کبھی نہیں۔" وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں بڑی خوفناک باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ہمارے گاؤں والے چوہدری فرمان کو ایک ظالم، جابر اور سفاک شخص سمجھتے ہیں۔ اس کی بربریت کی بہت سی داستانیں مشہور ہیں۔"

"وہ تمام داستانیں اور کہانیاں آج بہت افسردہ اور نادم ہیں۔" میں نے خیال افروز انداز میں کہا۔ "کیونکہ ان کا خالق مزید کسی ایسی تخلیق کے قابل نہیں رہا۔"

"کیا چوہدری فرمان کا انتقال ہو گیا؟" کوچوان کے لہجے میں تاسف کے بجائے ایک مسرت آمیز حیرانی تھی جیسے لاشعوری طور پر اسے چوہدری کی موت سے اطمینان حاصل ہوا ہو۔

میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "سنا ہے چوہدری فرمان علی نے خودکشی کر لی ہے۔ ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔"

"اوہ!" وہ ایک طویل سانس خارج کر کے خاموش ہو گیا۔

میں نے دلدار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں صدمے یا غم کے آثار مجھے نظر نہ آئے۔ ظاہر ہو رہا تھا، اسے چوہدری کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہوا تھا۔ ایک عام تانگا بان پر اتنے بڑے واقعے کے تاثر کو دیکھ کر لگتا تھا، چوہدری فرمان علی سے اکثر لوگ خوش نہیں تھے، ورنہ چوہدری کسی بھی گاؤں کے لئے ایک سائبان کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ میں نے بعض چوہدریوں کی موت پر لوگوں کو دھاڑیں مار کر روتے ہوئے دیکھا ہے۔

تھانے سے احمد نگر کا فاصلہ لگ بھگ دو میل کا تھا۔ ہم نے آدھا راستہ طے کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دلدار نے متاملانہ انداز میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! بزرگوں سے سنا ہے مرنے والے کی برائی نہیں کرنا چاہئے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چوہدری فرمان کی موت سے ہزاروں لوگ سکھ کا دم لیں گے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "ایک بات عقل میں نہیں آ رہی جناب...... اور وہ یہ کہ چوہدری خودکشی پر کیوں مجبور ہو گیا۔ اسے ایسا کون سا غم تھا؟"

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ہو گا کوئی نہ کوئی بھاری غم۔ ورنہ کوئی بھی انسان خواہ مخواہ اپنی جان سے کھیلنے کا فیصلہ نہیں کرتا۔"

"ملک صاحب! میں نے تو دو کشتیوں کے مسافر کو ہمیشہ پریشان ہی دیکھا ہے۔" کانسٹیبل اعظم نے کہا۔ "چوہدری فرمان علی بھی کسی پیچیدہ چکر میں پھنس گیا ہو گا! اس نے تو خیر سے تین کشتیوں پر جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔"

"تین کشتیوں کے مسافر والی کیا بات ہے بھئی؟" میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

میں اس کا اشارہ تو سمجھ گیا تھا لیکن انجان بنتے ہوئے وضاحت اس لئے طلب کی کہ شاید کوئی

نئی اور اہم بات سامنے آ جائے۔ چوہدری فرمان علی نے میری معلومات کے مطابق تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ اس کی تیسری بیوی خوب رو اور جوان تھی۔

اسلم نے کہا۔ ''ملک صاحب! تین گھروں کو پورا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس قسم کے شوق صرف عرب شیوخ ہی پال سکتے ہیں۔ بیوی تو ایک ہی دماغ کی ایسی کم تیسی کر دیتی ہے، کجا یہ کہ تین تین اور وہ بھی ایک پینسٹھ سالہ شخص کی!''

''تمہاری شادی ہوگئی ہے اسلم؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی نہیں ملک صاحب!'' اس نے بتایا۔ ''آپ کو تو یہ بات معلوم ہے۔''

میں نے اس کے جواب کے آخری حصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی عجیب انسان ہو۔ شادی ہوئی نہیں اور بیویوں کے تجربات دل کھول کر بیان کر رہے ہو!''

وہ جھینپ کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔ فطری طور پر وہ ایک شرمیلا انسان تھا۔

حوالدار نے کہا۔ ''ملک صاحب! اس کی شادی نہیں ہوئی تو کیا ہوا۔ اس نے درجنوں شادیوں میں شرکت تو کی ہوگی۔'' حوالدار کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ''شمشاد! براتیں دیکھنے اور دلہا بننے میں فرق ہوتا ہے!''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے دلدار عرف دلو؟'' میں نے کوچوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے لمبے چوڑے خیالات کا اظہار کرنے لگا جن کا ذکر میں ضروری نہیں سمجھتا۔ ہر شخص کے اپنے مشاہدے اور تجربے ہوتے ہیں اور وہ اپنی سوچ کے مطابق ان سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ ہم اسی نوعیت کی تبصرہ جاتی گفتگو کرتے ہوئے احمد نگر پہنچ گئے۔

ہم سرکاری لباس میں تھے۔ پولیس یونیفارم کا اپنا ایک ٹھکا ہوتا ہے۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حویلی کے صدر دروازے پر ایک صحت مند شخص نے ہمارا استقبال کیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ وہ چوہدری فرمان کا بیٹا ہوگا لیکن تعارف پر میرا خیال غلط ہوگیا۔ وہ چوہدری کا چھوٹا بھائی قربان علی تھا۔ قربان کی عمر تیس سال کے قریب ہوگی۔

اس نے ہمیں ایک کشادہ اور آراستہ و پیراستہ بیٹھک میں بٹھایا اور کہنے لگا۔ ''بس میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا آپ یہاں پہنچ گئے۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ ''آپ کو اس واقعے کی خبر کیسے ہوئی؟''

اس کے سوال میں تشویش سے زیادہ حیرانی پائی جاتی تھی۔ فرمان علی کے برادر خورد کو حیران ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ ایسے فرعون صفت چوہدریوں کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ دنیا میں یا کم از کم ان کے علاقے میں سب کچھ انہی کی مرضی سے ہوتا ہے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چوہدری قربان! میں تھانے میں بیٹھ کر مونگ پھلی اور

چلغوزے نہیں بیچتا بلکہ تھانے داری کرتا ہوں۔ میرے معلومات کے اپنے ذرائع ہیں جو میں نہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔'' ذرا رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''میں تو توقع کر رہا تھا، تم لوگوں میں سے کوئی تھانے آ کر مجھے مطلع کرے گا لیکن میں محسوس کر رہا ہوں، آپ لوگوں کے نزدیک رپورٹ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اب تو دوپہر ہونے والی ہے!''

''نن...... نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ میرے سخت انداز نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ ''میں نے بتایا ہے نا، میں آپ کی طرف آنے ہی والا تھا۔ خیر آپ حکم کریں ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟''

بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ مجھے اس کے رویے پر سخت حیرت ہوئی۔ اس کے بڑے بھائی نے خودکشی کی تھی اور ہمیں بٹھا کر آرام سے خاطر داری کرنا چاہتا تھا۔ اس کا یہ عمل غیر فطری اور حالات کے منافی تھا۔ بڑے بھائی کی موت پر اسے جتنا ملول اور غم زدہ نظر آنا چاہئے تھا، اس کا عشرِ عشیر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ ایک خاص نوعیت کی برہمی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ وہ الجھا ہوا نہیں بلکہ جھنجلاہٹ میں مبتلا لگتا تھا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چوہدری قربان! میں یہاں خاطریں کروانے نہیں آیا۔ جلدی سے مجھے اس جگہ لے چلو جہاں تمہارے بڑے بھائی نے خودکشی کی ہے تاکہ موقع کی کارروائی شروع ہو سکے۔''

میری تقلید میں حوالدار اور کانسٹیبل بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ چوہدری قربان نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا اور حیرت میں بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''خودکشی...... آپ اسے خودکشی کہہ رہے ہیں!''

''خودکشی کو خودکشی نہ کہوں تو پھر کیا کہوں؟''

''تھانے دار صاحب! بھائی صاحب کو قتل کیا گیا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''قتل؟'' اب میرے چونکنے کی باری تھی۔

وہ رازداری سے بولا۔ ''بھائی صاحب نے خودکشی نہیں کی بلکہ انہیں خودکشی کے رنگ میں قتل کیا گیا ہے۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ کو قاتل کی گرفتاری کے لئے کسی بھی قسم کے پاپڑ نہیں بیلنا پڑیں گے کیونکہ میں نے قاتل کو قابو میں کر لیا ہے۔''

''یہ تم ایک انوکھی اور عجیب کہانی سنا رہے ہو۔''

''میں نے عرض کیا نا، اسی لئے تو تھانے آنے میں دیر ہوگئی۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے شیشے میں اتارنے کے لئے کوشاں ہوں۔ ''میں تو پہلی فرصت میں قاتل کو گھسیٹ کر تھانے لانا چاہتا تھا لیکن وہ بے ہوش ہے۔''

''کون بے ہوش ہے؟'' بے ساختہ میری زبان سے نکلا۔ ''تم نے کس شخص کو قابو کیا ہے۔ مجھے فوراً اس کے پاس لے چلو...... اور اس سے پہلے میں جائے وقوعہ پر جانا چاہتا ہوں۔''

دیکھتے ہی دیکھتے میرے اندر تجسس کا الاؤ بھڑک اٹھا تھا۔ حویلی آ کر بڑی حیرت انگیز باتیں سننے کو مل رہی تھیں۔ میرے سوال کے جواب میں چوہدری قربان نے بتایا۔

''قاتل کوئی غیر نہیں بلکہ یہ خطرناک کام میری بھابی نے کیا ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو اسے بھابی کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہو رہی ہے۔''

قربان کے تازہ ترین انکشاف پر میں اچھل پڑا۔ ''تم اپنی کس بھابی کا ذکر کر رہے ہو؟'' بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا۔ ''تمہارے بھائی کی تو تین بیویاں ہیں۔''

''میں سب سے چھوٹی بھابی نرگس کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔

میری معلومات کے مطابق چوہدری فرمان کی تیسری اور اب آخری بیوی نرگس کی عمر پچیس کے قریب تھی۔ فرمان علی اس سے دوگنا سے بھی زیادہ عمر کا تھا۔ قربان کی بتائی ہوئی بات خاصی تشویش ناک تھی۔ میں نے اس سے استفسار کیا۔

''نرگس کو تم نے کہاں بند کیا ہے اور وہ بے ہوش کیوں ہو گئی؟''

''جناب نیچ لوگ اپنی جان بچانے کے لئے یا تو گالیوں پر اتر آتے ہیں یا پھر بے ہوشی کا ڈراما رچاتے ہیں۔'' قربان نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے نرگس سے تھوڑی پوچھ پرتیت کی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ لیکن آپ اس کی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ میں نے نرگس کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔ قاتل کے فرار ہونے کا امکان نہیں ہے۔''

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی اور وہ یہ کہ چوہدری قربان اپنی بھابی نرگس کے لئے دل میں بہت کدورت رکھتا تھا۔ ابھی اس نے نرگس کو نیچ لوگ سے تعبیر کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ نرگس کو سخت ناپسند کرتا ہوگا۔ کیوں؟ یہ بعد میں بھی معلوم کیا جا سکتا تھا!

میں نے بیٹھک سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''قربان علی! میں جائے وقوعہ پر جا رہا ہوں۔ کیا نرگس کو بھی تم نے ادھر ہی کہیں بند کیا ہے؟''

میں سر دست نرگس کے قاتل ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں قربان علی سے کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ جائے واردات کا جائزہ لیا جاتا۔ مبینہ قاتل مقید تھا لہٰذا اس کی طرف سے پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔

چوہدری قربان علی نے میرے سوال کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔

''ایک منٹ تھانے دار صاحب! میں اندر ذرا پردے کا کہہ دوں۔''

پانچ منٹ بعد ہم تینوں اس کمرے میں پہنچ گئے جس کی چھت سے چوہدری فرمان علی کی لاش لٹک رہی تھی۔ موضع احمد نگر کا ٹھسے دار اور ظالم و جابر حکمران، حکمرانی سے بہت دور چھت اور فرش کے درمیان ٹنگا ہوا تھا۔ اس کی ساری فرعونیت ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے بغور لاش کا جائزہ لیا۔ لاش اس لئے کہہ رہا ہوں کہ چھت سے لٹکے ہوئے وجود کو

دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا، وہ زندوں میں نہیں تھا، زندگی اس سے روٹھ کر بہت دور جا چکی تھی۔ چوہدری فرمان علی کی گردن میں نائیلون کی مضبوط ڈوری کا پھندا کسا ہوا تھا۔ اس ڈوری کا رنگ نیلا تھا۔ یہی ڈوری چھت اور پھندے کے درمیان بھی وسیلہ ربط و ضبط بنی ہوئی تھی۔ میں نے چوہدری کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں تاہم وہ حلقوں سے ابلی نہیں پڑ رہی تھیں جیسا کہ عموماً پھانسی شدہ افراد کی نظر آتی ہیں۔

جھولتی ہوئی لاش کے عین نیچے کمرے کے فرش پر ایک چوبی میز پہلو کے بل الٹی پڑی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چوہدری نے پھندا گردن میں فٹ کرنے کے بعد اس میز کو الٹا دیا ہو۔

میں نے اس میز کو سیدھا کیا تو مجھے اندازہ ہوا، وہ خاصی وزنی میز تھی۔ اس کا وزن بیس سیر سے کم نہیں تھا، تین پایوں والی اس گول میز کو سیاہ شیشم کی لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ وہ میز لگ بھگ ڈھائی فٹ اونچی تھی اور اس کی گول ٹاپ کا قطر چار فٹ رہا ہوگا۔ اسی مضبوط اور بھاری بھر کم میز کو پاؤں کی ٹھوکر سے الٹنا آسان کام نہیں جب کہ الٹانے والا ایک پینسٹھ سالہ بوڑھا سا ہو تو یہ کام تقریباً ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے۔ میں اس نکتے پر تھوڑا چونکا پھر موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے اسلم اور شمشاد کی مدد سے لاش کو نیچے اتروایا۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں نے اسے سرکاری ہسپتال بھیجنے کے احکام صادر کئے تو چھوٹا چوہدری آڑے آ گیا۔ ''تھانے دار صاحب!'' قربان علی نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بھائی صاحب کی لاش کو آپ ہسپتال کیوں بھجوانا چاہتے ہیں؟''

''پوسٹ مارٹم کے لئے۔'' میں نے سیدھا اور سادہ جواب دیا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں جناب!'' اس نے کہا۔ ''یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس ہے اور قاتل کو میں نے ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ آپ اس نامراد کو جیل بھجوائیں۔ خواہ مخواہ بھائی صاحب کی لاش کی بے حرمتی کیوں کرواتے ہیں؟'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر ناگواری سے بولا۔ ''میں نے سنا ہے پوسٹ مارٹم میں لاش کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتے ہیں!''

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے قربان علی!'' میں نے کہا۔ ''تمہارے بھائی کی موت طبعی حالات میں واقع نہیں ہوئی اس لئے پوسٹ مارٹم بہت ضروری ہے۔ تم خواہ مخواہ قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔''

''میں نے قاتل کو بند کر......'' وہ ایک مرتبہ پھر نرگس کا حوالہ دینا چاہتا تھا۔

''میں تمہارے بند کئے ہوئے قاتل سے بھی ملاقات کر لیتا ہوں۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''بہتر یہی ہوگا، تم صبر و سکون سے کام لو اور ضروری کارروائی میں مجھ سے بھرپور تعاون کرو۔''

وہ بے بسی سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے اسلم کی نگرانی میں چوہدری فرمان علی کی لاش کو

ضلعی ہسپتال روانہ کر دیا۔ دلدار عرف دلو کا تانگا حویلی کے باہر موجود تھا لہٰذا اس سلسلے میں کسی تاخیر کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں جائے وقوعہ کا جائزہ لینے لگا۔

وہ پندرہ بائی بیس فٹ کا ایک کشادہ کمرا تھا اور اپنی سیٹنگ کے اعتبار سے بیڈروم نظر آتا تھا۔ ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ چوہدری قربان علی کی خواب گاہ تھی، کمرے میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی بلکہ بعض اشیاء بلا ضرورت بھی تھیں۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ اس کمرے کی جس چیز نے مجھے چونکنے پر مجبور کیا، وہ اس کی دیواروں میں موجود دروازے تھے۔ ہر دیوار میں ایک منقش دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جس دروازے سے میں اس خواب گاہ میں داخل ہوا تھا، وہ ایک برآمدے میں کھلتا تھا اور اس وقت مکمل طور پر وا تھا۔ باقی تینوں دروازے بند تھے۔ میرے استفسار پر قربان علی نے بتایا۔

"تھانے دار صاحب! بھائی صاحب کا یہ کمرا رہائشی حصے کے وسط میں واقع ہے۔ آپ جن دروازوں کے بارے میں پوچھ رہے ہیں وہ تین مختلف خواب گاہوں میں کھلتے ہیں۔ ہر خواب گاہ میری ایک بھابی کے لئے مخصوص ہے۔ یعنی ان تین کمروں میں بھائی صاحب کی تین بیویاں الگ الگ رہتی ہیں...... بلکہ تھیں۔ اب تو دو باقی بچی ہیں، تیسری کو میں نے قید کر رکھا ہے۔"

اس کا بیان سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر دروازوں پر نظر ڈالی۔ دو دروازوں پر مجھے تالے نظر آئے جبکہ تیسرے دروازے پر تالا دکھائی نہ دیا۔ تاہم وہ بند تھا۔ میں نے اس سلسلے میں قربان علی سے پوچھا۔ "یہ تالوں کا کیا راز ہے؟"

اس نے بتایا۔ "بھائی صاحب کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ ان کے طلب کرنے پر ہی کوئی بیوی ان کی تنہائی میں آتی تھی۔ وہ تینوں دروازوں پر اندر سے تالے ڈال کر رکھتے تھے۔ وہ جس بیوی کی ضرورت محسوس کرتے اس کے کمرے کا دروازہ کھول دیتے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا کہ اس کمرے میں موجود بیوی کے ساتھ وہ رات بسر کریں گے۔"

"عجیب وغریب اصول تھا تمہارے بھائی کا۔" میں نے ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "بیویاں نہ ہوئیں، بھیڑ بکریاں ہوئیں جنہیں اشارے پر طلب کیا جاتا۔ ایسی ازدواجی زندگی پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی ہے۔ تمہارے بھائی صاحب تو بہت نرالے خاوند تھے۔"

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ "آپ وہ دروازے دیکھ رہے ہیں؟" اس کا اشارہ مغربی اور مشرقی دروازوں کی طرف تھا۔ "ان پر تالے نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے مغربی کمرے میں بڑی بھابی رشیدہ رہتی ہیں جبکہ مشرقی کمرا درمیانی بھابی رخسانہ کے لئے مخصوص ہے۔ رخسانہ کے استعمال میں دو تین کمرے اور ہیں جن میں اس کا بیٹا سلطان اور بیٹی فرزانہ رہتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "رخسانہ بھابی اور رشیدہ بھابی والے کمروں پر موجود تالے ظاہر کرتے ہیں کہ گزشتہ رات ان میں سے کوئی بھائی صاحب کے

کمرے میں نہیں آیا۔ اب آ جا کے نرگس ہی باقی بچتی ہے۔ وہ سامنے شمال میں کھلا ہوا دروازہ اسی کے کمرے کا ہے۔ یعنی اس کمرے کا تالا بند نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رات میں بھائی صاحب کے ساتھ تھی اور...... سب سے خاص بات یہ کہ نرگس ہی نے بھائی صاحب کی خودکشی کے بارے میں بتایا تھا۔ میں تو فوراً سمجھ گیا، یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ میرے دو چار سوالات میں ہی وہ گھبرا گئی۔ میں نے اقرارِ جرم کے لئے ذرا سختی کی تو وہ بے ہوشی کا ناٹک کرنے لگی۔ میں نے اٹھا کر اسے کمرے میں بند کر دیا۔"

وہ ہر صورت نرگس کو قاتل ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے جائے وقوعہ کا مکمل نقشہ تیار کیا۔ نہایت ہی ضروری اور اہم نکات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کیا اور چوہدری قربان علی سے کہا۔

"تمہارے علاوہ اس وقت حویلی میں اور کون ہے؟"

"رشیدہ بھابی اور رخسانہ بھابی اپنے کمروں میں موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔ "یا پھر حویلی میں کام کرنے والے ملازم ہیں۔"

"رخسانہ کے بچے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے ماموں کے پاس گئے ہوئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "رخسانہ کا بھائی چوہدری کرم داد قلعہ واسو سنگھ میں رہتا ہے۔ میں نے اس واقعے کی اطلاع کرم داد کو بھجوا دی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ بچوں کو لے کر شام سے پہلے یہاں پہنچ جائے۔"

"گھریلو ملازمین کی تعداد اور نام کیا ہیں؟"

"کل چھ ملازم اس حویلی میں کام کرتے ہیں۔" وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "چار عورتیں اور دو مرد۔ عورتوں کے نام شریفاں، منیرہ، نکو اور سلمٰی ہیں جبکہ مردوں کے نام مطلوب اور منظور ہیں۔"

"کیا چھ کے چھ اس وقت حویلی میں موجود ہیں؟" میں نے پوچھا۔

چوہدری قربان علی نے جواب دیا۔ "منظور کو میں نے قلعہ واسو سنگھ بھیجا ہے۔ سلمٰی آج حویلی آئی ہی نہیں۔ باقی چاروں اس وقت حویلی میں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "حویلی کے صدر دروازے کو بند کرا دو اور جب تک یہاں کارروائی جاری ہے کوئی بندہ بشر حویلی سے باہر جائے گا اور نہ ہی اندر داخل ہو گا۔ میں یہاں موجود ہر شخص سے تفصیلی بیان لوں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے قربان علی سے پوچھا۔ "تم حویلی کے کس حصے میں رہتے ہو؟"

"سامنے والے حصے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ جو گیٹ کے پاس ہے۔"

پھر میری ہدایت پر وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں اور حوالدار شمشاد گھوم پھر کر چوہدری قربان علی کی خواب گاہ کا تنقیدی جائزہ لینے لگے۔ چار دروازوں کے علاوہ اس کمرے میں کوئی

قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔

حویلی کے اندر داخل ہونے کے بعد میں نے سرسری انداز میں اس کی مکانیت کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ حویلی دو رہائشی حصوں پر مشتمل تھی۔ ابتدائی حصے میں گیٹ کے قریب بیٹھک کے ساتھ کئی کمرے بنے ہوئے تھے جن میں ایک دو عام سے اور باقی عالی شان تھے۔ میرے خیال میں وہ عام سے نظر آنے والے کمرے ملازمین کے لئے تھے۔ میرے استفسار پر قربان علی نے بتایا کہ مطلوب اور منظور مستقل طور پر حویلی ہی میں رہتے تھے جبکہ عالی شان رہائشی حصہ قربان کے لئے مختص تھا۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں، حویلی کے دوسرے رہائشی حصے میں فرمان علی اپنی تین بیویوں کے "جھرمٹ" میں رہتا تھا اور اس طرح کہ کوئی بیوی اپنی مرضی سے دم نہیں مار سکتی تھی۔ چوہدری کے طلب کرنے پر ہی وہ حاضر ہوتیں اور اس کی دل بستگی کا سامان کرتیں۔ بڑے مزے تھے چوہدری فرمان علی کے۔ اس کا ظلم اور زیادتی رعایا ہی کے لئے نہیں تھے بلکہ اس کی ازدواج بھی اس سے متاثر ہوتی تھیں۔ یہ کیسی رفاقت تھی کہ بیوی اپنی مرضی اور منشا سے خاوند کے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ چوہدری کی شریکِ حیات نہ ہوں بلکہ زر خرید لونڈیاں ہوں جنہیں چوہدری کے اشاروں پر ناچنے کے لئے پابند کر دیا گیا ہو!

تھوڑی دیر بعد چوہدری قربان واپس آ گیا اور اس نے آ کر بتایا۔ "جناب! میں نے حویلی کا گیٹ بند کروا کے وہاں مطلوب کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ میرے علم میں لائے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہیں جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔"

چوہدری قربان کا رویہ غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بڑا بھائی ختم ہو گیا۔ چوہدری فرمان علی نے خودکشی کی تھی یا اسے پھانسی کے ذریعے قتل کیا گیا، اس سے قطع نظر قربان کو اپنے بھائی کی موت پر جس طرح غم زدہ اور ملول ہونا چاہئے تھا، وہ کیفیت اس کے انداز اور گفتگو میں کہیں نظر نہیں آتی تھی بلکہ اس کے رویے سے ایک خاص نوعیت کا اطمینان جھلکتا تھا۔ شروع میں، میں نے جو جھنجلاہٹ اور بیزاری اس کے چہرے پر دیکھی تھی، وہ اب دور دور نظر نہیں آتی تھی۔ قربان علی کی ان اداؤں نے مجھے کھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا سب سے پہلے اسی کا انٹرویو کرنا چاہئے۔

مجھے سوچ میں غرق دیکھ کر اس نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! اب میں آپ کو قاتل کے پاس لے چلتا ہوں تاکہ آپ قانون کے تقاضے پورے کر سکیں۔ وہ ادھر میری رہائش والے حصے میں بند ہے۔"

"تمہیں بڑی جلدی ہے چوہدری!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ذرا چھری تلے دم لو۔ نرگس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ وہ فرار ہو جائے

گی؟"

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔ میں نے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا ہے۔"

"تو فکر کس بات کی ہے؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلے تم سے چند سوالات ہو جائیں پھر نرگس کو بھی دیکھ لوں گا۔"

"مم...... مجھ سے آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" اس کے انداز میں یکدم بوکھلاہٹ آ گئی۔ "میں نے ساری بات تو آپ کو بتا دی ہے۔"

"یہ تمہارا خیال ہے جو ضروری نہیں درست بھی ہو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں تم سے پوچھنے کے لئے ابھی بہت کچھ ہے۔" پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ "یہاں تو بیٹھا نہیں جا سکتا۔ کیا کوئی اور موزوں جگہ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "چلیں، ادھر بیٹھک میں جا کر بیٹھتے ہیں یا پھر آپ میرے کمرے میں آ جائیں۔"

ہم اٹھے اور چوہدری قربان علی کے ساتھ بیٹھک میں پہنچ گئے۔ وہ ایک مرتبہ پھر خاطر تواضع کے لئے زور مارنے لگا لیکن میں نے اس کی پیشکش کو بڑی بے دردی سے ٹھکرا دیا حالانکہ وہ کھانے کا وقت تھا لیکن میں پیٹ پوجا کے بکھیڑے میں پڑ کر وقت برباد نہیں کر سکتا تھا۔ میں جس مقصد کی خاطر وہاں آیا تھا، اگر وہ حاصل ہو جاتا تو پھر طعام اور آرام کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

چوہدری قربان علی نے اپنی کوشش کو ناکامیاب ہوتے دیکھا تو اس کا منہ لٹک گیا۔ میں نے سپاٹ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ "تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

حالات و واقعات ظاہر کرتے تھے، وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس نے اب تک ایک مرتبہ بھی اپنی بیوی یا بچوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ چوہدری قربان تیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ گاؤں دیہات میں لڑکوں کی شادی اٹھارہ سے پچیس سال تک عموماً ہو جاتی تھی۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ایک سال پہلے میری شادی ہوئی تھی لیکن شادی کے ایک ماہ بعد نجمہ مجھ سے جدا ہو گئی۔" اس کی آواز میں ہلکی سی نمی شامل ہو گئی۔ "نجمہ کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔"

میں سمجھ گیا، نجمہ اس کی بیوی کا نام تھا۔

"اس کے بعد تم نے شادی کے بارے میں نہیں سوچا؟" میں نے اسے ٹٹولا۔

وہ قطعیت سے بولا۔ "نہیں! حالانکہ بھائی صاحب زور دیتے رہے کہ میں فوراً شادی کر لوں تاکہ نجمہ کی یاد سے چھٹکارا مل جائے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔"

میں فروعی باتوں کو چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ ''تمہیں کب اور کیسے پتہ چلا کہ چوہدری فرمان نے خودکشی کر لی ہے؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات مجھے منظور نے بتائی تھی۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔ ''منظور کو نرگس کی زبانی پتا چلا تھا اور...... میرا خیال ہے یہ صبح سات بجے کا واقعہ ہے، میں سویا ہوا تھا۔ منظور نے دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے جگایا اور بتایا کہ بڑے چوہدری صاحب نے خودکشی کر لی ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! نرگس بہت عیار ہے۔ اس نے منظور کو جو الٹی سیدھی پٹی پڑھائی، وہ سیدھے سادے منظور نے مجھے بتا دیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بھائی صاحب کو پھانسی لگا کر باقاعدہ قتل کیا گیا ہے۔ اور قاتل نرگس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا!''

اس کے حتمی اور قطعی انداز نے مجھے غصہ دلا دیا۔ میں نے برہمی سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس ایسا کون سا ثبوت ہے جس سے نرگس قاتل ثابت ہوتی ہے؟''

''جی...... اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا......''

''لگتا ہے تمہاری عقل کہیں گھاس چرنے گئی ہے۔'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''چوہدری فرمان علی جس طرح چھت سے لٹکا ہوا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے یہ کام اس کی اپنی مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ اگر نرگس یا کوئی اور چوہدری کو پھانسی پر لٹکاتا تو ایک اودھم مچ جاتا۔ چوہدری اتنا بے بس ہرگز نہیں تھا کہ ایک عورت کے ہاتھوں پھندا گلے میں ڈال کر چھت سے لٹک جاتا۔ ہوش کے ناخن لو...... اور مجھے گمراہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی کہانی لگتی ہے۔''

میرا سرزنش بھرا انداز دیکھ کر وہ قدرے نرم پڑ گیا۔ رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''ہو سکتا ہے، یہ کام نرگس نے اپنے کسی یار کی مدد سے کیا ہو۔ سچ اگلوانا تو آپ کی ذمے داری ہے نا جناب!''

وہ بات ختم کر کے ذومعنی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میری نگاہ میں غیر معتبر ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے اس نے نرگس کے لئے ''نیچ'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ پھر اسے ''عیار'' کہا تھا اور اب وہ اس کے کسی ''یار'' کا ذکر کر رہا تھا، گویا وہ اپنی بھابی پر کیچڑ اچھال رہا تھا۔ یہ تو نرگس سے ملاقات کے بعد ہی پتا چلتا کہ اس پر کیچڑ گری یا نہیں مگر ابھی تو کیچڑ اچھالنے والے کے ہاتھ مجھے لتھڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا تمہیں نرگس سے کوئی ذاتی پرخاش ہے؟'' میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔ ''گھوم پھر کر تمہاری تان اسی پر آ کر ٹوٹتی ہے!''

''نن...... نہیں جی۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''میں تو حقائق بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تھانے دار صاحب!''

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہاری نظر میں حقائق یہی ہیں کہ اس حویلی میں

بندہ لگانا بچوں کا کھیل ہے؟''

میں ابھی تک نرگس سے ملا نہیں تھا مگر جانے کیوں مجھے اس عورت سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید میرے احساسات میں قربان علی کی نامعقولیت کا زیادہ ہاتھ تھا۔

وہ فکرمند لہجے میں بولا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

''یہ میں نہیں، تم کہہ رہے ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے نرگس کے کسی یار کا ذکر کیا ہے۔ کیا تمہاری حویلی کا حفاظتی انتظام اتنا ہی بودا ہے کہ کوئی کسی وقت بھی اندر گھس کر اپنا مقصد پورا کر کے خاموشی سے واپس جا سکتا ہے؟''

''میں اس حویلی کی طرف میلی نظر سے دیکھنے والے کی آنکھیں نکال دوں گا۔'' وہ طیش میں آ گیا۔ ''آپ نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟''

''بات بڑی ہے یا چھوٹی تمہاری طرف سے شروع ہوئی ہے قربان علی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے چوہدری فرمان علی کے ممکنہ قاتل اور نرگس کے شریکِ جرم کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے تو تمہارے بیان کی روشنی میں ایک سوال کیا ہے۔ تم جوش میں کیوں آ رہے ہو؟''

''تھانے دار صاحب! اگر پاٹن ڈھیلے اور دانے گیلے ہوں تو پھر حفاظتی بندوبست ایک طرف دھرا رہ جاتا ہے۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے کہ نرگس نے اپنے معاون کے لئے خود راستہ ہموار کیا ہو گا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے، تم کتنی بڑی اور خطرناک بات کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں، مجھے پوری طرح احساس ہے۔''

''تم اپنی بھابی نرگس پر بدچلنی کا الزام لگا رہے ہو!''

''یہ الزام نہیں، حقیقت ہے۔'' وہ تیقن سے بولا۔

میں نے اسے گھسنا ضروری سمجھا۔ ''تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟''

''حبیب احمد۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے دھیمے انداز میں دریافت کیا۔ ''اور کہاں رہتا ہے؟''

اس نے سرگوشی سے قریب لہجے میں کہا۔ ''نرگس کا کوئی رشتے دار ہے۔ ادھر مراد پور میں رہتا ہے۔''

''تم نے چوہدری فرمان کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا؟''

''کئی بار بتایا تھا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا؟''

''بھائی صاحب نے میری بات کو اہمیت نہیں دی۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''میں نے

خاموش ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔ بھائی صاحب کے آگے کسی کی نہیں چل سکتی تھی۔"

میں اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھنے لگا۔ نرگس کے لئے اس کی نفرت کا سبب سامنے آ گیا تھا۔ اسے فیل یا پاس کرنا میرا فرض تھا۔ میں نے ایک پارٹی کا موقف سنا تھا۔ دوسری پارٹی یعنی نرگس کا بیان ہو جاتا تو پھر صورت حال کی وضاحت ہو سکتی تھی۔ جب پینسٹھ سال کا کوئی بوڑھا شخص پچیس سالہ دوشیزہ سے شادی کرتا ہے تو کوئی بھی حیرت انگیز اور تحیر آمیز واقعہ رونما ہو سکتا ہے۔ اگر قربان علی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تو اس کیس میں حد درجہ سنسنی خیزی کا امکان تھا۔ قتل یا خودکشی کی یہ واردات کسی عجیب کروٹ بیٹھنے والی تھی!

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے چوہدری قربان سے کہا۔ "میں اس موضوع پر بعد میں تم سے تفصیلی بات کروں گا۔ فی الحال تم مجھے نرگس کے پاس لے چلو۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ "آپ میرے ساتھ آؤ جی۔"

میں اور حوالدار شمشاد اس کی معیت میں بیٹھک سے ملحق ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ قربان نے کمرے کے دروازے پر موجود تالے کو کھولا اور دروازے کے پٹ وا کر کے اندر داخل ہو گیا۔ جب ہم نے اندر قدم رکھے تو وہ اندرونی لائٹ آن کر چکا تھا۔ روشن کمرے میں میری آنکھوں نے ایک افسوس ناک منظر دیکھا۔

ایک دھان پان حسین و جمیل اور انتہائی پُرکشش عورت کمرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ کمرے میں ایک بیڈ اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ اس ستم نصیب عورت نے فرش نشینی اختیار کرنے کو بہتر جانا تھا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے چونک کر خوف زدہ نظر سے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا۔

چوہدری قربان نے کہا۔ "تھانے دار صاحب! لگتا ہے یہ ہوش میں آ گئی ہے۔ آپ کو پوچھ تاچھ میں آسانی رہے گی۔"

میں یک ٹک نرگس کو تکے جا رہا تھا۔ وہ بڑی کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ پہلی ہی نگاہ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اسے بے دریغ زدوکوب کیا گیا تھا اور یہ "کارنامہ" چھوٹے چوہدری کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ نرگس نے دو تین مرتبہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھا پھر گردن ڈال کر بیٹھ گئی۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات اجاگر ہو چکے تھے۔ اس کی حالت نے ایک نرم گوشہ وا کر دیا۔ چوہدری قربان نے اس پر بہت ظلم ڈھایا تھا۔

میں نے قربان کے لئے اپنے غصے کو پوشیدہ رکھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ "قربان! میں نرگس سے تنہائی میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!"

میرے لہجے کی قطعیت نے اسے باور کرا دیا کہ میں اس کی کوئی دلیل سننے کے موڈ میں نہیں لہٰذا وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "ٹھیک ہے جناب، میں آپ کے حوالدار کے ساتھ بیٹھک

میں بیٹھا ہوں۔"

"تم فضول بیٹھ کر وقت برباد نہ کرو۔" میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔ "حوالدار کو فرمان علی کے کمرے میں لے جاؤ۔ یہ ایک مرتبہ پھر وہاں کا تنقیدی جائزہ لے گا۔ ہو سکتا ہے اس کیس کو حل کرنے کے لئے کوئی مفید اشارہ مل جائے۔" بات ختم کرتے ہی میں نے شمشاد کی جانب پُرمعنی نظر سے دیکھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا مطمح نظر سمجھ گیا تھا۔

چوہدری قربان نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "جناب! اس کیس میں حل کرنے والی کون سی بات باقی رہ گئی ہے۔ میں نے ساری حقیقت تو آپ کو بتا دی ہے۔"

"تھانے دار میں ہوں یا تم؟" میں نے غصیلی نظر سے گھورا۔

وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ظاہر ہے تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔"

"پھر تھانے داری مجھے ہی کرنے دو۔" میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، اس کیس کو کس طرح حل کیا جائے گا۔ کچھ آیا تمہاری عقل میں؟"

وہ بہ امر مجبوری بولا۔ "جیسے آپ کی مرضی جناب!"

پھر وہ حوالدار کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے پیچھے سے آواز دے کر اسے روکا اور کہا۔ "فرمان علی کے کمرے کی طرف جانے سے پہلے ایک گلاس پانی مجھے دے جاؤ۔"

وہ "اچھا جی" کہہ کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نرگس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ ہنوز سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"نرگس! تمہارے شوہر کی ناگہانی موت کا مجھے بڑا دکھ ہے۔"

شاید وہ ایک تھانے دار سے ایسے نرم اظہار کی توقع نہیں کر رہی تھی، یک بارگی اس کی گردن اٹھی اور وہ آنسوؤں سے تر چہرے سے مجھے دیکھنے لگی۔ بلاشبہ وہ لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں غم و اندوہ کے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ مجھے اس وقت حزن و ملال کا ایک ناقابلِ فراموش مرقع دکھائی دی۔ وہ چونکہ زبان سے ایک لفظ نہیں بولی تھی لہٰذا یہ فریضہ مجھے ہی انجام دینا پڑا۔

"میں تمہارے شوہر کو زندہ تو نہیں کر سکتا لیکن تم سے میرا وعدہ ہے، میں چوہدری فرمان کے قاتل کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچاؤں گا۔"

وہ کچھ نہیں بولی اور نفرت بھری نگاہ سے کمرے کے فرش کو گھورنے لگی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ اسے اپنے خاوند کی موت کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوا تھا۔ اس کا بولنا ضروری تھا۔ اگر وہ یونہی گونگی بنی بیٹھی رہتی تو میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک اور زاویے سے وار کیا۔

"تمہارا یہ حشر یقیناً چھوٹے چوہدری نے بنایا ہے؟"

میرے لہجے میں پوشیدہ ہم دردی اور اپنائیت نے اس کے ضبط کا بندھن توڑ دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسی دوران میں پانی سے بھرا ہوا ایک گلاس وہاں پہنچا دیا گیا۔ میں نے نرگس کو رونے دیا تاکہ اس کے سینے میں تھما ہوا طوفان گزر جائے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے آنسو رک گئے۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ تھوڑے سے تامل کے بعد فرش سے اٹھ کر کرسی پر پہنچ گئی۔ میں نے اصرار کر کے اسے آدھا گلاس پانی پلایا اور جب وہ قدرے نارمل ہو گئی تو میں نے سوال کیا۔ "چوہدری قربان نے تمہیں کیوں پیٹا ہے؟"

"یہ تو آپ اسی شیطان سے جا کر پوچھیں۔" پہلی مرتبہ اس نے میرے کسی سوال کا جواب دیا۔ اس کے ادا کردہ الفاظ میں بڑی کڑواہٹ تھی۔

میں نے کہا۔ "اس کا دعویٰ ہے کہ تم نے چوہدری فرمان کو قتل کیا ہے؟"

"کاش! میں نے ایسا کیا ہوتا۔" وہ ہونٹوں کا سوا ستیاناس مارتے ہوئے بولی۔

"اس کا مطلب ہے، تم اس جرم سے انکاری ہو؟"

"قربان انتہائی خبیث اور کمینہ آدمی ہے۔" وہ پھنکار کر بولی۔ "وہ ایک سو ایک فی صد جھوٹ بولتا ہے۔ وہ بھی مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ میں چوہدری کا قتل قبول کر لوں۔ میرے انکار پر اس نے مجھے دھنک کر رکھ دیا۔ آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں نا؟" وہ ذرا رک کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "تمہیں بہت بری طرح مارا پیٹا گیا ہے۔ تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ تم فکر نہ کرو میں پہلی فرصت میں تمہیں سرکاری ہسپتال پہنچاتا ہوں۔ تمہاری بعض چوٹیں بہت خطرناک ہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں ہو گا تھانے دار صاحب۔" وہ دانتوں پر دانت جماتے ہوئے بولی۔ "میں بہت سخت جان ہوں۔ اگر مجھے اتنی آسانی سے مرنا ہوتا تو بہت پہلے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتی۔ چوہدری فرمان سے زیادہ ظالم و جابر اور کون ہو گا!" وہ ذرا متوقف ہوئی پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "قربان بہت گھٹیا ہے۔ مجھ سے اقبالِ جرم کروانے کے لئے خواہ مخواہ مجھے مارتا رہا حالانکہ اگر میں نے فرمان علی کو موت کے گھاٹ اتارا ہوتا تو یہ چھپانے والی نہیں بلکہ فخریہ بیان کرنے والی بات تھی۔"

اس کے ایک ایک لفظ سے فرمان علی کے لئے نفرت ٹپکتی تھی۔ یہ ایک قابل غور اور اہم نکتہ تھا۔ میں نے اسی نکتے کی روشنی میں نرگس سے سوال کیا۔ "کیا تم چوہدری فرمان علی کو ناپسند کرتی تھیں؟"

"ناپسند؟" اس نے کراہیت انگیز لہجے میں دہرایا۔ "مجھے چوہدری فرمان کے وجود بلکہ اس کے نام سے بھی گھن آتی تھی۔" اس کا لہجہ یک دم حد درجہ ترش ہو گیا اور اس نے نفرت سے ایک

طرف تھوک دیا۔ اس کے انداز سے واضح تھا، اس عمل میں اس نے چوہدری فرمان کے چہرے کو نشانہ بنایا تھا۔

"اس قدر نفرت اور برگشتگی کی وجہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا اور شکستہ لہجے میں بولی۔ "بہت طویل داستان ہے۔"

اس کی طویل داستان سننے میں کوئی مضائقہ تو نہیں تھا لیکن رہ رہ کر مجھے اس کی چوٹوں کا خیال آ رہا تھا۔ ایک دو زخم ایسے بھی تھے کہ اگر فوری طور پر انہیں ٹریٹ نہ کیا جاتا تو انفیکشن کا اندیشہ تھا۔

میں نے اس کی حالت کے پیش نظر کہا۔ "کیا اس گاؤں میں کوئی تجربہ کار ڈاکٹر موجود ہے؟"

وہ میری بات کی تہ میں پہنچ گئی، جلدی سے بولی۔ "گاؤں کے ڈاکٹر اور حکیم کو گولی ماریں۔ اگر آپ کو میری چوٹوں کا ذرا سا بھی احساس ہے تو مجھے کسی طرح مراد پور بھیج دیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ چوٹوں کا کیا ہے، لوٹ پوٹ ہو کر ٹھیک ہو ہی جاؤں گی۔"

مراد پور کے ذکر پر میں چونکا۔ تھوڑی دیر پہلے چوہدری قربان نے نرگس کے کسی حبیب نامی رشتے دار اور مراد پور کا تذکرہ کیا تھا۔ چوہدری قربان کا خیال تھا، نرگس نے اپنے یار حبیب کی مدد سے چوہدری فرمان کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اور اب...... نرگس مراد پور جانے کے لئے مجھ سے درخواست کر رہی تھی۔

"مراد پور میں تمہارا کون رہتا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہاں میرے ماں باپ رہتے ہیں...... میرا میکا ہے ادھر۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"صبح کچھ لوگ ادھر سے یہاں آئے تھے لیکن چوہدری قربان نے بری طرح بے عزت کر کے انہیں یہاں سے نکال دیا۔ اس خبیث نے مجھے اس کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ ان سے ملنے نہیں دیا۔ میری ماں اور بہن بہنوئی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ سخت صدمہ لے کر الٹے قدموں واپس چلے گئے۔ اس حویلی میں میرے لئے اب گنجائش باقی نہیں رہی۔ آپ مجھے مراد پور جانے کی اجازت دیں۔"

نرگس کی اس وضاحت نے میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا کیا۔ تھانے سے احمد نگر آتے ہوئے کوچوان دلو نے بتایا تھا، تھوڑی دیر پہلے اس نے چند سواریوں کو مراد پور سے احمد نگر پہنچایا تھا۔ یقینی طور پر وہ لوگ نرگس کے رشتے دار ہی تھے۔

میرے لئے یہ چنداں مشکل نہیں تھا کہ میں نرگس کو مراد پور پہنچا دیتا لیکن سچی بات یہ تھی کہ اسے فوری طور پر کسی ماہر ڈاکٹر کے پاس یا پھر ہسپتال پہنچنا چاہئے تھا۔ اس کی چند خطرناک چوٹوں کا علاج گھریلو ٹوٹکوں سے ممکن نہیں تھا۔ سرکاری ہسپتال میں اسے رکھنا ایک اور پہلو سے بھی ضروری تھا۔ چوہدری قربان علی کے مطابق، نرگس نے بڑے چوہدری کو قتل کیا تھا۔ چاہے کسی بھی حوالے سے سہی، نرگس پر قتل کا الزام تھا۔ اسے قانون کی نگرانی میں رہنا چاہئے تھا جب

تک اس کی ذات شک سے پاک نہ ہو جاتی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں قانونی تقاضے نبھاتے ہوئے تمہیں سرکاری ہسپتال بھجوا رہا ہوں۔ مراد پور کو فی الحال بھول جاؤ۔ چوہدری فرمان کے چھوٹے بھائی نے تم پر قتل کا الزام لگایا ہے۔ پوچھ گچھ کا سلسلہ ابھی چلے گا۔ پہلے تمہیں طبی امداد ملنا چاہئے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم خاصی تکلیف میں ہو۔ اگر اسی طرح تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے تم نے علاج معالجے میں تاخیر کر دی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

اس نے دانت کچکچائے اور نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''میں بے گناہ تو سرکاری ہسپتال میں قانون کی نگرانی میں رہوں اور وہ شیطان آزادی سے یونہی دندناتا پھرے جس نے مجھے اس حال کو پہنچایا ہے، تھانے دار صاحب! کیا آپ کا قانون اسی قسم کا انصاف کرتا ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے نرگس!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ چوہدری فرمان کے قتل میں تمہارا ہاتھ نہیں تو میں چوہدری قربان کو آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے تمہارے ساتھ جو ناروا برتاؤ کیا ہے، اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔''

''دیکھوں گی میں، آپ ان ظالموں سے کس طرح حساب لیتے ہیں؟''

نرگس نے یہ جملہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''نرگس! میں کسی وقت ہسپتال میں آ کر تمہارا تفصیلی بیان لوں گا۔ تم بے فکر رہو، تمہارے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں ہوگی۔ میں بڑا مختلف قسم کا تھانے دار ہوں۔''

''چلیں جی، آپ کی تھانے داری بھی دیکھ لوں گی۔'' وہ بے یقینی سے بولی۔

میں نے اچانک سوال کیا۔ ''تم کسی حبیب نامی بندے کو جانتی ہو جو مراد پور میں رہتا ہے؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''حبیب میرا پھوپی زاد ہے۔'' پھر اس نے سوال کر دیا۔ ''آپ حبیب کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''صرف پھوپی زاد یا اس کے علاوہ بھی کچھ؟''

میں اس وقت تیز نظر سے نرگس کو گھور رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کو واضح طور پر متغیر ہوتے دیکھا۔ وہ ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ ''کبھی وہ میرا منگیتر بھی تھا۔''

''پھر تمہاری شادی چوہدری فرمان علی سے ہو گئی؟'' میں بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''شادی...... اونہہ!'' اس نے برا سا منہ بنایا پھر اس بناوٹ میں مضروب بدن کی تکلیف بھی شامل ہو گئی۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ ''غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے زور پر اگر کسی کو نکاح کے

لئے مجبور کرنے کا نام شادی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں، ایک سال پہلے چوہدری فرمان نے مجھ سے شادی رچائی تھی۔''

اس کا انداز ذومعنی تھا۔ میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''اس کا مطلب ہے تم نے چوہدری فرمان علی سے شادی نہیں کی تھی؟''

''حقیقت تو یہی ہے......'' جملہ مکمل کرتے ہی اس کے لبوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔

میں نے نرگس کو اسی کمرے میں چھوڑا اور حوالدار کو اپنے پاس بلا لیا۔ چوہدری قربان کسی پخ کی طرح اس کے ساتھ چلا آیا۔ حوالدار شمشاد نے اشاروں کنایوں میں مجھے بتایا کہ چوہدری فرمان کے بیڈ روم سے کوئی اہم اور مفید سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہم ایک مرتبہ پھر بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔ چوہدری قربان نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کیا نرگس نے اقرارِ جرم کر لیا ہے؟''

''وہ زندہ رہے گی تو اقرار کرے گی نا!''

''کیا مطلب جی؟'' وہ اچھل پڑا۔

میں نے تیز نظر سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔ ''چوہدری قربان! تم انسان ہو یا جانور؟ تم نے نرگس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔''

''وہ جی...... غصے میں ہاتھ کچھ زیادہ ہی چل گیا تھا۔'' وہ ندامت سے عاری لہجے میں بولا۔ ''بھائی صاحب کی قاتل پر مجھے بہت طیش آ گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تمہارے اس طیش کے نتیجے میں جان سے بھی جا سکتی تھی۔ ادھ موئی تو وہ ہو چکی ہے۔ بہر حال۔'' میں نے مصلحت کے تقاضے نبھاتے ہوئے کہا۔ ''میں فوری طور پر نرگس کو سرکاری ہسپتال میں شفٹ کر رہا ہوں۔ اس کا بیان اور باقی پوچھ تاچھ وہیں ہوگی۔ تم جلدی سے کسی سواری کا بندوبست کراؤ۔''

میں چوہدری قربان کو بیچ میں لٹکا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اسے نہ تو یہ احساس ہوتا کہ میں نرگس سے کوئی ہمدردی جتا رہا ہوں اور نہ ہی وہ یہ محسوس کر پاتا کہ میں اسے قاتل نہیں سمجھ رہا ہوں۔ وہ میرے حکم کو معمول کی کارروائی سمجھ کر فوراً بیٹھک سے نکل گیا۔

میں نے حوالدار شمشاد سے کہا۔ ''تم نرگس کے ساتھ ہسپتال جاؤ گے۔ اسے فوری طبی امداد چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبل اس کی نگرانی پر مامور کر دو۔ مجھے امید تو نہیں کہ یہ ہسپتال سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی لیکن احتیاط ضروری ہے۔ چوہدری قربان کا الزام اگر چند فی صد بھی درست ہے تو ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔''

''میں اچھی طرح سمجھ گیا ملک صاحب!'' حوالدار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے مزید کہا۔ ''تم ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد تھانے چلے جانا۔ مجھے ابھی اس حویلی

میں رکنا ہوگا۔ چوہدری فرمان کی دوسری دو بیویوں اور گھریلو ملازمین کے بیان قلم بند کرنا ہیں۔''

شمشاد نے مجھے یقین دلایا کہ میں تھانے اور اسپتال کی طرف سے قطعی بے فکر ہو جاؤں۔

تھوڑی دیر بعد چوہدری قربان علی نے ایک تانگے کا انتظام کر دیا۔ وہ اپنے کسی آدمی کو ساتھ بھیجنا چاہتا تھا لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا۔ حوالدار میرا اشارہ پا کر اٹھا اور زخمی نرگس کو تانگے میں سوار کرا کے اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا...... اسی اسپتال کی سمت جہاں کچھ دیر پہلے شیطان صفت چوہدری فرمان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجی گئی تھی۔

حوالدار شمشاد کے جانے کے بعد میری فرمائش پر چوہدری قربان مجھے اپنی بڑی بھابی رشیدہ کے پاس لے گیا۔ رشیدہ کا کمرا، چوہدری فرمان کی خواب گاہ سے مغربی سمت واقع تھا۔ وہاں تک رسائی کے لئے ہم نے فرمان علی کی خواب گاہ کو بیچ نہیں کیا بلکہ قربان علی برآمدے کے راستے مجھے ادھر لے گیا۔ وہ برآمدہ کسی حد تک انگریزی کے حرف یو سے مشابہ تھا جو چوہدری فرمان، اس کی پہلی بیوی رشیدہ اور دوسری بیوی رخسانہ کے کمروں کو کور کرتا تھا۔ ان کے کمروں کا ایک ایک دروازہ اس برآمدے میں کھلتا تھا۔ مجھے رشیدہ کے کمرے میں لے جانے سے قبل قربان نے اسے میرے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ میں نے دروازہ بند نہیں کیا لیکن قربان کو کمرے کے اندر رکنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ وہ بہ حالت مجبوری برا سا منہ بنا کر، دروازے کے باہر موڑھا ڈال کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ وہ ہماری گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکے گا۔

رشیدہ بیگم کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہوگی۔ وہ بھاری جثے کی ایک خاموش طبع عورت تھی۔ یہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ رشیدہ کی بے اولادی کے سبب چوہدری فرمان نے دوسری شادی کی تھی۔ اب وہ کسی عضو معطل کی طرح اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ پتا نہیں، چوہدری اسے اپنے بیڈ روم میں بھی بلاتا تھا یا نہیں!''

میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اظہارِ تعزیت کیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور نہ ہی لبوں سے آہ وزاری پھوٹی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ مجھے نہیں بلکہ میرے پار کسی نادیدہ اور تعجب خیز مخلوق کو دیکھ رہی ہو لیکن میرا یہ احساس اس وقت ختم ہو گیا جب اس نے میرے باقاعدہ سوال کے جواب میں لب کشائی کی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں چوہدری فرمان کو کس نے قتل کیا ہے؟''

وہ دیدے پھیلانے کے بعد دھیمی آواز میں بولی۔ ''تھانے دار جی! میں نے خود چوہدری کو چھت سے لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اس کے کمرے میں گئی تھی۔ میں جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن سب کی دیکھا دیکھی مجھے بھی جانا پڑا۔ کچھ بھی سہی، چوہدری میرا شوہر

تھا۔'' وہ بے ربط باتوں کے درمیان چند لمحات کے لئے خاموش ہو گئی۔ پھر اسی دھیمے پن سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''صاف نظر آ رہا تھا، چوہدری نے گردن میں پھندا ڈال کر خودکشی کی ہے۔ میں نے سنا ہے، آپ نے فرمان علی کی لاش کو چیر پھاڑ کے لئے اسپتال بھجوا دیا ہے؟''

رشیدہ بیگم کے اندازِ گفتگو سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اپنے دل میں چوہدری فرمان کے لئے نیک جذبات نہیں رکھتی تھی۔ نرگس نے بھی کچھ اسی نوعیت کے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ چوہدری فرمان علی حویلی کے اندر اور باہر یکساں طور پر ناپسند کیا جاتا تھا۔

میں نے رشیدہ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ غیر طبعی موت کے سلسلے میں پوسٹ مارٹم ضروری ہو جاتا ہے۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں چودری فرمان نے خودکشی کی ہے لیکن آپ کا دیور تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔''

''قربان پکا بدمعاش ہے۔'' وہ آواز دباتے ہوئے بولی۔ ''وہ کہانی میں نے بھی سنی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس میں کوئی حقیقت نہیں۔''

میں نے غیر ارادی طور پر کھلے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی ایک طرف موڑھے پر قربان علی براجمان تھا۔ مجھے امید تھی کہ ہماری باتیں اس کی سماعت تک نہیں پہنچ رہی تھیں کیونکہ ہم نے احتیاطاً اپنے لہجوں کو دھیما اور محفوظ رکھا تھا۔

میں نے رشیدہ بیگم کو ٹٹولنے والی نگاہ سے دیکھا اور پوچھا۔ ''اگر چوہدری فرمان نے واقعی خودکشی کی ہے تو پھر آپ کا دیور نرگس کو قاتل قرار دینے کے لئے کیوں زور لگا رہا ہے؟ نرگس سے اسے کیا پرخاش ہے؟ اس نے نرگس کو بڑی بے دردی سے مارا بھی ہے۔''

''اس مار پیٹ کی بھی مجھے اطلاع ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں، تھوڑی دیر پہلے آپ نے نرگس کو علاج کی غرض سے اسپتال بجھوا دیا ہے۔'' وہ بدستور اپنے لہجے کو دھیما اور یقینی رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ آپ نے بہت نیک کام کیا ہے۔ بے چاری نرگس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔''

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ رشیدہ بیگم کو دیکھنے لگا۔ وہ بڑھیا جیسی لاتعلق اور گوشہ نشین دکھائی دیتی تھی، حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ اس کی معلومات بڑی کرنٹ تھیں اور یقینی طور پر ان معلومات کا ذریعہ کوئی گھریلو ملازم ہی ہو سکتا تھا۔ رشیدہ بیگم کی ایک اور بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ وہ اپنے رویے سے قربان کے خلاف اور نرگس کے حق میں دکھائی دیتی تھی۔

میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''قربان علی، نرگس سے دشمنی کیوں کر رہا ہے؟ میں نے اس کے منہ سے چند نازیبا باتیں بھی سنی ہیں۔ وہ نرگس پر بڑا گھناؤنا الزام لگا رہا تھا۔''

''اس نے حبیب کا ذکر کیا ہوگا!'' رشیدہ نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

بڑی بی بہت پہنچی ہوئی ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ پُرمعنی انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”نرگس بڑی بے بس اور بے کس عورت ہے۔ مجھے اس بے چاری پر بڑا ترس آتا تھا لیکن فرمان کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی تھی لہٰذا میں بھی خاموش رہتی تھی مگر میرا دل نرگس کے لئے کڑھتا رہتا تھا۔ اس حویلی میں اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا رہا ہے۔“ پھر چند لمحے توقف کرنے کے بعد وہ درخواست آمیز لہجے میں بولی۔ ”فرمان علی تو اب باقی نہیں رہا لیکن قربان جیسا موذی ابھی زندہ ہے۔ تھانے دار پتر! ذرا سوچ سمجھ کر اس کیس کو حل کرنا۔ کہیں نرگس بے گناہ ہی نہ ماری جائے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ نرگس کو بے قصور سمجھتی ہیں اور آپ کو یہ بھی یقین ہے، چوہدری نے خودکشی کی ہے۔ چوہدری قربان نرگس پر قتل کا جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔“ میں چند لمحات تک خاموش رہ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ نرگس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو تو پھر آپ کھل کر مجھے بتائیں...... چوہدری کی خودکشی کا سبب کیا ہے؟ چھوٹا چوہدری کیوں نرگس کا دشمن بنا ہوا ہے؟ نرگس اس سارے قصے میں بے چاری کیوں ہے؟“

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”تھانے دار جی! اونچی دیواروں والی اس حویلی میں بڑی پیچی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ چوہدری فرمان بہت ہی ظالم اور جابر شخص تھا۔ کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن اب وہ اس حویلی بلکہ اس دنیا میں نہیں رہا اس لئے اس کے خلاف سچ بیان کیا جا سکتا ہے۔“

میں خاموش بیٹھا بڑی توجہ سے اسے سنتا رہا۔ وہ تھوڑے توقف کے بعد گویا ہوئی۔ ”برسوں پہلے میں بیاہ کر اس حویلی میں آئی تھی۔ اس وقت بڑے چوہدری صاحب زندہ تھے۔ میں فرمان کے باپ کی بات کر رہی ہوں۔ چوہدری سلطان یعنی میرا سسر قدرے معقول آدمی تھا۔ فرمان نے اپنے بیٹے کا نام دادا کے نام پر رکھا ہے۔“ وہ ذرا متوقف ہوئی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔ ”جب کئی برس گزر جانے کے بعد بھی میری گود ہری نہ ہوئی تو چوہدری فرمان نے دوسری شادی کے لئے پَر تولنا شروع کر دیئے۔ میں اس کی ضد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اس لئے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔ چنانچہ چوہدری نے رخسانہ سے شادی کر لی۔ اس واقعے سے میرے دل پر جو بیتی اس کا احوال جاننے کے لئے چوہدری کے پاس وقت تھا نہ کسی اور کے پاس فرصت! بہرحال......“ وہ چند ثانئے چپ رہنے کے بعد دوبارہ کہنے لگی۔ ”رخسانہ کے بطن سے چوہدری کے دو اولادیں سلطان اور فرزانہ پیدا ہوئیں۔ اب ماشاءاللہ سلطان تو جوان ہو چکا ہے۔ فرزانہ بھی آٹھ سال کی تھی۔ بیٹا بیٹی کے ہوتے ہوئے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا، چوہدری تیسری شادی کا ارادہ باندھے گا لیکن وہ اس کام میں کود پڑا اور نرگس سے

زبردستی نکاح کر کے اسے حویلی میں ڈال دیا۔ نرگس بے چاری نے اپنے دل سے اس شادی کو قبول نہیں کیا اور وہ اس بلند و بالا حویلی کے اندر ہر روز مرتی تھی اور ہر روز جیتی تھی۔ یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے تھانے دار صاحب؟“

بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”نرگس سے زبردستی شادی رچانے کی کیا کہانی ہے؟“

اس نے ایک طویل سانس خارج کی، معنی خیز انداز میں کھلے ہوئے دروازے کی جانب دیکھا پھر اپنی آواز کو دھیما رکھتے ہوئے بولی۔ ”وہ منحوس باہر بیٹھا ہے۔“ اس کا اشارہ چھوٹے قربان علی کی طرف تھا۔ ”اس لئے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ آپ نرگس سے پوری کہانی سن لینا۔ مختصر طور پر بتاتی ہوں...... نرگس کے حُسن اور خوبصورتی پر چوہدری مرمٹا تھا۔ اس نے نرگس کو اپنی راہ پر لانے کی کوشش کی لیکن خلافِ توقع نرگس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چوہدری کو خوب کھری کھری سنائیں۔ چوہدری جیسے جابر شخص کے لئے یہ کسی بے عزتی سے کم نہیں تھا۔ ایک معمولی سی لڑکی نے اس کے سامنے زبان چلائی تھی۔ اس رسوائی کا بدلہ لینے کے لئے چوہدری نے چند روز بعد نرگس کو اغوا کروا لیا پھر اس کے والدین کو بھی وہیں بلا لیا اور بندوقوں کے سائے میں چوہدری کے ایما پر نرگس کا نکاح اس سے پڑھوا دیا گیا۔ چوہدری نے نرگس کو اس کے ماں باپ کے حوالے سے اتنی سنگین دھمکی دی تھی کہ وہ مجبور ہو گئی...... اور لگ بھگ ایک سال سے وہ اس حویلی میں مجبوری کی زندگی گزار رہی ہے...... بلکہ تھی! اب تو مجبور کرنے والا جابر باقی نہیں رہا۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ رشیدہ بیگم نے نرگس کے لئے معمولی لڑکی کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے چوہدری قربان علی اسے نیچ ذات سے تعبیر کر چکا تھا اس حوالے سے میں نے اس سے سوال کیا تو اس نے بتایا۔ ”نرگس ایک انتہائی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا باپ شوکت حسین مراد پور کا جولاہا ہے۔ کنول کیچڑ میں اور گلاب کانٹوں میں کھلتا ہے۔ قدرت نے اگر نرگس کو بے حد حسین و جمیل بنایا ہے تو اس میں بے چاری کا کیا قصور ہے۔ وہ اپنے خاندانی پس منظر سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے!“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”میں نے اگرچہ نرگس کو بڑی کسمپرسی کی حالت میں دیکھا ہے لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، اس کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں۔“

وہ خاموشی سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ چھوٹا قربان علی کیوں ہاتھ دھو کر نرگس کے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ وہ اسے فرمان علی کی قاتل ثابت کرنے کے لئے پورا زور مار رہا ہے۔“

”یہ اپنے بھائی سے کچھ کم نہیں۔“ وہ نفرت زدہ نظر سے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے

بولی۔ ”اپنے خاندان کی اُونچ نامی کا اسے بڑا خیال ہے۔ یہ کسی بھی طور پر نرگس کو حویلی میں لانے کے حق میں نہیں تھا۔ ٹاٹ میں مخمل اور مخمل میں ٹاٹ کے پیوند کی باتیں کر رہا تھا۔ لیکن بڑے بھائی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ پھر نرگس کے یہاں آتے ہی ان دونوں میں سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ وہ فرمان علی کو اپنا شوہر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی اور گاہے بہ گاہے اپنی نفرت کا اظہار بھی کرتی رہتی تھی۔ جواب میں قربان علی اسے ”موری کی اینٹ کی چوبارے میں چنائی“ کے طعنے دیتا رہتا۔ الغرض ان دونوں میں خدا واسطے کا بیر تھا۔“

رشیدہ نے اپنے تئیں بھرپور وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میری تسلی نہ ہوسکی۔ یا تو رشیدہ بیگم نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی یا پھر وہ بھی بہت سی باتوں سے بے خبر تھی۔ بہرحال میں نے اس حوالے سے اسے زیادہ کریدنا ضروری نہ سمجھا اور چوہدری فرمان علی کو فوکس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اب ذرا چوہدری کی خودکشی کا سبب بھی بتا دیں۔ آپ کا دعویٰ ہے، چوہدری کو قتل نہیں کیا گیا بلکہ اس نے اپنے ہاتھوں خود کو موت کے حوالے کیا ہے؟“

”کیا آپ نے اسے چھت سے لٹکے ہوئے نہیں دیکھا؟“

”دیکھا ہے۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ ”اگر آپ نے دیکھا ہے تو نرگس جیسی دھان پان عورت کو بھی بہ غور دیکھا ہوگا۔ کیا نرگس کے لئے یہ ممکن ہے، وہ چوہدری کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے چھت سے ٹانگ دے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ یہ اتنا آسان کام تو نہیں تھانے دار صاحب!“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اگر واقعی نرگس نے یہ کام کیا ہوتا تو میرا خیال ہے، وہ بڑے فخر سے اپنے کارنامے کا اقرار کرلیتی۔“

”آپ کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ یہ قتل نرگس نے نہیں کیا بلکہ چوہدری فرمان علی نے خودکشی کی ہے۔“ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ”لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ چوہدری فرمان جیسے بااختیار آدمی کو اچانک خودکشی کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔

میں نے پُراصرار لہجے میں کہا۔ ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تھانے دار صاحب! میرے خیال میں فرمان علی نے اچانک خودکشی نہیں کی بلکہ وہ یہ کام قسطوں میں کر رہا تھا۔ چھت سے لٹکنا تو اس زنجیر کی آخری کڑی ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں!“ میں نے متعجب لہجے میں کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”تھانے دار صاحب! اگر آپ خریداری کے لئے کسی بڑی

دکان پر جائیں اور وہاں کوئی انتہائی حسین اور خوش نما شے آپ کو پسند آجائے اور آپ اسے پیک کروالیں پھر جب ادائیگی کا وقت آئے تو جیب میں ہاتھ ڈالنے پر آپ کو پتا چلے کہ آپ کے تو پلّے ہی کچھ نہیں۔ تصور کریں، اس موقع پر آپ کو کتنی شرمندگی ہوگی؟“

میں حیران و پریشان اس تجربہ کار بڑھیا کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری بھی نرگس جیسی حسین اور جوان لڑکی کو اٹھا کر حویلی میں لے آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس کا پلّا تو خالی ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ہر رات وہ ندامت کا سامنا کرتا رہا اور آخر کار اس نے اس روز روز کی خفت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خودکشی کر لی۔ آپ میری بات تو سمجھ رہے ہیں؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”کسی شوہر کے بارے میں اس کی بیوی کا بیان بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ میں آپ کی بات کو رد نہیں کرسکتا لیکن......“

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔ ”تھانے دار صاحب! میں تو چوہدری فرمان کی صرف نام کی بیوی بن کر رہ گئی تھی۔ رخسانہ سے شادی کے بعد وہ کچھ عرصے تک مجھ پر مہربان رہا پھر رفتہ رفتہ اس کی پوری توجہ رخسانہ پر مرکوز ہوگئی۔ میں نے چوہدری کی جس خامی کا ذکر کیا ہے وہ تو ایک سال پہلے مجھے رخسانہ نے بتائی تھی جب چوہدری نے زبردستی نرگس سے شادی رچائی تھی۔ رخسانہ کی بات سن کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ نرگس کے ساتھ زیادتی در زیادتی ہو رہی ہے۔“

میں نے تعجب خیز نظر سے رشیدہ بیگم کو دیکھا اور کہا۔ ”آپ کا اور رخسانہ کا دعویٰ اپنی جگہ لیکن چوہدری نے جانتے بوجھتے اتنا بڑا اقدام کیوں اٹھایا کہ اُسے کسی قسم کی ندامت کا سامنا کرنا پڑے؟“

”ہوس اور حرص کی ابتدا تو ہوتی ہے لیکن انتہا کوئی نہیں ہوتی تھانے دار صاحب!“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ”چوہدری فرمان علی بلا کا حریص اور ہوس پرست تھا۔ اس نے کسی قسم کے سنگین نتائج کی پروا کئے بغیر نرگس سے زبردستی شادی رچا کر اسے حویلی میں ڈال لیا تھا۔“

رشیدہ بیگم سے ہونے والی گفتگو میں روانی اور تسلسل نہیں تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ کمزور اور نقیہ تھی۔ رک رک کر بولتی اور تھک کر خاموش ہو جاتی۔ پچپن سال اتنی بھی زیادہ عمر نہیں ہوتی لیکن چوہدری کے ناروا سلوک اور ازدواجی بے توجہی نے وقت سے پہلے اسے ضعیف اور ناتواں بنا دیا تھا۔ وہ کسی عضو معطل کی طرح حویلی کے ایک کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ اس کی صحت اور ظاہری حالت سے مجھے لگا کہ اگر وہ کچھ عرصہ مزید اسی کیفیت میں رہی تو بہت جلد جنت مکانی ہو جائے گی۔ میں اس کی بے ربط اور شکستہ باتوں کو ایک ترتیب سے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں تا کہ آپ کو کسی ذہنی الجھن کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

رشیدہ کے پاس سے اٹھنے سے قبل میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ حبیب نامی بندے کا کیا قصہ

ہے؟ چوہدری قربان علی کا دعویٰ ہے نرگس نے حبیب کی مدد سے چوہدری فرمان کو قتل کیا ہے۔"

"وہ بکواس کرتا ہے۔" اس نے ناپسندیدہ نظر سے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا اور بولی۔

"حبیب بے چارہ بہت ہی سیدھا سادہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہے۔ وہ رشتے میں نرگس کا پھوپی زاد ہے۔ نرگس کا باپ حبیب کا ماموں لگتا ہے۔ نرگس اور حبیب کی منگنی ہو چکی تھی مگر چوہدری فرمان نے شب خون مارا اور نرگس کو زبردستی اغوا کر کے اس سے شادی کر لی۔ ظاہر ہے حبیب، چوہدری فرمان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لہٰذا زہر کا گھونٹ اور خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔ حبیب کے حوالے سے نرگس کو قتل کے کیس میں ملوث کرنا چھوٹے چوہدری کے سازشی ذہن کا کارنامہ ہے ورنہ حبیب اس حویلی میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ قتل وتل تو بہت دور کی بات ہے تھانے دار صاحب، آپ مراد پور جائیں تو حبیب سے ضرور ملیں۔ آپ کو میری بات کا یقین آ جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد میں چوہدری فرمان کی دوسری بیوی یعنی رخسانہ کے پاس بیٹھا اظہار تعزیت کر رہا تھا۔ چوہدری فرمان چاہے جیسا بھی تھا لیکن اس کی موت پر لواحقین سے ہمدردی کا اظہار کرنا میرا فرض تھا۔ رخسانہ کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہوگی۔ وہ اچھی شکل وصورت کی مالک تھی اور شوہر کے زیاں پر کافی افسردہ دکھائی دیتی تھی۔ چوہدری کی موت کے حوالے سے اس سے کوئی مفید بات معلوم نہ ہو سکی۔ اس نے نہ تو نرگس کو قاتل ٹھہرایا اور نہ ہی چوہدری کی خودکشی پر زور دیا۔ قربان علی کے بارے میں بھی اس نے کھل کر کوئی بات نہ کی۔ وہ خاصی سنجیدہ اور محتاط نظر آتی تھی۔

میں نے رخسانہ کا سرسری بیان نوٹ کیا، پھر ایک خاص زاویے سے رشیدہ بیگم کے انکشاف کی تصدیق چاہی تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"آپ کو کس نے بتائی ہے یہ بات؟" اس کے سوال میں بے حد بے تابی تھی۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "رشیدہ بیگم نے...... اور اس کو بھی آپ ہی نے بتایا تھا۔ نرگس سے شادی کے موقع پر آپ دونوں میں اس موضوع پر تفصیلی بات ہوئی تھی؟"

وہ گردن جھکا کر خاموش ہو گئی۔

"میں آپ کی خاموشی کو تصدیق سمجھوں؟"

"جی، حقیقت تو یہی ہے۔" وہ نحیف آواز میں بولی۔

"اس کا مطلب ہے، آپ رشیدہ کے خیالات سے متفق ہیں؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ "رشیدہ کے کون سے خیالات؟"

"یہی کہ چوہدری فرمان نے مسلسل ندامت سے تنگ آ کر خودکشی کر لی؟"

"جی...... میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ گڑبڑا گئی۔

میں نے سادگی سے کہا۔ "اپنی رائے دے سکتی ہیں۔"

"جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے چوہدری صاحب کی خودکشی پر یقین نہیں آ رہا۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔

"یقین نہ آنے کی کوئی تو وجہ ہوگی؟" میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

ہمارے درمیان بڑے نارمل انداز میں بات چیت ہو رہی تھی۔ ہمیں سرگوشیوں اور احتیاط کا سہارا نہیں لینا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ چوہدری قربان مجھے رخسانہ کے پاس پہنچا کر خود وہاں سے ہٹ گیا تھا جب کہ رشیدہ کی باری پر وہ دروازے کے باہر موڑھا ڈالے بیٹھا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ رشیدہ کی بہ نسبت رخسانہ کو قابل بھروسہ سمجھتا تھا۔ یہی صورت رخسانہ کے رویے سے بھی جھلکتی تھی۔ رشیدہ کے برخلاف اس نے ابھی تک قربان کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔

وہ میرے سوال کے جواب میں کہنے لگی۔ "اول تو یہ کہ چوہدری صاحب کوئی بزدل یا کمزور انسان نہیں تھے کہ خودکشی کے سوا انہیں کوئی رستہ نظر نہ آتا۔ نرگس سے شادی سے قبل وہ اپنے نقص سے واقف تھے۔ اگر انہیں ایسی ہی تشویش ہوتی تو وہ ہرگز تیسری شادی نہ کرتے۔" وہ ذرا دیر کے لئے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں مانتی ہوں کہ نرگس سے انہوں نے زبردستی شادی کی تھی۔ اس میں نرگس کی مرضی شامل نہیں تھی اس لئے وہ ان سے اکھڑی اکھڑی اور بیزار رہتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ اپنی نفرت کا برملا اظہار بھی کر دیتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چوہدری صاحب اس سے دبنے لگیں اور اپنی کسی خامی کے باعث مجبور ہو کر خودکشی کر لیں۔ میں چوہدری فرمان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اگر اس حوالے سے نرگس نے انہیں کچھ طعنہ دیا ہوتا تو وہ اپنی جان ختم کرنے کے بجائے نرگس کو زندہ گاڑ دیتے!"

میں بڑی گہری نظر سے رخسانہ کے چہرے کے تاثرات نوٹ کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ چوہدری فرمان علی کے لئے اپنے دل میں ہمدردی اور حمایت کے جذبات رکھتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چوہدری اس کے دو بچوں کا باپ تھا۔ بچوں والی بیوی ویسے بھی بھاری ہوتی ہے۔ شوہر کی نظر میں اس کی قدر وقیمت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ رخسانہ، رشیدہ پر سوتن آئی تھی اور نرگس رخسانہ پر۔ نرگس اور رشیدہ کے دل میں چوہدری کے لئے نفرت ہی نفرت تھی جب کہ رخسانہ اس سلسلے میں اپنے سینے کے اندر نرم گوشہ رکھتی تھی۔ نرگس کی نفرت، ناپسندیدگی اور بیزاری تو سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ چوہدری نے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی اغوا کے بعد اس سے شادی کی تھی۔ عورت اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول سکتی ہے مگر وہ اپنے پندار کو لگنے والی ٹھیس کو کبھی فراموش نہیں کرتی۔ چوہدری فرمان علی نے نرگس کے ماں باپ کو بندوقوں کے نشانوں پر رکھ کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اپنے والدین کی زندگی کے لئے چوہدری سے

نکاح پر آمادہ ہوگئی تاہم اس مرحلے سے گزرتے ہوئے اس کا دل خون ہوگیا تھا۔ دل سے اس نے کبھی چوہدری فرمان کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کے معصوم دل میں تو چوہدری نے اپنی ہوس کے خونی پنجے گاڑ رکھے تھے۔

رشیدہ بیگم کی مخالفت کا سبب یہی نظر آتا تھا کہ چوہدری نے دوسری شادی کے بعد اسے بالکل ہی نظرانداز کر دیا تھا اور پھر تیسری شادی کے بعد تو وہ کسی گنتی شمار میں نہ رہی۔ وہ اپنے کمرے میں اس طرح پڑی رہتی جیسے بے کار اور ناقابلِ استعمال سامان اسٹور میں پھینک دیا جاتا ہے۔

تینوں بیویوں کا یہ تقابلی جائزہ چند لمحات میں میرے دماغ کے اسکرین پر ابھر کر غروب ہوگیا تو میں رخسانہ کے الفاظ پر غور کرنے لگا۔ چوہدری فرمان علی کی فطرت کے بارے میں اس نے قریب الحقائق بات کی تھی۔ فرمان علی جیسے ظالم و جابر چوہدری اپنے خلاف کھلنے والی ہزاروں لاکھوں زبانوں کو گدیوں سے کھنچوا سکتے ہیں۔ رخسانہ کی بات میں وزن تھا لہٰذا میں نے اس کے نکتے کو ذہن کے ایک نمایاں گوشے میں سجالیا اور رخسانہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کے خیال کے مطابق اگر چوہدری فرمان نے خودکشی نہیں کی تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ اسے قتل کیا گیا ہے؟“

”میں اس سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میں نے چوہدری صاحب کو قتل ہوتے دیکھا ہے اور نہ ہی خودکشی کرتے ہوئے۔ میں نے جو محسوس کیا، وہ آپ کو بتا دیا۔“

اس کا انداز بہت ڈپلومیٹک تھا۔ یا تو وہ تھی ہی اتنی سادہ یا پھر وہ بہت بڑی فنکار تھی۔ میں نے اسے گھنے کی خاطر کہا۔

”رشیدہ بیگم نے اپنے بیان میں مجھے بتایا ہے کہ چوہدری فرمان نے خودکشی کی ہے اور یہ کہ نرگس پر قتل کا الزام بالکل جھوٹا اور بے بنیاد ہے۔“

”کیا رشیدہ نے چوہدری صاحب کو پھانسی لگتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟“ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ”بالکل نہیں!“ پھر اضافہ کیا۔ ”اسی طرح چوہدری قربان کا دعویٰ ہے کہ فرمان علی نے خودکشی نہیں کی بلکہ نرگس نے اپنے یار حبیب کی مدد سے اسے قتل کر کے چھت سے لٹکایا ہے۔ حالانکہ اس نے نرگس یا حبیب کو یہ کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا!“

وہ میری بات کی گہرائی میں پہنچتے ہوئے بولی۔ ”آپ تھانے دار ہیں۔ اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا آپ کا کام ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتی ہوں!“

”میں تو ہر الجھن کو سلجھن میں بدل ہی لوں گا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ حبیب کے بارے میں کیا کہتی ہیں؟“

”میں اس بندے کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”سنا ہے وہ نرگس کا منگیتر تھا اور اس کا کوئی قریبی رشتے دار بھی ہے۔“

”کیا وہ کبھی اس حویلی میں بھی آچکا ہے؟“

”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”گزشتہ روز اسے حویلی کے آس پاس کہیں دیکھا گیا ہو؟“

”میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں حویلی سے باہر نہیں جاتی ہوں۔“

”میں نے یہ سوال اس لئے کیا ہے کہ قربان علی، حبیب کو نرگس کا شریکِ جرم قرار دے رہا ہے۔“

”تو پھر آپ یہ سوال قربان ہی سے کریں۔“ وہ اُکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں نے آج تک اس شخص کی شکل نہیں دیکھی اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی دلچسپی ہے۔“

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”میں نے جائے وقوعہ کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ لیا ہے اور تین دروازوں کی حقیقت کے بارے میں بھی مجھے بتایا گیا ہے۔ چوہدری فرمان کی مرضی کے بغیر کوئی بیوی اس کی خواب گاہ میں داخل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ وہ تمام دروازوں کو اندر سے مقفل رکھتا تھا۔ کیا یہ بات بالکل درست ہے؟“

”آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”رشیدہ بیگم کی زبانی مجھے پتا چلا ہے، وہ کئی برسوں سے چوہدری کی تنہائی میں نہیں گئی تھی۔ آپ سے شادی کے کچھ عرصے بعد فرمان علی نے اسے فراموش کر دیا تھا اور اس کی ساری توجہ آپ ہی پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی؟“

”یہ بات ایک حد تک درست ہے۔ لیکن اس میں رشیدہ کی خراب صحت کا بھی ہاتھ تھا۔“ رخسانہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ بہت زود حس اور جذباتی عورت ہے۔ چوہدری صاحب کی مجھ سے شادی کو وہ برداشت نہ کر سکی اور کچھ ہی عرصے بعد بیمار پڑ گئی۔ پھر اس کی بیماری بلکہ بیماریاں رفتہ رفتہ بڑھنے لگیں اور اب وہ بیماریوں کا کارخانہ بن چکی ہے۔ آپ نے اس کی حالت تو دیکھی ہی ہوگی کوئی شوہر اس صحت کی بیوی کو اپنے تخلئے میں کیوں بلائے گا۔“

اس کی بات شوہروں کی نفسیات اور فطرت کے لحاظ سے بالکل درست تھی۔ ہر شوہر کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی بنی سنوری اور خوش لباس ہو جو خلوتی لمحات کو اپنے ناز و ادا سے مہکا کر رکھ دے۔ اپنی تیزی اور تندی سے وہ اسے بے سمت بہالے جائے۔ اسے اس سے جدا کر کے اپنا بنالے۔ ایک عمر رسیدہ اور بیمار بیوی یہ تقاضے پورے نہیں کر سکتی لہٰذا لامحالہ شوہر اس کی طرف سے بے اعتنا ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر شوہر کو ایک جوان اور مستعد بیوی بھی میسر ہو تو اس بے اعتنائی میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ خوبی یا خرابی سے قطع نظر یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے!

میں نے رخسانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا نرگس کے آنے کے بعد چوہدری فرمان کا رویہ پہلے والا ہی رہا یا اس میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی؟''

''تبدیلی تو آئی تھی لیکن اتنی نہیں جتنی رشیدہ کے معاملے میں نظر آتی ہے۔''

''شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آپ نے چوہدری فرمان کو صاحب اولاد بنایا ہے!''

''یہ بات تو ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''چوہدری صاحب اولاد کی وجہ سے مجھے بہت سی رعایتیں دیتے تھے اور ہر طرح سے میرا خیال رکھتے تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے، نرگس سے شادی کے بعد وہ مجھ پر بہت کم توجہ دینے لگے تھے۔ بعض اوقات تو ہفتوں گزر جاتے، ہمیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔ ''آخری مرتبہ آپ کب چوہدری فرمان کی تنہائی میں گئی تھیں؟''

''لگ بھگ ایک ماہ پہلے!'' وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

میں نے مزید دو چار ضمنی سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا۔

اس کے بعد میں ایک مرتبہ پھر حویلی کی بیٹھک میں آ گیا اور چھوٹے چوہدری قربان سے کہا۔ ''تم حویلی میں کام کرنے والے ملازموں کو باری باری میرے پاس لے آؤ۔ ان کے بیان بھی ہوں گے۔''

یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ اس حویلی میں کل چھ ملازم کام کرتے تھے۔ دو مرد اور چار عورتیں۔ مردوں میں منظور نامی ایک بندہ موضع قلعہ واسو سنگھ گیا ہوا تھا اور دوسرا یعنی مطلوب حویلی کے صدر دروازے پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔ عورتوں میں سلمیٰ نامی ایک ملازمہ آج غیر حاضر تھی۔ مذکورہ ملازمہ کی ڈیوٹی نرگس کے ساتھ تھی۔ باقی تین میں سے دو یعنی شریفاں اور منیرہ رخسانہ کی خدمات انجام دیتی تھیں اور چوتھی نگو نامی ملازمہ، رشیدہ بیگم کا خیال رکھنے پر مامور تھی۔ مرد ملازمین کی رہائش حویلی ہی میں تھی جبکہ عورتیں عموماً رات کو واپس چلی جاتی تھیں یا پھر جس کی ضرورت ہو، اسے روک لیا جاتا تھا۔ رشیدہ بیگم اپنی صحت اور بیماری کے پیش نظر اکثر نگو کو اپنے پاس روک لیتی تھی۔ کبھی کبھار رخسانہ بھی دو میں سے کسی ایک کو رکنے کے لئے کہہ دیتی۔ البتہ نرگس نے اپنی خادمہ سلمیٰ کو کبھی نہیں روکا تھا۔

جاگیروں اور حویلیوں میں عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔ دسیوں ملازم چوبیس گھنٹے چوہدریوں اور وڈیروں کی خدمت کے لئے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تعداد درجنوں تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن موضع احمد نگر کے چوہدری فرمان علی کا دستور نرالا تھا۔ اس حویلی کے اندر جو کچھ ہو رہا تھا، وہ چاہے معمول سے کتنا بھی ہٹ کر کیوں نہ ہو، چوہدری کے منشا کے مطابق ہو رہا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''پہلے کس کو لاؤں جناب؟''

''جس کو بھی لے آؤ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کام میں تاخیر نہ کرنا۔ مجھے واپس بھی جانا ہے۔''

وہ ایک مرتبہ پھر میری خاطر تواضع کے لئے زور مارنے لگا۔ ''تھانے دار صاحب! کھانے کا وقت ہے۔ اگر آپ مجھے تھوڑی سی خدمت کا موقع دیں تو نوازش ہوگی جناب کی۔''

''یہ موقع میں تمہیں پھر کبھی دے دوں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''فی الحال کھانے سے زیادہ ضروری کام میرے سامنے ہے۔ تم جلدی سے وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''

وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بیٹھک سے نکل گیا۔

چوہدری قربان کا کہنا بالکل بجا تھا۔ نہ صرف وہ کھانے کا انتہائی موزوں وقت تھا بلکہ مجھے ٹھیک ٹھاک بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی پیش کش پر غور کر سکتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں، ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن میں ایسا خیال نہیں آیا۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر حویلی سے نکل جاؤں۔

میں نے باری باری تینوں ملازماؤں کے انٹرویوز کر ڈالے لیکن کوئی بھی اہم، مفید کار آمد نکتہ ہاتھ نہ آیا۔ وہ تینوں گزشتہ رات حویلی سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلی گئی تھیں۔ نگو نے مجھے بتایا کہ سلمیٰ بھی حویلی میں رکی نہیں تھی لیکن آج اس کی غیر حاضری مجھے الجھا رہی تھی۔ میں نے نگو سے سلمیٰ کے گھر کا پتا معلوم کر لیا۔ سلمیٰ موضع احمد نگر ہی میں رہتی تھی۔

جب وہ تینوں نمٹ چکیں تو چوہدری فرمان، مطلوب حسین نامی بندے کو میرے پاس لے آیا۔ مطلوب کی عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور ایک آنکھ میں کچھ نقص بھی موجود تھا جس کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا، وہ آپ کو دیکھ رہا ہے یا آپ کے برابر میں بیٹھے کسی شخص کو۔ اس کا قد میانہ اور جسم خاصا مضبوط تھا۔ قربان اسے میرے سامنے حاضر کرنے کے بعد خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

میں نے چھوٹے چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں مطلوب سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ میری بات سنتے ہی بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ میں چند لمحے گہری نظر سے مطلوب کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ میری اس تفتیشی تاک سے وہ قدرے نروس نظر آنے لگا۔ جب میں نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''تھانے دار صاحب! آپ مجھ سے کس قسم کی پوچھ پڑتال کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلی مرتبہ اس حویلی میں آیا ہوں اور مجھے یقین ہے، تم سے میری یہ پہلی ملاقات ہے۔ کیا تم جانتے ہو، میں اس وقت حویلی میں کس نوعیت کی تفتیش کر رہا ہوں؟''

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ بڑے چوہدری صاحب کی موت کے بارے

میں تفتیش کر رہے ہیں۔"

مطلوب نے خودکشی یا قتل کی بجائے لفظ "موت" استعمال کیا تھا جس سے اندازہ ہوا، وہ خاصا سمجھ دار آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات کے اختتام میں کہا۔

"مطلوب حسین! بس تو پھر سمجھ لو، میں تم سے چوہدری فرمان علی کی موت کے بارے میں چند سوالات کروں گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے، چوہدری نے خودکشی کی ہے اور بعض کہتے ہیں، اسے قتل کیا گیا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے خود چوہدری صاحب کو چھت سے لٹکے ہوئے دیکھا ہے جس سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے، انہوں نے خودکشی کی ہے۔ اب اگر کسی نے انہیں مارنے کے بعد پھانسی کے انداز میں چھت سے ٹانگ دیا ہو تو الگ بات ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو یہی محسوس کرتا ہوں، انہوں نے خودکشی کی ہے۔ اللہ بخشے، چوہدری صاحب کے بغیر یہ حویلی یتیم ہو کر رہ گئی ہے۔"

مطلوب حسین کے ان چند جملوں سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے چوہدری کی موت سے دکھ پہنچا تھا اور یہ کہ وہ اسے خودکشی کا ایک واقعہ سمجھ رہا تھا۔ اس کی رائے کم و بیش چوہدری کی بڑی بیگم رشیدہ سے ملتی جلتی تھی۔

بات کے اختتام پر مطلوب نے گردن جھکا لی اور افسوس ناک انداز میں سر جھٹکنے لگا۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "مطلوب حسین! چھوٹے چوہدری قربان کا دعویٰ ہے، نرگس نے اپنے کسی معاون کی مدد سے چوہدری فرمان کو موت کے گھاٹ اتار کر چھت سے لٹکایا ہے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"میں اپنے خیالات سے آپ کو آگاہ کر چکا ہوں جناب۔"

"میں نے نرگس کے معاون کے بارے میں پوچھا ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "قربان علی کا خیال ہے، نرگس کا سابق منگیتر حبیب اس واردات میں ملوث ہے۔ تم حبیب کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں......" وہ نفی میں سر ہلانے کے بعد دوسری طرف دیکھنے لگا۔ "میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں، صرف نام ہی نام سنا ہے یا اتنا پتا ہے، وہ کبھی چھوٹی بیگم صاحبہ کا منگیتر تھا۔"

"تم اس بات سے تو انکار نہیں کرو گے کہ چوہدری فرمان نے زبردستی نرگس سے شادی کی تھی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ محتاط نظر سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

شروع ہی سے مطلوب کا انداز مجھے شک میں ڈال رہا تھا۔ وہ قدرے سہما ہوا ہونے کے ساتھ خاصا گڑبڑایا ہوا بھی تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔

"تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے مطلوب حسین!"

"مسئلہ!" وہ گھبرائی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں جناب۔"

میں نے زور دے کر کہا۔ "کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہے۔ تم مجھے نارمل نظر نہیں آ رہے!"

اس دوران میں، میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "جج...... جناب...... بات دراصل یہ ہے...... کہ چھوٹے چوہدری صاحب کی وجہ سے میں خوفزدہ ہوں۔" وہ ایک مرتبہ پھر بیٹھک کے دروازے کو دیکھنے لگا جیسے اسے خدشہ ہو، قربان یہیں کہیں آس پاس موجود ہے جو فوراً آ کر اس کی گردن دبوچ لے گا۔

میں نے استفسار کیا۔ "تم قربان سے خوف زدہ کیوں ہو؟"

وہ متاملانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری قربان اس واقعے کو قتل کا رنگ دینا چاہتے ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں اسے خودکشی سمجھتا ہوں تو وہ میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ میں آپ سے بھی منت کرتا ہوں، آپ چھوٹے چوہدری صاحب کو کچھ نہ بتائیں۔ ورنہ خواہ مخواہ مجھ غریب کی شامت آ جائے گی۔"

اس وضاحت کے بعد اس کی بوکھلاہٹ اور پریشانی میری سمجھ میں آ گئی۔ چوہدری فرمان اور قربان جیسے سفاک لوگوں سے ہر کوئی ڈرتا ہے اور گھریلو ملازم تو خاص طور پر بہت سہمے رہتے ہیں۔ میں نے قدرے مہربان نظر سے مطلوب کو دیکھا اور تسلی بخش لہجے میں کہا۔

"تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو چھوٹے چوہدری تک نہیں پہنچے گی۔ تم ہر بات وضاحت سے بیان کر سکتے ہو۔"

وہ قدرے مطمئن اور پُرسکون دکھائی دینے لگا۔ کن انکھیوں سے بیٹھک کے دروازے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہے جی!"

مطلوب حسین کی سوچ اور خیالات چوہدری قربان کی مخالفت میں محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے گھیرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے نظر آنے لگا تھا، اس سے کوئی مفید بات معلوم ہو سکتی تھی۔

"مطلوب حسین!" میں نے بڑی نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو، چھوٹا چوہدری نرگس کو قتل کے چکر میں ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ورنہ یہ تو سیدھا سادہ خودکشی کا کیس نظر آ رہا ہے!"

آخری جملہ میں نے اس کے خیالات کی ترجمانی کے طور پر کہا تھا۔ وہ سوالیہ نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سا اضطراب ہلکورے لیتا محسوس کیا۔ اس کی اس کیفیت کو میں نے چوہدری کے ڈر کے خانے میں فٹ کیا اور کریدنے والے انداز میں دریافت کیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے، چھوٹا چوہدری، نرگس سے دشمنی کیوں کر رہا ہے؟"

"ان دونوں میں کبھی نہیں بنی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمہاری پیش کی ہوئی دلیل سے مکمل طور پر اتفاق نہیں کر سکتا۔" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "میرے خیال میں ان دونوں کے بیچ دشمنی کا کوئی اور ہی سبب ہوگا!"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "جہاں تک مجھے پتا ہے جی، چھوٹے چوہدری صاحب اول دن ہی سے نرگس سے شدید نفرت کرتے ہیں۔"

"اس نفرت کی کوئی ٹھوس وجہ ہوگی؟"

"سننے میں آیا ہے، نرگس نے شادی والے دن قربان علی کو تھپڑ مار دیا تھا۔" مطلوب نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ "چوہدری نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں نرگس نے بڑے غصیلے انداز میں اسے چانٹا رسید کر دیا۔ چوہدری قربان علی تلملا کر رہ گیا لیکن بڑے بھائی کی وجہ سے اسے خاموش رہنا پڑا۔ چوہدری فرمان علی کے سامنے سب کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ نرگس بیاہ کر اس حویلی میں آ گئی لیکن قربان علی نے اسے کبھی بھابی تسلیم کیا اور نہ ہی اس کا جائز احترام دیا۔ بھائی کے سامنے وہ مجبور ہو جاتا، پیٹھ پیچھے اسے نرگس کی برائی کرتے ہوئے سنا اور دیکھا گیا ہے۔"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "حالات کچھ کچھ واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ قربان علی کی نرگس سے دشمنی کی وجہ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ ویسے نرگس نے شادی والے روز قربان کی بدتمیزی کے جواب میں جو کارنامہ انجام دیا، میں اس کی حمایت کرتا ہوں۔ چوہدری قربان اسی قسم کے سلوک کا مستحق تھا۔"

میں نے تھوڑا توقف کر کے مطلوب حسین کو گہری نظر سے دیکھا اور قدرے سرگوشیانہ انداز میں مستفسر ہوا۔ "مطلوب! تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کیس میں چوہدری قربان کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"کیا مطلب جی؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ "مطلب یہ کہ چوہدری نے سارا کام تو خود کیا ہو اور نرگس کو قربانی کا بکرا بنا کر اس پر الزام ڈالنے کی کوشش کر رہا ہو!"

"آپ بڑی خطرناک باتیں کر رہے ہیں جناب!" وہ سہمی ہوئی مگر چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خطرناک سہی لیکن حقیقت سے قریب تر تو محسوس ہو رہی ہیں نا۔ تم کیا کہتے ہو، کیا ایسا ہونا ناممکن ہے جو میں سوچ رہا ہوں؟"

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ "ہونے کو تو سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن آپ اس سلسلے میں مجھے معاف ہی رکھیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا آپ کا۔"

"تم کیوں مرے جا رہے ہو مطلوب حسین؟" میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر کہا۔

وہ متوحش نظروں سے بیٹھک کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جناب! آپ تو تھانے دار ہیں۔ جو چاہیں، سوچ سکتے ہیں، جیسا چاہیں، بول سکتے ہیں۔ لیکن میں بہت غریب مسکین آدمی ہوں۔ اگر چھوٹے چوہدری صاحب کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی کہ میں کسی حوالے سے ان کے خلاف سوچ رہا ہوں تو وہ مجھے بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے۔ آپ انہیں جانتے نہیں ہیں!"

"اچھی طرح جان گیا ہوں مطلوب حسین!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور رہی سہی کسر تمہاری ان ڈری سہمی باتوں اور خوفزدہ چہرے نے پوری کر دی ہے۔ مگر شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ میں قربان علی جیسے چوہدریوں کی دہشت کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔ پیدا کرنے والے کی قسم ہے، اگر قربان علی اس کیس میں ملوث ثابت ہو گیا تو میں اس کا وہ حشر کروں گا جو تم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔"

وہ سراسیمہ نگاہ سے یک ٹک مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اگر تم لوگوں کو چوہدری قربان سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو دعا کرو، چوہدری فرمان کی موت خودکشی ثابت ہو ورنہ......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ کمزور لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ اپنی تفتیش کو جیسے چاہیں، آگے بڑھائیں، وہ آپ کا اور قانون کا معاملہ ہے۔ لیکن میں ایک مرتبہ پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے درخواست کروں گا، چوہدری صاحب تک یہ بات نہیں پہنچنا چاہئے کہ میں نے ان کے خلاف آپ سے کچھ کہا ہے۔"

بات کے اختتام پر مطلوب حسین نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "تم خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہو۔ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ چوہدری کے سامنے تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

وہ بڑی شد و مد سے میرا شکریہ ادا کرنے لگا۔

مزید دس منٹ تک میں اس سے مختلف سوالات پوچھتا رہا جن میں حبیب کا خاص طور پر ذکر آیا۔ اس نے بتایا کہ وقوعے کی رات یا اس سے پہلے کبھی اس نے مذکورہ بندے کو حویلی کے آس پاس یا حویلی کے اندر نہیں دیکھا تھا۔ مطلوب حسین کے مطابق، حویلی میں وہ دو مختلف قسم کی خدمات انجام دیتا تھا۔ اس کی کوئی مخصوص ڈیوٹی نہیں تھی۔ اسے جو حکم دیا جاتا تھا، وہ بجا لاتا۔ میں نے فارغ کرنے سے پہلے اسے تاکید کی کہ اگر وہ حویلی کے اندر یا باہر کوئی قابلِ ذکر اور اہم بات محسوس کرے تو کسی دوسرے سے ذکر کرنے کے بجائے وہ فوراً مجھے بتائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔ مطلوب حسین کام کا بندہ دکھائی دیا تھا۔

حویلی سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے قربان علی کو چند اہم باتیں ذہن نشین کرائیں

جن میں منظور کی واپسی کے بعد اسے فوراً تھانے بھیجنا تاکہ اس کا بیان لیا جائے......اور بغیر اطلاع حویلی کے مکینوں کا احمد نگر سے باہر نہ جانا شامل تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کیا مجھے بھی کہیں آنے جانے کے لئے آپ سے اجازت لینا ہوگی؟''

''کیا تم اس حویلی کے مکینوں میں شامل نہیں ہو؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں تو یہاں کا مالک ہوں جناب!''

''میں تمہاری ملکیت پر شک کر رہا ہوں اور نہ ہی اسے چھیننے کا کوئی ارادہ ہے۔'' میں نے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس حویلی میں بسنے والے تمام ملازم اور مالک مکین ہی کہلائیں گے اور سب کے لئے میرا یکساں حکم ہے۔ احمد نگر سے باہر جانے کے لئے انہیں پیشگی تھانے میں اطلاع دینا ہوگی۔''

''یہ تو بڑا عجیب و غریب حکم ہے جناب!'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم اسے صرف ایک حکم سمجھو، عجیب و غریب کے چکر میں نہ الجھو۔''

پھر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر تھانے آ گیا۔

اسی شام میں نرگس کو دیکھنے ہسپتال جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ منظور تھانے آ گیا۔ چوہدری کا یہ ملازم آج صبح سلطان اور فرزانہ کو ان کے باپ کی موت کی خبر دینے موضع قلعہ واسو سنگھ گیا تھا۔ واسو سنگھ میں چوہدری فرمان کا سالا چوہدری کرم داد رہتا تھا۔

میں نے منظور کو فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ پستہ قامت کا مالک ایک نہایت ہی ہوشیار بندہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے چالاکی ٹپکتی تھی اور نشست و برخاست سے بھی وہ خاصا مستعد نظر آتا تھا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لینے کے بعد استفسار کیا۔

''تم قلعہ واسو سنگھ سے کب واپس آئے ہو؟''

''ایک گھنٹہ پہلے آیا ہوں سرکار'' وہ چہک کر بولا۔ ''چوہدری سلطان اور فرزانہ بی بی کے علاوہ چوہدری کرم داد بھی میرے ساتھ یہاں پہنچے ہیں۔'' پھر مجھے بولنے کا موقع دیئے بغیر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''چوہدری کرم داد کا آنا ضروری بھی تھا جناب۔ وہ بڑے چوہدری صاحب کے بہت قریب تھے۔''

میں نے اس کے تبصرے اور تجزیے کو نظر انداز کرتے ہوئے موجودہ حالات کے بارے میں مختلف سوالات کئے۔ چوہدری فرمان کی خودکشی یا قتل کے بارے میں گھما پھرا کر اس سے پوچھ گچھ کی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ چوہدری قربان کے کیمپ کا آدمی تھا۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ نرگس نے اپنے آشنا حبیب کے تعاون سے چوہدری فرمان کو ٹھکانے لگا کر چھت سے لٹکا دیا ہوگا۔ مطلوب حسین کے برخلاف منظور قربان کا حامی دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ماتھے پر بل ڈال کر اس سے پوچھا۔ ''کیا تم نے نرگس یا حبیب کو یہ واردات

کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

''دیکھا تو نہیں جی، پر حالات و واقعات اسی جانب اشارہ کرتے ہیں۔'' وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم کن حالات و واقعات کو حوالہ بنا رہے ہو؟''

''وہ جی...... وہ جی، نرگس بی بی کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ صبح ہی صبح انہوں نے مجھے بتایا کہ بڑے چوہدری صاحب نے چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے۔ مجھے اس بات کا ذرا یقین نہ آیا۔ میں دوڑا دوڑا چوہدری صاحب کے پاس پہنچا۔ اللہ بھلا کرے، وہ اس وقت سو رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹا کر انہیں جگا دیا۔ پھر وہ بھاگم بھاگ بڑے چوہدری صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ میں بھی ان کے پیچھے آیا اور بڑے چوہدری صاحب کو چھت سے لٹکتے دیکھا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کچھ دیر بعد چھوٹے چوہدری صاحب نے مجھے قلعہ واسو سنگھ روانہ کر دیا۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''نرگس نے تمہیں بڑے چوہدری کی خودکشی والی اطلاع کب دی تھی؟''

''وہ تڑکے کا وقت تھا جناب۔'' وہ خیال انگیز انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، صبح کے سات بجے ہوں گے۔''

''کیا تم نے اسی وقت چوہدری فرمان کی خواب گاہ میں جھانک کر دیکھا تھا؟''

''نہیں سرکار!'' اس نے نفی میں گردن جھٹکی۔ ''میں بعد میں چھوٹے چوہدری صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔''

میں چند لمحے سوچتی اور کھوجتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''تمہارے خیالات چوہدری قربان سے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ کیا اس نے تمہیں یہ بیان رٹوایا ہے؟''

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں جناب!''

اس کے انداز نے بتا دیا کہ بالکل ایسی ہی بات ہے۔ میں نے ذرا مختلف زاویے سے سوال کیا۔ ''منظور! چوہدری قربان کی طرح تم بھی کہہ رہے ہو کہ نرگس نے اپنے سابق منگیتر کے تعاون سے چوہدری فرمان کو ٹھکانے لگا کر پھانسی کا رنگ دیا ہے، اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تم حبیب نامی اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو؟''

''بڑی اچھی طرح جناب۔'' وہ بے حد وثوق سے بولا۔ ''وہ بہت ہی خطرناک بندہ ہے۔ مجھے تو حیرت ہے، آپ نے ابھی تک اسے گرفتار کیوں نہیں کیا!''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں پہلی فرصت میں حبیب کو

حراست میں لے لوں گا، تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" پھر میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ حبیب میں تم نے کون سی خطرناکی دیکھی ہے؟"

"جناب، وہ ہر وقت بڑے چوہدری صاحب کے خلاف باتیں کرتا رہتا تھا۔" منظور نے زوردار انداز میں بتایا۔ "اس کا کہنا تھا، اسے جب بھی موقع ملا، وہ چوہدری صاحب کو چھوڑے گا نہیں۔ انہوں نے اس کی منگیتر کو ہتھیا کر اچھا نہیں کیا۔ وہ اس ظلم کا انتقام ضرور لے گا۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا حبیب نے یہ بات تم سے کہی تھی؟"

"براہ راست مجھ سے تو نہیں کہی لیکن مجھ تک پہنچ ضرور گئی۔" وہ معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں احمد نگر میں رہتا ہوں لیکن آلے دوالے تمام علاقوں کی خبر مجھے رہتی ہے۔"

"پھر تو تم بہت پہنچے ہوئے ہو بھئی!" میں نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔ "بلکہ تمہیں چلتا پرزہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا!"

وہ ایک تھانے دار کی زبان سے اپنی تعریف سن کر خوش ہو گیا، سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"کیا کریں جی، چوہدری کی ملازمت کوئی آسان کام نہیں۔ ہر وقت چوکس رہنا پڑتا ہے۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائید کی پھر کہا۔ "میں نے آج حویلی میں تمہارے ساتھی مطلوب کا بھی بیان لیا ہے۔ وہ بندہ تو مجھے بڑا پھسپھسا لگا۔ تمہارے مقابلے میں تو وہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

مسابقت والی بات میں نے منظور میں ہوا بھرنے کے لیے کہی تھی۔ وہ میرے چکر میں آ گیا جلدی سے فخریہ لہجے میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! جس طرح ہاتھ کی تمام انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، بالکل اسی طرح ایک مخدوم کے تمام خادم بھی یکساں نہیں ہوتے۔" اس کا انداز اچانک فلسفیانہ ہو گیا۔

میں نے اسے اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے سوال کیا۔ "منظور! میری معلومات کے مطابق، حبیب موضع مراد پور کا رہنے والا ہے۔ نرگس کا میکا بھی وہیں ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے موضع احمد نگر میں بھی دیکھا ہے، خاص طور پر نرگس کی شادی کے بعد؟"

یہ سوال میں نے منظور کو چیک کرنے کے لیے کیا تھا۔ چوہدری فرمان علی کی پہلی بیوی رشیدہ بیگم، نرگس اور مطلوب حسین کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ نرگس کی شادی کے بعد حبیب نے کبھی احمد نگر کا رخ نہیں کیا تھا۔ اگر منظور مکمل طور پر چوہدری قربان کے اشاروں پر ناچ رہا تھا تو پھر اس کا جواب اثبات میں آنا چاہیے تھا۔ اس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔

"جناب! میں نے پچھلے ایک سال میں کم از کم دس مرتبہ حبیب کو احمد نگر میں مختلف جگہوں پر دیکھا ہے۔" وہ تیقن سے بولا۔ "ابھی کل رات بھی وہ مجھے حویلی کے نزدیک نظر آیا تھا۔"

میں چونک اٹھا۔ "کیا اس سے تمہاری بات ہوئی تھی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ "میں کمی کمین لوگوں کو منہ نہیں لگاتا۔"

مجھے اس کے تبصرے پر بہت غصہ آیا۔ وہ خود چوہدریوں کا ایک ادنیٰ سا نوکر تھا اور بات بہت بلند کر رہا تھا۔ میں نے اپنی خفگی کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور رازداری سے پوچھا۔ "تم نے یہ بات اور کسی کو بتائی ہے؟"

"صرف چھوٹے چوہدری صاحب کو۔" اس نے جواب دیا۔

مجھے یقین ہو گیا، منظور سرتاپا چوہدری قربان علی کے ہاتھوں کا کھلونا تھا۔ اس کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچنے والا ایک معمولی کٹھ پتلا۔ میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کی حقیقت کو پہنچ چکا ہوں۔ اسے خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کی خاطر میں نے کہا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا منظور! قربان کے علاوہ اور کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔" پھر میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مزید کہا۔ "یہ بندہ حبیب واقعی بہت خطرناک لگ رہا ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس کی خبر لوں گا۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ چوہدری فرمان والے معاملے میں اس کا ہاتھ ضرور ہوگا۔"

میری یہ بات سن کر منظور کے چہرے پر آسودگی کے تاثرات ابھر آئے، گویا میری چال کامیاب ہو گئی۔ میں نے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں بھی انہی کے انداز میں سوچ رہا ہوں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اگر چوہدری قربان یا منظور یا دونوں کسی بھی حوالے سے فرمان علی کی موت کا سبب ہوتے تو وہ میری جانب سے محتاط نہ ہوتے۔ انہیں ذرا سا بھی شک نہ ہوتا کہ میں ان کے بارے میں کس انداز سے سوچ رہا ہوں۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ چوہدری قربان کو میرے خیالات سے ضرور آگاہ کرتا۔ قربان علی نے اسے تن تنہا تھانے بھیج کر اس بات کو اور پروثوق بنا دیا تھا کہ وہ منظور پر پورا بھروسا کرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے منظور کو رخصت کر دیا۔ وہ خاصا مطمئن گیا تھا۔

جب میں سرکاری اسپتال کی طرف جا رہا تھا تو میرا ذہن مختلف اور متضاد خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے جائے وقوعہ کا تنقیدی جائزہ لیا تھا اور ایک بات ابھی تک میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ چوبی وزنی میز جس طرح پہلو کے بل الٹی پڑی تھی وہ قابل غور نکتہ تھا۔ لگ بھگ بیس سیر وزنی میز کو پاؤں کے دبانے سے کھسکایا تو جا سکتا تھا لیکن ٹھوکر مار کر پہلو کے بل الٹانا ایک ناممکن عمل تھا اور وہ بھی اس پر کھڑے، خودکشی کے لیے تیار شخص کے لیے وہ اپنی عمر کی پینسٹھ بہاریں دیکھ چکا ہو۔ میں نے چوہدری فرمان علی کی لاش کا بھی معائنہ کیا تھا۔ اس کی صحت ایسی نہیں تھی کہ وہ پاؤں کی مدد سے وزنی میز کو یوں الٹا سکتا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ذہن میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ چوہدری فرمان نے خودکشی نہیں کی ہو

گی بلکہ اسے پھانسی دی گئی ہوگی۔ یہاں پر دو راستے سامنے آتے تھے۔ نمبر ایک چوہدری کو زبردستی پھانسی لگا دی گئی ہو، نمبر دو پہلے اسے بے بس یا بے ہوش یا بے جان کیا گیا ہو، اس کے بعد چھت سے لٹکا دیا گیا ہو تا کہ ایسا نظر آئے جیسے اس نے گردن میں پھندا ڈال کر خودکشی کی ہو۔

پہلا راستہ منفی طور پر ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اگر چوہدری فرمان کو زبردستی پھانسی پر لٹکایا گیا ہوتا تو وہاں زبردستی کے آثار ضرور نظر آتے۔ چوہدری آنکھیں بند کر کے آمنا وصدقنا اپنے گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک نہیں سکتا تھا۔ وہ مزاحمت کے طور پر ہاتھ پاؤں ضرور چلاتا اور زبان سے بھی چلم چلی ضرور کرتا۔ اس کی یہ ''کوشش'' گھر والوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ خاص طور پر اس کی بیویوں سے اور...... خاص الخاص نرگس سے جس کی خواب گاہ کا دروازہ اس رات کھلا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چوہدری فرمان نے نہ تو خودکشی کی تھی اور نہ ہی اسے زبردستی پھانسی پر ٹانگا گیا تھا۔ اب ایک ہی امکان باقی رہ جاتا تھا اور وہ یہ کہ اسے بے بس یا بے ہوش یا بے جان بنانے کے بعد پھانسی دی گئی ہو۔

یہ امکان اس لیے بھی قوی نظر آتا تھا کہ میں نے چوہدری کی آنکھوں کا بڑا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ وہ اس درجہ حلقوں سے ابلی نہیں پڑ رہی تھیں جیسا کہ عام طور پر خودکشی کرنے والوں کی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا سوچتے ہوئے ایک خطرناک خیال میرے ذہن میں گزرا۔ چوہدری فرمان علی کو کس نے قتل کیا تھا؟

نرگس نے حبیب کی مدد سے یا پھر قربان نے منظور کی معاونت سے۔

اس وقت صرف یہی دو ٹارگٹ نمایاں ہو کر میرے سامنے آئے تھے۔ میں رشیدہ بیگم کے اس خیال سے اتفاق کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ چوہدری فرمان نے خودکشی کی تھی۔ اس نے خودکشی کے لیے چوہدری کی جس کمزوری کو جواز بنانے کی کوشش کی تھی، رخسانہ کی طرح میں بھی اسے ماننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ حقیقت ہے، چوہدری فرمان علی جیسے ظالم و جابر بندے اپنی کسی کمی یا خامی کو تنقید کا نشانہ بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اتنے غیرت مند نہیں ہوتے کہ ندامت سے چور ہو کر پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر جان دے دیں۔ وہ اپنی جانب اٹھنے والے ہاتھ اور اس کے ساتھ حائل فرد کو زندہ گاڑ دیتے ہیں، اپنے خلاف کھلنے والی زبان گدی سے کھینچ دیتے ہیں۔ رخسانہ نے بالکل ٹھیک کہا تھا، اگر معاملہ ویسا رہا ہوتا تو چوہدری فرمان علی خودکشی کے بجائے نرگس کو خون تھوکنے اور زہر چاٹنے پر مجبور کر دیتا۔

اب آ جا کر بہت ہی اہم سوال کھڑا ہو گیا تھا۔ چوہدری فرمان کو پھانسی دینے سے قبل بے ہوش کیا گیا تھا۔ بے بس کیا گیا تھا یا پھر بے جان؟

اس سنگین اور خطرناک سوال کی مہلک بندشوں کو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی کھول سکتی تھی۔ میں ان خیالات کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا۔ ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبلو نے میرا استقبال کیا اور فی

الفور مجھے نرگس کے پاس جنرل وارڈ میں پہنچا دیا۔ میں نے اشاراتی زبان میں ان سے معلوم کر لیا تھا کہ وہاں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی؟ انہوں نے ''سب ٹھیک ہے'' میں جواب دیا تھا۔

نرگس مجھے قدرے بہتر حالت میں نظر آئی۔ اس کی ضروری مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ اس کی ایک کلائی میں ہلکا سا فریکچر آ گیا تھا جہاں ڈاکٹر نے بڑی مہارت کے ساتھ پلاسٹر چڑھا دیا تھا۔ اس کا ٹریٹمنٹ فوراً شروع کر دیا گیا تھا۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے نرگس کی حالت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہا۔

''ہم نے ضروری انجکشن اور دیگر طبی امداد مریضہ کو دے دی ہے۔ اگر گھر پر مناب دیکھ ریکھ ہو سکتی ہو تو ڈرپ ختم ہونے کے بعد اسے ڈسچارج کروا لیں، ویسے میرا مشورہ ہے، مریضہ کو کم از کم دو روز تک اسپتال میں رہنے دیں۔''

''آپ یہ مشورہ کس بنا پر دے رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر نے کہا۔'' میں نے محسوس کیا ہے، مریضہ اسپتال میں خود کو خاصا محفوظ اور مطمئن خیال کر رہی ہے۔ میں نہیں جانتا، اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے لیکن میں نے دیکھا ہے، جب اسے ایمرجنسی میں لایا گیا تو یہ بے حد خوف زدہ نظر آئی تھی۔ اس کی یہ کیفیت خاصی حد تک زائل ہو چکی ہے۔ یہ بات آپ نے بھی محسوس کی ہوگی ملک صاحب!''

ہم اس وقت ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کے مشورے کے مطابق مریضہ کو اسپتال میں چھوڑنے پر تیار ہوں۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا بیان بہت طولانی ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لیں، یہ ایک جابر شخص کے ظلم کا شکار ہوئی ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کیا۔ ''مریضہ سے آپ کی ہمدردی بجا، لیکن میں چاہوں گا، اس پر کڑی نظر بھی رکھی جائے۔ میں نے اس مقصد کے لیے دو کانسٹیبلو کو مامور کر رکھا ہے۔ آپ بھی اسپتال کے عملے کو الرٹ کر دیں۔''

ڈاکٹر میری احتیاط پسندی کے پیش نظر چونک اٹھا پھر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ مریضہ کسی حوالے سے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے؟''

''ایک خاص حوالے سے صرف ایک فیصد۔'' میں نے ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا تا کہ ڈاکٹر کی تشویش حد درجہ نہ بڑھ جائے۔ ''اور وہ خطرناکی بھی اس نوعیت کی ہوگی کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی۔ آپ پریشان بالکل نہ ہوں۔ میرے متعین کردہ دونوں افراد اسے سنبھال لیں گے۔ آپ سے تو میں نے احتیاطاً ذکر کر دیا ہے۔''

وہ خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔ ''ٹھیک ہے، میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

''کیا مریضہ کی ذہنی اور جسمانی حالت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ میں اس کا تفصیلی بیان قلم بند کر سکوں؟'' میں نے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

اس نے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔ ”مریضہ کی حالت خطرے سے باہر اور اطمینان بخش ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”چوہدری فرمان علی کا پوسٹ مارٹم کس مرحلے میں ہے؟“

”آپ میڈیکولیگل آفیسر سے مل لیں۔“ ڈاکٹر نے شائستگی سے کہا۔

میں وہاں سے اٹھا اور نرگس والے وارڈ کی جانب بڑھنے کے بجائے میڈیکولیگل آفیسر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ پوسٹ مارٹم ابھی تجزیاتی مراحل میں تھا۔ کل صبح مجھے ابتدائی رپورٹ مل جاتی۔ میں مذکورہ رپورٹ پڑھنے کے لیے بے چین تھا لیکن صبح تک انتظار کرنا مجبوری تھی کیونکہ کیمیکل ایگزامنر نے بھی اپنی تجزیاتی رپورٹ منسلک کرنا تھی۔ میں نرگس کے پاس آ گیا۔

اسپتال کے اسٹاف نے نرگس کے بیڈ کے نزدیک میرے لیے ایک کرسی ڈال دی۔ میں نے نرگس سے حال احوال دریافت کیا تو اس نے تشکرانہ نگاہ سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”تھانے دار صاحب! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ میرے فرائض کا تقاضا تھا۔“ میں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر تم واقعی اسے کوئی احسان سمجھ رہی ہو تو پھر پہلی فرصت میں اس احسان کو اتار دو۔“

”وہ کس طرح؟“ وہ اتنی شدت سے چونکی کہ بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کر بیٹھی۔

میں نے شانوں سے سہارا دے کر اسے دوبارہ لٹا دیا اور پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ”احسان اتارنے کے لیے تمہیں اٹھنے کی ضرورت نہیں نرگس! یہ کام لیٹے لیٹے بھی ہو سکتا ہے۔ تمہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے اور ایک کلائی پر پلاستر چڑھا ہوا ہے۔ تمہارا لیٹا رہنا زیادہ اہم ہے۔“

”پھر...... پھر میں...... آپ کا احسان کیسے اتاروں؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔

میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ہزار ہا آنکھوں میں جھانکا ہے۔ ان میں قاتلوں اور خطرناک مجرموں کی آنکھیں بھی تھیں اور سڑک چھاپ غنڈوں بدمعاشوں کی بھی۔ بے گناہ مظلوموں کی بھی تھیں اور معصوم سادہ لوح افراد کی آنکھیں بھی۔ میں اس تجربے اور مشاہدے سے اچھا خاصا نین شناس ہو گیا تھا۔ نرگس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ کسی زاویے سے چوہدری فرمان کے قتل میں ملوث ہو گی۔ اب اگر ایسا تھا تو پھر یہی کہا جا سکتا تھا، میں زبردست دھوکا کھا رہا تھا۔ دنیا میں ایسے مجرم بھی پائے جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں نرگس جیسی سادگی اور معصومیت اجاگر ہو۔

میں نے نرگس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ احسان سچ بول کر اتار سکتی ہو۔“

”سچ!“ اس نے دہرایا۔ ”میں نے اب تک آپ سے کون سا جھوٹ بولا ہے!“

میں نے کہا۔ ”اگر نہیں بولا تو میں یہی چاہتا ہوں، آئندہ بھی نہ بولو۔ میں اس وقت تمہارا تفصیلی بیان لینے آیا ہوں۔“

”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔“ وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

میں نے اس کا رہا سہا خوف بھی دور کرنے کی خاطر کہا۔ ”سب سے پہلے تم مجھے اپنے اغوا اور زبردستی کی شادی کے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تمہارے حالات کے پس منظر سے آگاہ ہو سکوں!“

”میری شادی!“ اس نے ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد کہا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتانے لگی۔ ”میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ لگ بھگ سوا سال پہلے کی بات ہے۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی جب چوہدری فرمان علی نے مجھے اغوا کروا کے اپنے ڈیرے پر پہنچایا تھا اور اغوا کرنے والوں کا سرغنہ جانتے ہیں، کون تھا؟“ وہ اچانک رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نہیں جانتا تھا اس لیے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہ نفرت سے لبریز لہجے میں بولی۔ ”یہی نامراد خبیث چوہدری قربان علی۔“

مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں حیرت بھرے انداز میں اس کا منہ تکنے لگا۔

وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”قربان نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے فرمان کے ایما پر مجھے اغوا کر کے ڈیرے پر پہنچا دیا اور جب میں نے اسے کھری کھری سنائیں تو وہ برداشت نہ کر سکا۔ چوہدری اور وڈیرے خود کو بڑا کہلواتے ہیں لیکن اندر سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں رتی بھر برداشت کا مادہ نہیں ہوتا۔ برداشت تو ہم جیسے لوگوں کو کرنا پڑتا ہے اور ہم کرتے بھی ہیں!“ اس کے الفاظ سے زہر ٹپکتا تھا۔ وہ اندر سے زخم زخم ہو رہی تھی۔

وہ ذرا متوقف ہوئی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”جب چوہدری قربان سے برداشت نہ ہوا تو وہ مجھے مغلظات میں تولتے ہوئے بدتمیزی پر اتر آیا۔ جواب میں، میں نے بھی اس کے منہ پر ایک زوردار چانٹا رسید کر دیا۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہو گا، ایک معمولی جولاہے کی بیٹی اسے یوں تھپڑ مارے گی۔ بہرحال، اسی وقت چوہدری فرمان ڈیرے پر پہنچ گیا اور قربان کو میرے خلاف کسی قسم کی انتقامی کارروائی کا موقع نہ مل سکا لیکن وہ اس تھپڑ کو اپنی سوچ میں سجا کر میرے خلاف سوچتا رہا۔ بھائی کی زندگی میں تو اسے مجھ پر وار کرنے کی ہمت ہوئی اور نہ ہی کوئی موقع ملا لیکن جیسے ہی فرمان کی آنکھ بند ہوئی، وہ میرا دشمن ہو گیا اور دشمن بھی ایسا ویسا!“ اس نے ایک جھرجھری لی اور بولی۔ ”آپ نے میرا حشر دیکھا ہے۔ اس شیطان نے نہ صرف مجھے بے دریغ مارا ہے بلکہ مجھ پر قتل کا سنگین الزام بھی عائد کر دیا ہے۔“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

مطلوب حسین کی زبانی مجھے اس یادگار چانٹے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا جو شادی کے روز نرگس نے قربان کے منہ پر مارا تھا۔ نرگس سے قربان کی دشمنی کی بنیاد اسی دن پڑ گئی تھی۔ میں نے نرگس سے پوچھا۔ ''شادی کن حالات میں ہوئی تھی؟''

''وہ بڑے بے ہودہ حالات تھے۔'' وہ دور خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ ''مجھے زبردستی اغوا کر کے چوہدری کے ڈیرے پر پہنچایا جا چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری فرمان ایک نکاح خواں اور چند حواریوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد میرے بوڑھے ماں باپ کو بھی اسی ڈیرے پر لایا گیا۔ چوہدری کے بندوں نے میری ماں اور باپ کو بندوقوں کے نشانوں پر رکھ لیا اور مجھ سے کہا گیا کہ میں چوہدری فرمان کے نکاح میں آ جاؤں۔ انکار کی صورت میں وہ میرے والدین کو میری نگاہ کے سامنے بھون کر رکھ دیں گے۔ اس کے بعد میرا جو حشر ہو گا اسے دنیا دیکھے گی۔ پھر چوہدری مجھ سے شادی نہیں کرے گا بلکہ داشتہ بنا کر حویلی میں ڈال لے گا اور اگر میں نے زیادہ تین پانچ کی تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔''

وہ سانس درست کرنے کے لئے ذرا رکی پھر مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''آپ ہی بتائیں تھانے دار صاحب! میں اس شادی سے انکار کس طرح کرتی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو گولیوں سے چھلنی ہونے سے بچایا اور خود کو چوہدری کی رکھیل بننے نہیں دیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ اپنی جان دے دوں مگر فرمان جیسے منحوس گدھ سے شادی نہ کروں مگر ایسا سوچتے ہوئے میری ماں اور باپ کے چہرے میرے تصور میں چمکنے لگے۔ ان کے بے جان لاشے گولیوں سے چھلنی تھے جو میرے انکار کا نتیجہ تھا۔ میرا تصور کانپ اٹھا اور...... میں انکار نہ کر سکی۔ تھانے دار صاحب! میں مجبور ہو گئی تھی، بہت مجبور!''

وہ خلا میں دیکھ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے تھے۔ نرگس اس وقت مجھے دکھ کا مرقع نظر آئی۔ بے چاری کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا تھا اور نرگس اس سلسلے کی پہلی یا آخری کڑی نہیں تھی۔ جب تک اس دھرتی پر ظالم اور جابر لوگوں کی حکمرانی رہے گی، اس قسم کی الم ناک داستانیں دہرائی جاتی رہیں گی۔ چہرے اور ہاتھ بدلتے رہیں گے مگر کہانی وہی رہے گی۔

میں نے نرگس کا غبار نکلنے دیا۔ یہ اس کی ذہنی اور روحانی صحت کے لئے بہت ضروری تھا۔ جسمانی علاج تو ڈاکٹر کر ہی رہا تھا۔ جب دل کی کلفت نے اس کی آنکھوں کو دھو دیا تو میں نے نرگس سے ایک نہایت ہی نازک سوال کیا۔ اس کا تعلق رشیدہ بیگم کے اس انکشاف سے تھا، بعد ازاں جس کی تصدیق رخسانہ بیگم نے بھی کی تھی۔ نرگس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ان دونوں کی تائید کر دی۔ اس طرح چوہدری کی خامی کو سند حاصل ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''رشیدہ کا خیال ہے، چوہدری نے اپنی اسی خامی کے غم میں خودکشی کی ہے!''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ معذوری سے بولی۔

''اور رخسانہ کا کہنا ہے، چوہدری اتنا بزدل نہیں تھا کہ اس وجہ سے اپنی جان لے لیتا۔'' میں
ے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم چوہدری فرمان کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں
یا کہتی ہو؟''

وہ گمبیھر آواز میں بولی۔ ''میں نہیں جانتی چوہدری کو قتل کیا گیا ہے یا اس نے خودکشی کی ہے۔ ہر حال، اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے بے قصور سا معاملے میں گھسیٹا جا رہا ہے۔''

اس کا لہجہ کہیں سے بھی جھوٹ کی چغلی نہیں کھا رہا تھا۔ میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کر یا اور پوچھا۔ ''آج تمہاری خدمت گار سلمٰی حویلی نہیں آئی۔ کیا کل اس نے نہ آنے کے بارے ں تمہیں کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں، اس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے چوہدری فرمان کی خواب گاہ میں کھلنے والے چاروں دروازوں کے بارے میں وڑی دیر بات کی پھر کہا۔ ''نرگس! تمہارے کمرے کا دروازہ گزشتہ رات کھلا پایا گیا تھا اسی لئے قربان تمہیں نشانہ بنا رہا ہے۔ اس کو ایک موقع مل گیا ہے۔ اس سلسلے میں تم کیا کہو گی؟''

''میں یہی کہوں گی کہ اگر وہ دروازہ کھلا نہ بھی ہوتا تو یہ لعین دشمنی سے باز نہ آتا۔'' وہ بیزاری ے بولی۔ ''اور وہ دروازہ کھلا اسی لئے تھا کہ ان دنوں چوہدری فرمان صرف مجھے ہی اپنی خلوت ں بلاتا تھا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ ''گزشتہ رات تم کب تک چوہدری کے کمرے ں رہی تھیں؟''

''لگ بھگ دس بجے تک۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔

''کیا یہ معمول کے مطابق تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، خلافِ معمول تھا؟''

اس مرتبہ وہ سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''عام طور پر تم کتنے بجے تک اس کے کمرے میں رہتی تھیں؟''

''پوری رات...... یا پھر رات کے آخری پہر تک۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''گزشتہ رات قبل از وقت واپسی کا سبب کیا تھا؟''

چوہدری فرمان احمد نگر سے باہر کہیں گیا ہوا تھا اور رات کو دیر سے حویلی پہنچا تھا۔'' نرگس نے حکم لہجے میں بتایا۔ ''اس کی واپسی رات نو بجے کے اریب قریب ہوئی تھی۔ اس نے رات کا کھانا بھی بھرپور انداز میں نہیں کھایا تھا اور دودھ کا ایک گلاس پینے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ اسے نیند آ رہی ہے۔ وہ بہت زیادہ تھکن محسوس کر رہا ہے لہٰذا سونا چاہتا ہے۔ اس نے خمار

آلود آواز میں مجھے تاکید کی کہ میں بھی اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤں۔"

"یہ بات بھی خلافِ معمول نہیں تھی؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"ہاں، تھی تو۔" وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن چوہدری اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ کسی وقت کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔ دوسروں کو بے چون و چرا اس کے حکم کی تعمیل کرنا ہوتی تھی۔"

"تم چوہدری کی ہدایت پر اپنے کمرے میں آ کر سو گئی تھیں؟"

"مجھے کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔" اس نے بتایا۔ "میں اپنے بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی۔ ایک مرتبہ اٹھ کر میں نے چوہدری کے کمرے میں جھانکا۔ اس عمل میں، میں نے یہ احتیاط رکھی کہ چوہدری کو میری حرکت کا علم نہ ہو ورنہ وہ مجھے ڈانٹ بھی سکتا تھا کہ میں نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ میں نے نیم وا دروازے میں سے چوہدری کو کروٹ کے بل لیٹے دیکھا۔ اس کا منہ دوسری دیوار کی جانب تھا۔ اس لئے میں اندازہ نہ لگا سکی کہ وہ سو چکا تھا یا جاگ رہا تھا۔"

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی۔ "میں واپس اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ دوسری صبح جب میں سو کر اٹھی تو چوہدری کے کمرے کا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ میں وہ منظر دیکھ کر وحشت زدہ ہو گئی۔ اسی وحشت اور دہشت میں، میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ میری نظر منظور پر پڑی تو میں نے اسے چوہدری کی خودکشی کے بارے میں بتایا پھر تھوڑی ہی دیر بعد چھوٹا چوہدری وہاں پہنچ گیا۔ قربان نے بڑے بھائی کو چھت سے لٹکا ہوا دیکھا تو مجھ پر برس پڑا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اب آپ سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔"

نرگس اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ اس کی سیلی آنکھوں نے تکیے کو اچھا خاصا بھگو دیا تھا۔ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ اندازہ لگانے میں مجھے کسی دقت سے نہیں گزرنا پڑا کہ نرگس اس معاملے میں سراسر بے قصور تھی۔ چوہدری قربان ذاتی رنجش اور دیرینہ پرخاش کی وجہ سے خواہ مخواہ اسے گھسیٹ رہا تھا مگر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اس سوال کا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا...... حقائق کی پردہ پوشی کے لئے۔ اگر اس تھیوری کو مان لیا جائے تو پھر چوہدری قربان کی ذات چوہدری فرمان کی موت میں ملوث دکھائی دینے لگتی تھی!

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے بتایا گیا، مراد پور سے کچھ لوگ نرگس سے ملنے آئے تھے۔ نرگس کی ہسپتال میں موجودگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ عین ممکن تھا، اس کے گھر والوں میں سے کوئی دیکھنے آیا ہو۔ میں نے فوراً انہیں وارڈ میں بلا لیا۔ نرگس کا بیان ایک طرح سے مکمل ہو چکا تھا۔ ان لوگوں کی آمد سے مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔

وہ کل چار افراد تھے۔ تین مرد اور ایک عورت۔ ان میں ایک نرگس کا باپ شوکت حسین تھا، دوسرا اس کا بہنوئی اور تیسرا نوجوان حبیب تھا۔ عورت قدیر کی بیوی یعنی نرگس کی بہن تھی۔ حبیب

کے بارے میں معلوم ہوا تو میں چونک اٹھا۔ اس کیس میں اس کا نام کئی جگہوں پر آ چکا تھا۔ میں اس کی خبر گیری کے لئے کل مراد پور جانے والا تھا۔ اچھا ہوا، وہ خود ہی چل کر مجھ تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے باقی تین افراد کو تو نرگس کے پاس رہنے دیا اور حبیب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ "جوان! تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں جی؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "حبیب! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ جگہ ان باتوں کے لئے مناسب نہیں۔"

میرے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ وہ ایک نظر نرگس پر ڈالنے کے بعد میرے ساتھ ہو لیا۔ میں اسے جنرل وارڈ سے باہر ہسپتال کے ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا۔ وہاں ایک طویل چوبی بینچ بچھی تھی۔ میں نے اس بینچ پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کی دعوت دی۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے میری بات مان لی اور متفکر نگاہ سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی الجھن نے جالا بُن دیا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ "حبیب! میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔ سچ بولنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہوں اور جھوٹوں کو سو جوتے لگاتا ہوں۔ تم نے پولیس والوں کا جوتا تو دیکھ رکھا ہے نا، نو بائی چار کا پیور لیدر ہوتا ہے!"

"لل...... لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" وہ ہکلایا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس لئے بتا رہا ہوں کہ اب میں تم سے چند سوال پوچھوں گا۔ اگر تم نے مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں حوالات کی ہوا کھلانے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔"

"میں آپ کو چکر کیوں دوں گا؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا پھر آپ سے کیوں ڈروں۔ آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

اس کا انداز نڈر اور بے باک تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے چوہدری فرمان علی کی موت کے بارے میں تو سن لیا ہو گا۔ اس کیس میں تمہارا نام لیا جا رہا ہے۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "صبح نرگس کی والدہ اور بہن بہنوئی احمد نگر گئے تھے۔ ان کی زبانی مجھے وہاں کے حالات سے آگاہی ہوئی ہے لیکن آپ اب یہ نئی بات بتا رہے ہیں کہ چوہدری فرمان علی کے معاملے میں مجھے ملوث کیا جا رہا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

میں نے پہلے اسے "وجہ" کی تفصیل بتائی پھر کہا۔ "چوہدری قربان کا کہنا ہے، تم نے نرگس کے ساتھ مل کر بڑے چوہدری کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور بعد میں اسے خودکشی کا رنگ دے دیا۔" بات کے اختتام پر میں نے حبیب کو تیز نظر سے گھورا۔

"یہ جھوٹ ہے...... بکواس ہے۔" وہ تقریباً چلا اٹھا۔ "میرا چوہدری فرمان سے کیا تعلق؟"

"چوہدری فرمان سے نہ سہی، نرگس سے تو ہے؟" میں نے اسے گھسنے کی خاطر کہا۔

وہ شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "چوہدری قربان مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ کیا اس نے مجھے چوہدری فرمان کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے جو وہ اتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے؟"

"اس نے نہیں دیکھا لیکن میں اس کی شکایت پر تمہیں گرفتار کر سکتا ہوں۔" میں نے اپنے لہجے میں سنگینی بھرتے ہوئے کہا تاکہ اگر وہ چور ہو تو اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکے۔ "جب تم میری تفتیش کے رگڑے میں آؤ گے تو سب کچھ اگل دو گے۔"

"جناب! آپ میری بات کا یقین کریں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "چوہدری فرمان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ آپ بلاوجہ مجھے پریشان نہ کریں...... بلکہ میں تو کہتا ہوں، نرگس کو بھی خواہ مخواہ تنگ نہ کریں۔ وہ بے چاری پہلے ہی بہت تکلیفیں اٹھا چکی ہے۔"

"بڑی ہمدردی ہے تمہیں نرگس سے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہونی بھی چاہئے تھانے دار صاحب! وہ میری ماموں زاد ہے۔"

"جو کبھی تمہاری منگیتر بھی تھی؟"

"یہ بھی ایک حقیقت ہے۔" وہ یک لخت اداس ہو گیا۔

میں نے اپنی تسلی کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چوہدری فرمان علی نے زبردستی تمہاری منگیتر کو چھین لیا۔ تم چوہدری کے لئے اپنے دل میں بے حد غم و غصہ رکھتے تھے۔ تم نے نرگس کے ساتھ مل کر پلاننگ کی پھر تم نے اپنے رقیب کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

وہ بھڑک اٹھا۔ "تھانے دار صاحب! ان فرضی قصوں میں الجھا کر آپ مجھے قاتل ثابت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ خدا گواہ ہے، میں نے کبھی احمد نگر کا رخ نہیں کیا، چوہدری کو قتل کرنا تو دور کی بات ہے۔"

اس کے بھڑکنے میں اداکاری کا عنصر شامل نہیں تھا۔ اس نے ایسے ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا جیسے کوئی کھرا آدمی غلط بات پر چراغ پا ہو جاتا ہے۔ میں نے قانون کے تقاضے نبھاتے ہوئے اس کو ٹٹولنا اور کریدنا جاری رکھا۔

"تم مسلسل جھوٹ پر جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے کڑک کر کہا۔ "پچھلے ایک سال میں تم کم از کم دس مرتبہ احمد نگر میں دیکھے گئے ہو۔"

"کس نے دیکھا ہے مجھے وہاں؟" وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کل شام کے وقت تم چوہدری فرمان علی کی حویلی کے آس پاس موجود نہیں تھے؟"

میں نے منظور نامی ملازم سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں حبیب کو سوالات کی

چکی میں پیس ڈالا۔ لیکن وہ بھی اپنی بات پر ڈٹا رہا، خفگی آمیز انداز میں بولا۔ "تھانے دار صاحب! کل شام تو کیا، میں نے کم از کم ایک سال سے احمد نگر میں قدم نہیں رکھا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ "جب سے نرگس کی شادی چوہدری سے ہوئی ہے، میں نے ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ نرگس میری منگیتر تھی۔ میں احمد نگر کے چکر کاٹ کر اپنی نظر میں گرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی نرگس کے لئے مشکلات کھڑی کرنا چاہتا ہوں۔ جب میں چوہدری فرمان جیسے طاقت ور شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو خواہ مخواہ رسوائی کا کیا فائدہ!" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر پوچھنے لگا۔ "آپ نے بتایا نہیں، کل شام کس شخص نے مجھے حویلی کے قریب دیکھا تھا؟"

یہ کوئی بتانے والی بات نہیں تھی۔ مجھے منظور کے جھوٹ پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے سوچا، کل اسے تھانے بلا کر رگڑوں گا۔ اس نے ایک طرح سے مجھے مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے منظور کا نام ظاہر کئے بغیر حبیب سے جرح جاری رکھی۔

"اگر تم کل شام احمد نگر میں چوہدری فرمان کی حویلی کے قریب نہیں تھے تو پھر کہاں تھے؟"

"میں اپنے گھر میں تھا۔" وہ جلدی سے بولا۔ "مراد پور میں۔"

"کیا گزشتہ پوری رات تم نے اپنے گھر ہی میں گزاری ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا اور کہا۔ "آپ میرے گھر والوں سے پوچھ سکتے ہیں بلکہ اس بات کی گواہی تو قدیر بھی دے گا۔ میں رات گئے ماموں شوکت کے گھر اس سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ہسپتال میں موجود ہیں۔ آپ میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

اس نے ایک انتہائی معقول بات کہی تھی۔ ویسے مجموعی طور پر اس نے ابھی تک کوئی بھی فضول اور نامعقول بات نہیں کی تھی۔ وہ ایک سلجھا ہوا اور سمجھ دار شخص تھا۔ میں نے تصدیق میں دیر مناسب نہ سمجھی اور تھوڑی دیر بعد یہ ثابت ہو گیا کہ وقوعہ کی شام یا رات حبیب مراد پور میں موجود تھا۔ اس کے بعد حبیب سے مزید سوال جواب کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے فارغ کرنے سے پہلے میں نے تاکید کر دی کہ وہ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہے اور جب تک اس کیس کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا، وہ تھانے میں پیشگی اطلاع دیئے بغیر اپنے علاقے سے باہر نہ جائے۔

اگلے روز، میں نے حوالدار شمشاد کو دو کانسٹیبلو دے کر احمد نگر روانہ کر دیا تاکہ نرگس کی خاص خادمہ سلمٰی کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور منظور کو بھی پکڑ کر تھانے لایا جائے۔ وہ چوہدری قربان کا حمایتی تھا اور اس کا جھوٹ کھل جانے کے بعد مجھے شک ہونے لگا تھا، چوہدری قربان نے منظور کے ساتھ مل کر بڑے چوہدری کے ساتھ کوئی کارروائی کی ہے!

حوالدار ایک گھنٹے بعد واپس آ گیا۔ سلمٰی کے بارے میں اس نے اطلاع دی کہ وہ تیز بخار میں پھنک رہی ہے اور آج بھی حویلی نہیں جا سکی تھی۔ میں نے حوالدار سے پوچھا۔ "اور اس

سورما کو لائے ہو اپنے ساتھ؟"

"منظور باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔" حوالدار نے بتایا۔

"وہ وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اسے میرے کمرے میں لے کر آؤ، لیکن کوئی چھوٹا سا "ٹریلر" دکھانے کے بعد۔ میں اس پر وقت برباد نہیں کرنا چاہتا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!" حوالدار خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ڈرائنگ روم کی ایک جھلک دکھا کر لاتا ہوں۔"

دس منٹ بعد منظور میرے سامنے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ حوالدار شمشاد بڑے جارحانہ انداز میں اس کے پہلو میں موجود تھا۔ میں نے بھرپور نظر سے منظور کو دیکھا اور سہلانے والے انداز میں کہا۔

"تمہیں مجھ تک پہنچنے میں کوئی تکلیف تو نہیں اٹھانا پڑی؟"

"تکلیف!" وہ روہانسی آواز میں بولا۔ "آپ کے حوالدار نے تو میرا کچومر نکال دیا ہے۔"

میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ "حوالدار بہت جلاد قسم کا بندہ ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ تعاون نہیں کیا تو یہ تمہیں جان سے مار دے گا۔"

وہ خوف زدہ نظر سے شمشاد کو دیکھنے کے بعد مجھ سے بولا۔ "تھانے دار جی! آپ اسے یہاں سے ہٹا لیں۔ میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔"

"یہ تو یہاں سے نہیں ہٹے گا بھئی!" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں سیدھا سادہ تھانے دار ہوں۔ تم مجھے چکر دے دو گے۔ تم سے تو حوالدار ہی نمٹے گا۔"

"میں آپ کو کوئی چکر نہیں دوں گا سرکار!" وہ رونی صورت بنا کر بولا۔

میں نے حوالدار کو جانے کا اشارہ کیا اور منظور کے ساتھ "مذاکرات" میں مصروف ہو گیا۔ اس نے بڑی شرافت سے اقرار کر لیا کہ وقوعے کی رات اور اس سے پہلے بھی اس نے حبیب کو احمد نگر میں نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے اسے مزید "تفتیش" کا ڈراوا دیا تو اس نے اگل دیا کہ حبیب کو دیکھنے والی بات اس نے چوہدری قربان کے حکم پر کی تھی۔ میں نے اسے قربان کا معاون گردانتے ہوئے فرمان کے قتل کے حوالے سے بھی کئی اہم سوال کئے لیکن وہ باقاعدہ رونے لگا اور کہا کہ بڑے چوہدری کی موت میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ چھوٹا چوہدری اگر اس کیس میں ملوث ہے تو اسے اس کا علم نہیں۔

میں نے مزید تفتیش کی خاطر منظور کو حوالات میں بند کر دیا۔ چوہدری قربان کی ذات لمحہ بہ لمحہ شکوک کی دبیز تہ میں دبتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اسے تھانے بلوانے کے لئے اپنے بندے بھیجے تو پتا چلا، وہ حویلی میں موجود نہیں تھا۔ میں نے ان بندوں کی ڈیوٹی لگا دی کہ جیسے ہی وہ نظر آئے، اسے عزت و احترام کے ساتھ تھانے لایا جائے۔ چوہدری قربان کے خلاف ایک گواہ

میرے پاس موجود تھا۔ منظور گواہی دے سکتا تھا کہ اس نے چوہدری کے ایما پر جھوٹ بولا تھا۔ اس گواہی کے بعد قربان کو وضاحت کرنا پڑتی کہ وہ حبیب کو بلاوجہ فرمان علی کے قتل میں کیوں ملوث کر رہا تھا!

دوپہر کے وقت پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کیمیکل ایگزامنر کی لیبارٹری رپورٹ بھی منسلک تھی۔ ان دونوں رپورٹس کے مطالعے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ چوہدری فرمان علی کی موت رات دو اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور یہ قابل ذکر بات تھی کہ حالت بے ہوشی میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تھا۔ کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ ظاہر کرتی تھی کہ اسے ایک زود اثر خواب آور دوا دی گئی تھی اور گہری نیند کے دوران میں اسے پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔

ساری حقیقت دو اور دو چار کی مانند عیاں ہو گئی۔ میرا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا۔ چوہدری فرمان کو پہلے نیند آور دوا کے زیر اثر بے بس کیا گیا پھر اس کی موت کو خودکشی کا رنگ دینے کے لئے اس کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے چھت پر لٹکا دیا گیا، گویا یہ ایک سیدھی سیدھی قتل کی واردات تھی۔

نرگس نے گزشتہ رات مجھے بتایا تھا کہ وقوعے کی رات مقتول نے بہت کم کھانا کھایا تھا اور دودھ کا ایک گلاس پینے کے بعد وہ سو گیا تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر نرگس کے پاس ہسپتال پہنچ گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے ماہرانہ رپورٹ کے بارے میں بتایا اور پوچھا۔

"حویلی میں کھانا پکانے کا کام کس کے سپرد ہے؟"

"یہ ڈیوٹی نکو کی ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن......"

اس نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔ "لیکن کیا؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ "اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ نکو نے کھانے میں کچھ ملا دیا ہوگا تو میں کہوں گی، یہ بات درست نہیں۔ وہ کھانا ہم سب نے کھایا تھا۔ اگر اس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی تو ہم سب کو گہری نیند میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔"

میں نے کہا۔ "خواب آور دوا چوہدری کے اندر پہنچائی گئی ہے، اس بات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ لیبارٹری رپورٹ کو چیلنج کرنا ممکن نہیں۔ اب یا تو وہ دوا کھانے میں شامل تھی یا پھر دودھ میں۔"

"کھانے میں ممکن نہیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر زور دے کر بولی۔ "میں نے چوہدری فرمان کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دودھ میں کچھ ملا ہوا ہو!"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔ "باورچی خانے سے تم نے کھانا اور دودھ خود نکالا تھا یا نکو نے یہ چیزیں وہاں تک پہنچائی تھیں؟"

"نہ میں خود لے کر آئی اور نہ ہی نکو نے پہنچائیں۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ ذمے داری

مطلوب حسین کی ہے۔ وہ برسوں سے یہ ڈیوٹی نبھا رہا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں اس کی وضاحت سے حیران ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ بولی۔ "چوہدری فرمان کی یہ خواہش تھی کہ اس کا کھانا مطلوب حسین کے سوا اور کوئی اس تک نہ پہنچائے۔ میرے آنے سے پہلے یہ معمول چلا آ رہا تھا۔ وقوعے کے روز بھی رات کا کھانا اور دودھ مطلوب نے ہی چوہدری کی خواب گاہ میں پہنچایا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اس وقت وہیں موجود تھی جب وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ چوہدری نے دو چار لقمے لینے کے بعد کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا جبکہ میں کھاتی رہی تھی۔ پھر اس نے دودھ کا گلاس پی لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا اسے نیند آ رہی ہے۔ چنانچہ میں اپنی خواب گاہ میں چلی جاؤں۔ میں اٹھی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔"

نرگس نے بات ختم کی تو میرا ذہن صاف ہو گیا۔ میں اس کیس کو حل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ خود کلامی کے انداز میں، میں نے زیرِلب دہرایا۔ "دودھ کا گلاس پینے کے بعد چوہدری کو نیند آ گئی پھر وہ گہری نیند میں پہنچ گیا۔ بعد ازاں غفلتانہ نیند کا سہارا لے کر اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔"

نرگس بڑی گہری نگاہ سے مجھے تک رہی تھی، چونکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "لیکن مطلوب نے کیوں دودھ میں نشہ آور دوا ملائی ہو گی؟"

"اس سوال کا جواب مطلوب ہی دے گا نرگس!" میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "مطلوب برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔ چوہدری اس پر بہت بھروسا کرتا ہے۔ وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا۔ چوہدری سے اس کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"تمہارے ان سوالات کے جوابات میں بعد میں دوں گا۔" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "فوری طور پر مجھے مطلوب حسین کی تلاش ہے۔"

تھانے آتے ہی میں نے مطلوب کو لانے کے لئے اپنے تین بندے روانہ کر دیئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ میری نظر کے سامنے کھڑا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے پولیس اہلکاروں نے بڑی مستعدی دکھائی تھی۔ میں نے تیز نظر سے مطلوب کو گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسا سیدھا سادہ شخص اتنا خطرناک کام کر ڈالے گا۔ بتاؤ تم نے کس کے حکم پر چوہدری فرمان کے دودھ میں خواب آور دوا ملائی تھی؟"

میرے خالص تھانے دارانہ انداز نے اس کی سٹی گم کر دی۔ پہلے میں نے حویلی میں اس سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کی تھی۔ وہ میرے نئے تیور دیکھ کر گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں نے اس کی زبان کا قفل کھلوانے کے لئے اسے حوالدار شمشاد کے حوالے کر دیا۔

پولیس جب صحیح آدمی پر ہاتھ ڈال دے تو پھر اس سے حقیقت اگلوانا مشکل نہیں رہتا۔ سخت سے سخت جان مجرم بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آدھے گھنٹے کی "کاریگری" نے مطلوب کے کس بل نکال دیئے اور وہ سچ بیان کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے پہلی فرصت میں اس کا بیان نوٹ کر لیا۔

مطلوب حسین نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پہلے چوہدری کے دودھ میں خواب آور دوا ملائی پھر جب وہ گہری نیند میں پہنچ گیا تو رات کے آخری پہر آ کر اس نے چوہدری کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال کر اسے چھت سے لٹکا دیا جہاں وہ زندگی سے بچھڑ کر موت سے جا ملا۔ اس کارروائی کے دوران میں اس نے نرگس کے کمرے میں کھلنے والے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی تا کہ وہ چوہدری کی خواب گاہ تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔ وہ وہاں کا پرانا ملازم تھا لہٰذا چوہدری کی خواب گاہ میں داخل ہونے کے لئے اس نے ایک چابی بنا لی تھی۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے نرگس والے کمرے کے دروازے کی کنڈی کھول دی تھی۔ اگر چوہدری کی موت کو خودکشی سمجھ لیا جاتا تو مطلوب کی اسکیم کامیاب ہو جاتی۔ لیکن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے اس کے جرم کی قلعی کھول دی۔

میں نے اس کا طویل بیان قلم بند کرنے کے بعد پوچھا۔ "مطلوب حسین! تم نے اتنا سنگین جرم کیوں کیا۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ خالصتاً تمہارا منصوبہ تھا۔ تم نے یقیناً کسی بااثر فرد کے اشارے پر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہو گا؟"

وہ ایک مرتبہ پھر حیل و حجت سے کام لینے لگا۔ میں نے دوبارہ اسے حوالدار کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا تو وہ مچل کر رہ گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر خود کو حوالۂ عذاب نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا نہایت ہی سراسیمہ لہجے میں اس نے میرے سوال کا جواب دے دیا۔

"میں نے بڑی بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

یہ ایک اور انکشاف تھا۔ میں نے رشیدہ بیگم کے پاس جا کر اسے سوالات میں پرو دیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ مطلوب حسین نے بھنڈا پھوڑ دیا ہے تو اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی اور اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ بڑے تکان زدہ اور مطمئن لہجے میں اس نے کہا۔

"تھانے دار پتر! میں تو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکی ہوں۔ یہ بیماریاں مجھے زیادہ عرصہ جینے نہیں دیں گی۔ سوچا کیوں نہ مرنے سے پہلے ایک نیک کام کر دوں!"

میں حیرت اور استعجاب سے اس بڑھیا کو تکنے لگا۔ اس کی شخصیت کا ایک نیا پہلو میرے سامنے آ رہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "چوہدری فرمان علی کے ظلم و ستم کا خدا تو حساب لیتا ہی لیکن میں نے سوچا، مرنے سے پہلے میں بھی اپنے حصے کا کام انجام دے ڈالوں۔ مجھ سمیت پتا نہیں کتنے انسانوں نے اس فرعون کی زیادتیوں کا "مزہ" چکھا ہو گا۔

اگر یہ موذی ختم ہو جاتا تو میرے خیال میں ہزاروں انسان اس کے ظلم سے محفوظ ہو جاتے۔ میں نے انسانیت کی بھلائی کے لئے یہ کام کیا ہے۔ بھلا ہو، مطلوب کا۔ اس نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ ہم دونوں ایک جیسے خیالات کے حامل ہیں۔ چوہدری کے قتل کے جرم میں اگر ہم پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں تو ہمیں کسی قسم کی ندامت یا دکھ نہیں ہوگا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس درست کرنے کی خاطر رکی پھر بڑے آسودہ لہجے میں بولی۔ ''تھانے دار پتر! زیادہ سوچ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ وہی کرو، جو تمہارا قانون کہتا ہے۔''

وہ عمر رسیدہ، کمر خمیدہ بڑھیا میری سوچ سے زیادہ پیچیدہ اور گہری ثابت ہو رہی تھی۔ میں چند لمحات تک خاموش بیٹھا اس کے بارے میں غور کرتا رہا پھر قانون کے تقاضے پورے کر دیئے۔

رشیدہ بیگم کا کہا سچ ثابت ہوا۔ اس کا خیال تھا، وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گی۔ ابھی اس مقدمے کی باقاعدہ سماعت بھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ وہ چل بسی۔ عدالت نے مطلوب کو شریک جرم کے طور پر سات سال کی سزا سنا کر جیل بھیج دیا۔

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ رشیدہ بیگم نے قبل از مرگ ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دیا تھا۔ چوہدری کے موذی ہونے میں کوئی دو آرا نہیں تھی۔ ''قتل موذی قبل ایذا'' شاید ایسے ہی واقعات پر فٹ بیٹھتا ہے۔

چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ آئندہ گرمیوں میں نرگس اور حبیب نے شادی کر لی۔ بلند و بالا اور وسیع و عریض حویلی میں گزرے ہوئے عذاب ناک دنوں کی تلخیوں کو وہ حبیب کی جھونپڑی کے سائے میں بھلانے کی کوشش کر رہی ہے...... اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہے۔

ختم شد